نیا دور

فروری، مارچ ۱۹۹۴ء

اودھ نمبر

قیمت چھ ۶ روپے

ریاست کے
شری موتی لا
اور وزیر اعلیٰ
شری ملائم
عیدگاہ عیش
میں عید کی مبا
دیتے ہوئے
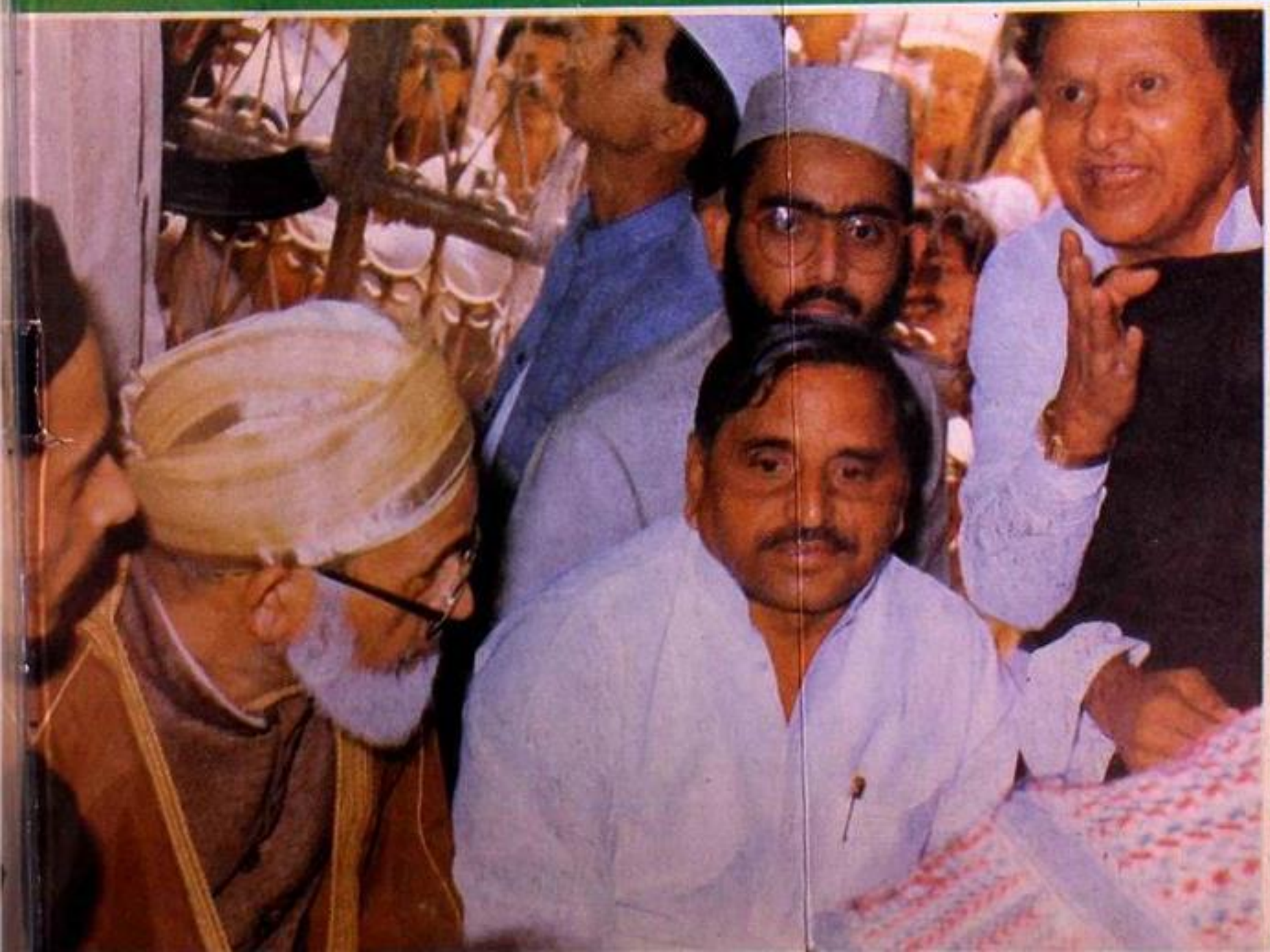
وزیر اعلا
ری ملائم سنگھ یادو
عیدگاہ
عیش باغ لکھنؤ
میں
عید کی تہنیت
پیش
کرتے ہوئے

ماہنامہ
نیا دور

جلد ۴۸ نمبر ۱۱و۱۲

فروری، مارچ ۱۹۹۴ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
فون نمبر ۲۴۵۶۶۰

معاونین
محمد الیاس خاں۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر
اتل بگائی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

زر سالانہ: تیس روپے
عام شمارہ: تین روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، اترپردیش لکھنؤ

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اترپردیش، لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل
کتابت و تزئین: حسن اختر
تصاویر: جاوید ہاشمی

عنوانات
اودھ نمبر

اپنی بات

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی، کس حد تک اس میں اخذ و قبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسری تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندستان دُنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزار ہا برس کی اقوامِ عالم کی تاریخ میں اگر آج بھی ہندستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے ہندستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصّہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے مگر بہر حال وہ ایک ہوتا ہے۔

۱۷۲۲ء میں محمد امین نیشاپوری جب اودھ کے علاقے میں آئے تو اس وقت علاقائی تہذیب کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ پچاس سال بعد اودھ میں "بنگلہ" (فیض آباد) سے جو شعاعیں پھیلنا شروع ہوئیں، وہ آفتاب بن کر لکھنؤ کے افق سے چمکیں اور پھر خاکِ اُودھ کے ہر ذرّے کو روشن اور منوّر کر گئیں۔ وہ خاک جس کا خذف ریزہ دُرِ نایاب تھا، وہ خاک جو اٹھی تو اس نے شام کو دُھندلایا نہیں بلکہ اسے اتنا حسین بنا دیا کہ آج شامِ اودھ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ادب کا استعارہ بن گئی ہے۔ یہاں سے وہ غوّاصِ معانی اُٹھے جنھوں نے ہر بحرِ پُر آشوب کو پایاب بنا دیا۔ یہاں کی زری کی شام و سحر "تختۂ گُل جیسی چکن" اور کہکشاں کی راہ گزر کی طرح کی جامدانی خود تو حسین تھی ہی ساری دُنیا کو حسین بنا گئی۔ اس تہذیبی داستان کے کتنے رنگ اور کتنے رُخ تھے اس پر عرصے سے لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ شرر، نجم الغنی، آشیروادی لال سریواستوا اور دوسرے دورِ حاضر کے مورخین نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اودھ کی علاقائی تہذیب کو پیش کیا۔ لیکن یہ عرض کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ شاید اس تہذیب کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔ کسی ایک رُخ کو ابھار کر اور اس پر پوری تہذیبی اکائی کا قیاس کر کے فتوے لگا دیے گئے۔ اس احساس کے تحت اپنے محدود وسائل کے ساتھ ہم نے بھی کوشش کی کہ اس عظیم الشان اور سنہری تہذیب کے ان نقوش کو اُبھار سکیں جن پر بہت سارے اسباب نے وقت کی گرد ڈال رکھی ہے۔

نیا دور کی صحافتی تاریخ کا احترام کرتے ہوئے اس بات کی سعیِ بلیغ کی گئی کہ اہلِ قلم اور دانشور حضرات میں جس کی جو تخصیص ہو اس کو اسی موضوع پر زحمت دی جائے ہمیں اس پر ناز ہے کہ اس خصوصی نمبر میں جس نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ اس فن کا ماہر ہے اور اس کا پایۂ استناد مستحکم ہے۔ ادبیات، رقص و موسیقی فنِ تعمیر، مشاغل، معاشرتی آداب غرضیکہ تہذیبی زندگی کے بیشتر نقوش پر مقالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ اپنی اس کوتاہی کا بھی اعتراف ہے کہ مصوّری پر کوشش کے باوجود کوئی مقالہ نہ شامل کیا جا سکا۔ بعض مقالے موضوع کی مناسبت سے طویل تھے، ان کی افادیت کے پیشِ نظر انھیں آئندہ شمارے میں جگہ دی جائے گی۔

مجھے پُورا یقین ہے کہ اس تہذیبی دستاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اتنا وقیع نمبر نکالنا ہمارے لیے ناممکن ہوتا اگر اس موضوع پر اختصاص رکھنے والے علما اور دانشور حضرات کا تعاون ہمیں نہ ملتا۔ ادارہ ان تمام حضرات کا بے حد ممنون اور متشکّر ہے۔ مجھے اس پر بھی فخر ہے کہ مجھے بہترین رفقائے کار ملے جنھوں نے اپنے تعاون کی مٹھیاں اور دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ ان تمام لوگوں میں جناب اسرار سید اور مبین احمد صدیقی صاحب کی مساعی اور محنتوں کا اعتراف کرنا ضروری ہے اور میرے کرم فرما جناب جاوید ہاشمی صاحب کا بھی، جنھوں نے اس خصوصی نمبر کے لیے بے حد اہم تصاویر مہیا کیں۔

سید امجد حسین
ایڈیٹر

پیغام

سत्यमेव जयते

راج بھون
لکھنؤ
۱۷ر مارچ ۱۹۹۴ء

یہ جان کر مجھ کو بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ نیا دور کا فروری، مارچ کا مشترکہ شمارہ "اودھ نمبر" کے نام سے معنون کیا جارہا ہے۔

اودھ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بھگوان رام کی شخصیت غیر مسخر تھی اور اسی خصوصیت کی بنا پر ان کا پایہ تخت اجودھیا کہلایا، جس کے لغوی معنی بھی نہ تسخیر کیا جانے والا خطّہ ہے۔ رام کے بعد اس صوبے میں متعدد حکمراں ووالیانِ ریاست آتے رہے اور حکومت کرتے رہے۔ کبھی شیوخ کی حکومت تو کبھی ناگروں کی اور کبھی شرقیہ حکومت۔ ان سب کے بعد ۱۷۱۹ء میں محمد امین سعادت خاں برہان الملک نے نوابی اور شاہی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

فنونِ لطیفہ کو اس عہد میں جتنا فروغ حاصل ہوا ہے اتنا دُنیا کے کسی گوشے میں کبھی نہیں ہوا، فنِ تعمیر، فنِ موسیقی فن زبان و ادب اور ان سب کے علاوہ رعایا پروری، انسان دوستی، اخوت اور امن و خیر سگالی کے جذبے کا جتنا فروغ اس عہد میں ہوا، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

شاہانِ اودھ نے ملک کو ایک ایسی تہذیب دی جس میں نہ کوئی مذہب کی تفریق تھی اور نہ ہی مالی اعتبار سے امیروں اور غریبوں میں دوری۔ اسی جذبے سے سرشار جس تہذیب کا اس سرزمین پر ارتقا ہوا اس نے اودھ کو ایک منفرد شناخت دی۔

مجھے یقین ہے کہ اودھ نمبر" صوبۂ اودھ کے مختلف شعبہ جات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک "تاریخی دستاویز بنے گا۔

मोतीलाल वोरा

(موتی لال وورا)
گورنر اتر پردیش

سچیوالیہ انیکسی
لکھنؤ

پیغام

मुख्य मंत्री
उत्तर प्रदेश

مجھے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش اپنے اُردو جریدے نیا دور کا مشترکہ شمارہ "اودھ نمبر" کے عنوان سے شائع کر رہا ہے۔

ناقابل تسخیر سرزمین کا نام اَوَدھ ہے اسی خطّے سے مریادا پرشوتم رام نے دُنیا کو صُلح و آشتی کا پیغام دیا اور اپنی ذہنی بالیدگی سے عوام کو قلبی آسودگی بخشی۔

دَیہک دَیوِک بھوتِک تاپا رام راج نہی کاہُہی ویاپا

کے مصداق اودھ ہمیشہ ہی جائے امان رہا ہے۔ "جو رب ہے وہی رام" کے پیغام کے ساتھ حاجی وارث علی شاہ نے دُنیا میں بغیر تفریق مذہب و ملّت محبّت کی سوغات تقسیم کرنے کا درس دیا۔

پہلی جنگ آزادی سے قبل اودھ کے حکمرانوں نے اس خطہ میں جس مشترکہ تہذیب کی سُنہری روایات کو پروان چڑھایا وہی تہذیب ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کا محور اور ہمارے ملک کی شناخت بنی۔ شاہانِ اودھ نے رواداری، رعایا پروری اور مخلص حکمرانوں کی طرح نہ حکومت کی ہی ساتھ ہی دُنیا کو ایک اعلیٰ و ارفع تہذیب دی۔ ایسی تہذیب جس کی اساس محبّت کرنے اور دوسروں کے دُکھ درد میں ڈوب جانے پر تھی۔ ان تمام باتوں کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ تہذیب ہو یا تمدن یا کوئی فلسفہ سب کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں، جس تہذیب کی کونپلیں عوامی زندگی کی دھرتی سے نہیں پھوٹتیں وہ تہذیب فنا ہو جاتی ہے۔

اودھ کے حکمرانوں، عالموں، سنتوں اور مجاہدینِ آزادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ آج یہ تہذیب زندہ اور باقی ہے تو صرف اس لئے کہ اس کا سرچشمہ عوام تھے۔

مجھے یقین ہے کہ "اودھ نمبر" اودھ کی شان دار عوامی روایات کے شایانِ شان ہوگا اور اس میں اودھ کے تمام تہذیبی، ثقافتی، ادبی، علمی اور انسان دوستی کے موضوعات کا احاطہ کیا جائے گا۔

"اودھ نمبر" کی کامیاب اشاعت کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ۔

(مُلائم سنگھ یادو)
وزیر اعلیٰ اتر پردیش

37, जौहरी मोहल्ला
लखनऊ-226 003 (भारत)
दूरभाष : (0522) 265529

डा० सय्यद कल्बे सादिक
उपाध्यक्ष,
आल इण्डिया मुस्लिम पर्सनल लॉ बोर्ड
सचिव,
तौहीद-उल-मुस्लिमीन ट्रस्ट

پیغام
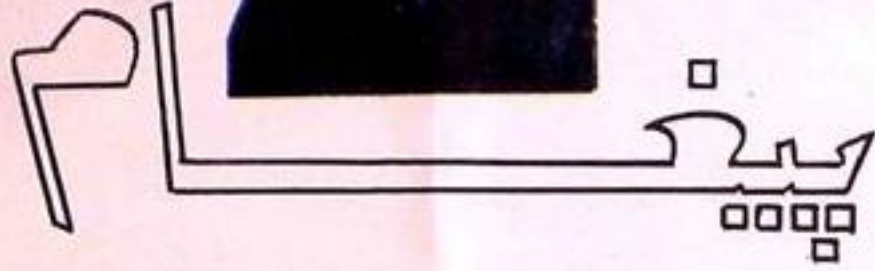
میں محترمی سیّد علی جواد زیدی کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ ” موجودہ دورِ ادارت میں نیا دور نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرلی ہے۔ اب نیا دور کا شمار ملک کے مقتدر ترین جرائد میں ہونے لگا ہے “۔ میری ناچیز رائے میں اس کی وجہ برجستہ موضوعات پر منتخب اہلِ قلم کے تعاون کا حاصل کرلینا ہے۔

گزشتہ سال نیا دور نے ایک پسندیدہ و مقبول ”قومی یک جہتی نمبر“ شائع کیا تھا، اس سال ”اودھ نمبر“ نکال رہا ہے۔ اودھ علم و عرفان کا خطہ تو مُدّتِ مدید سے ہے۔ اس علاقے کی ایک تہذیبی و تمدنی شناخت بھی رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے لےکر ۱۹۴۷ء میں ملک کے استقلال تک سیاسی تحریک کے مرکزی میدان کی حیثیت سے بھی اودھ نے اپنی تاریخ بنائی ہے۔ ان سب واقعات و حوادث نے اودھ کو ایک خصوصی اہمیت سے مالا مال کیا ہے۔ بہت ضروری تھا کہ اودھ کی منزلت کو ہر ایک نقطہ نظر سے نمایاں کیا جائے اور اسے نئی نسل کے سامنے دلکش اور جاذب نظر انداز میں پیش کیا جائے۔

میری دُعا ہے کہ نیا دور کا ”اودھ نمبر“ ممکن حد تک اس مقصد کی تکمیل کرے اور نوجوانوں کی واقفیت اور بزرگوں کی یاد آوری کا قابلِ قدر ذریعہ بنے۔ آمین۔

فقط والسلام

(سید کلب صادق)

۲ر فروری ۱۹۹۴ء

سید امجد حسین
ایڈیٹر نیا دور لکھنؤ

برجیس قدر کی ایک غزل

اودھ میں جنگِ آزادی کے شعلوں کو تیز تر کرنے میں بیگم حضرت محل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ نہ صرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی افواج کے خلاف ہندستانی عوام کی رہنمائی کر رہی تھیں بلکہ انھیں کی تنظیمی صلاحیتوں اور حکمتِ عملی کے سبب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بھی تقریباً آٹھ نو مہینے تک اودھ پر دوبارہ شاہی حکومت کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے محلوں میں سے ایک محل میں قیصر باغ بارہ دری کے عقب میں جسے محاذی بارہ دری کہا جاتا تھا، اس کے شمال کی جانب رہا کرتی تھیں۔ ان کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوا اس کا نام مرزا محمد رمضان علی خاں رکھا گیا اور جنھیں بعد میں برجیس قدر کے خطاب سے شہرت ملی۔ ان کی پرورش پر بیگم حضرت محل نے خاص طور پر توجہ دی جیسے ان کو احساس تھا کہ واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے بچھڑنے کے بعد اب ان کی ذمہ داری کا بوجھ برجیس قدر ہی پر پڑے گا۔ چنانچہ برجیس قدر کو لکھنؤ کے مشہور عالم مولوی غلام علی سے ابتدائی تعلیم دلائی گئی۔ حضرت محل کے داروغہ محل ممو خاں اور دیوان ٹھاکر پرشاد نے حضرت محل کی پوری مدد کی۔

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اس وقت برجیس قدر کی عمر ۱۲ سال تھی۔ انھیں ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کو تاج شاہی پہنا کر مسند حکومت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن انگریزوں کی سازشوں اور ہندستانی سپاہیوں کی غیر منظم جماعت کے نتائج کے زیر اثر انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور جب ہنگامے تیز تر ہونے لگے تو وہ محمود آباد ہوتے ہوئے بونڈی (ضلع بہرائچ) چلے گئے۔ اس کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ نیپال میں قیام کیا۔ چنانچہ کھٹمنڈو ہی میں ان کی شادی کی رسم ادا کی گئی ان کی بیگم کا نام نواب مہتاب آرا ہے جو آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی پرپوتی تھیں۔

اپریل ۱۸۷۹ء میں جب بیگم حضرت محل کا انتقال ہو گیا تو برجیس قدر وطن آنے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ۱۸۹۳ء میں ان کو کلکتہ میں قیام کی اجازت مل گئی۔ لیکن یہاں بھی سازشوں کا شکار رہے اور اسی کے نتیجہ میں چند ہی مہینوں بعد یعنی ۱۴ اگست ۱۸۹۳ء کو انھیں کھانے میں زہر دے کر قتل کرا دیا گیا۔

برجیس قدر کو شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ وہ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ زمانے کے انقلابات نے ان کے کلام کو تباہ و برباد کر دیا۔ ورنہ شاید اس میں بہت سے ایسے ادبی جواہرات مل جاتے جن سے اُردو کے شعری ادب میں اضافہ ہوتا۔ ذیل میں ان کی ایک نایاب غزل پیش کی جا رہی ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے یہاں لکھنوی غزل کا رچاؤ تھا اور انھیں یہاں کی تہذیبی زندگی سے دُور ہونے کا کتنا شدید احساس تھا۔

غزل

فرقت نصیب رہتا ہوں جس نازنیں سے دُور
یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دُور

رکھا نصیب نے مجھے کس نازنیں سے دُور
بھاگے ہے ہر حسین جہاں جس حسیں سے دُور

بلبل تو ہوں پر ایک گل یاسمیں سے دُور
برجیس ہوں مگر بتِ زہرہ جبیں سے دُور

ہوتا نہیں اثر ترے دل میں تو سنگ دل
یاں تیر آہ گزرا ہے عرش بریں سے دُور

ہے شکر کردگار عقوبات سے بچے
خالق نے کردیا مجھے تاج ونگیں سے دُور

یارب وہ دن ہوں پھر کہ پری بے نقاب ہو
رکھوں حجاب کو رخِ پردہ نشیں سے دُور

دستِ جنوں سے چاک گریباں ہے تا بہ جیب
ہے تار بے شمار ہر اک آستیں سے دُور

فرشِ زمیں پہ چرخِ بریں کا جواب ہے
افشاں جو ہوگئی ہے تمھاری جبیں سے دُور

تکرار ایسے لفظ کی بوسے کے وقت واہ
لِلہ آپ رکھیں زباں کو نہیں سے دُور

یوں خالِ روئے یار ہے رُخ سے علاحدہ
رہتا ہے جیسے ملکِ حبش شاہِ چیں سے دُور

میں اپنا سر قدم پہ کروں گا ترے نثار
اے شہ سوار ہو تو ذرا قاشِ زیں سے دُور

تن خاک تیری راہ میں سر بہرِ نذر ہے
کس طرح جاؤں جانؔ تری سرزمیں سے دُور

مٹی خراب ہو گئی نیپال میں مری
رہتا ہے کیوں مزارِ امامِ مبیں سے دُور

مل لوں شبِ وصال میں دل کھول کھول کر
یارب تو کر حجابِ بُتِ شرمگیں سے دُور

کونین کی نجات ہے برجیس سب حصول
کیوں رہ مزارِ خسروِ دُنیا و دیں سے دُور

□□

تہنیت: مارچ کا مہینہ موسمِ بہار کا نقیب ہوتا ہے، اسی مہینے میں دو بے حد اہم تہوار۔ خوشی اور مسرتوں کے تہوار ہیں — عید اور ہولی۔ دونوں تہواروں کی سب کو مبارکباد! ہماری دُعا ہے کہ ہمارے ملک کا ہر دن عید اور ہولی کی طرح خوشیاں لائے۔ آمین

ایڈیٹر

لکھنؤ

مہکا ہوا ہے ہم سے گلستانِ لکھنؤ
ہے جاں ہماری لکھنؤ ہم جانِ لکھنؤ

ڈھونڈے کلیم طوطیٔ بستانِ لکھنؤ
لقماں کو تلاشِ حکیمانِ لکھنؤ

دیکھے ہیں ہم نے سیکڑوں گلشن جہان میں
لیکن نہیں جوابِ گلستانِ لکھنؤ

پوچھا کسی نے عشق کا مشہور مدرسہ
مجنوں پکار اُٹھا دبستانِ لکھنؤ

شیرینیٔ زباں پہ جو شیریں نثار ہے
لیلیٰ بنی ہوئی ہے حدی خوانِ لکھنؤ

آہو پناہ لینے کو دوڑیں سوئے حرم
بھر کے نظر جو دیکھیں غزالانِ لکھنؤ

مہر و مہ و نجوم پہ جمتی نہیں نگاہ
دل میں بسے ہیں زہرہ جبینانِ لکھنؤ

بس اک ذرا سی بات پہ حوروں سے ٹھن گئی
جنت میں ڈھونڈھتے تھے حسینانِ لکھنؤ

ذرّوں سے یاں کے کاہکشاں میں ہے روشنی
شمس و قمر ہیں باجگذارانِ لکھنؤ

افلاک کانپتے ہیں جب آتے ہیں غیظ میں
برجِ اسد کو دیکھ کے شیرانِ لکھنؤ

دیپک کی طرح خود ہی بھڑک اُٹھے تان سین
سن لے اگر نوائے خوش الحانِ لکھنؤ

نوشیروان و قیصر و دارا کو رشک ہے
کیا باشرف ہیں خاک نشینانِ لکھنؤ

ممکن نہیں کہ ہاتھ بڑھائیں پئے سوال
دیتے ہیں سب کو بھیک فقیرانِ لکھنؤ

موتی محل جو شہرِ نگاراں کی آبرو
بارہ[1] دری ہے لعلِ بدخشان لکھنؤ

دیکھا نگاہِ رشک سے خضر و مسیح نے
ہے گومتی کہ چشمۂ حیوانِ لکھنؤ

اختر کا حزن خون کے آنسو رُلا گیا
رنگیں لہو سے ہو گیا دامانِ لکھنؤ

جب چل رہی تھیں ظلم و تشدد کی آندھیاں
حضرت محل بنی تھیں نگہبانِ لکھنؤ

پھیلے ہیں شرق و غرب و جنوب و شمال میں
ہر شہر میں ملیں گے سفیرانِ لکھنؤ

ہیں میزبانیوں کی ادائیں وہ دل نشیں
تا عمر یاد رکھتا ہے مہمانِ لکھنؤ

سب نے بھرے ہیں جام یہاں سے بقدرِ ظرف
کس پر نہیں جہان میں احسانِ لکھنؤ

گونگے جو کل تھے آج وہ اہلِ زباں بنے
ہے معجزہ کہیں جسے فیضانِ لکھنؤ

زاغ و زغن کو آ گئیں قمری کی بولیاں
کیا خوش نوا ہیں زمزمہ سنجانِ لکھنؤ

اعشیٰ و نابغہ کے بھی چہرے اُتر گئے
سُن لی جو گفتگوئے فصیحانِ لکھنؤ

شاعر ہیں مثلِ حافظ و سعدی غزل سرا
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

سودا و میر و جرأت و انشا و مصحفی
سب آ گئے زیرِ سایۂ دامانِ لکھنؤ

آتش ہیں شمعِ بزمِ غزل کائنات میں
ناسخ ہیں یا ہے شیرِ نیستانِ لکھنؤ

رشک و ہوس خلیل و نسیم و صبا و رند
بزمِ سخن میں صدر نشینانِ لکھنؤ

تسلیم و برق، امیر و امانت، وزیر و بحر
ہر اک چراغِ بزمِ سخندانِ لکھنؤ

سرمایہ ہے زبان کا اُردو جلال کی
جن کے کلام سے ہے عیاں شانِ لکھنؤ

ثاقب، عزیز و آرزو و محشر و صفی
شانہ کشانِ زلفِ پریشانِ لکھنؤ

دانش، بلیغ و ابر و تمنا، بہار، اثر
کیا کیا گزر گئے ہیں غزلخوانِ لکھنؤ

عیب و ہنر کے واسطے معیار بن گیا
دُنیائے شعر و نظم میں دیوانِ لکھنؤ

دلگیر اور ضمیر و خلیق و فصیح ہیں
سر آمدانِ مرثیہ گویانِ لکھنؤ

نثرِ سرور یوسفِ مصرِ ادب کا تخت
نظمِ انیس تاجِ سلیمانِ لکھنؤ

پنہاں ہے یاں کی خاک میں اک مہرِ نیمروز
یعنی انیس بلبلِ بستانِ لکھنؤ

عشق و وحید مہر و مہِ چرخِ شاعری
ذاتِ دبیر قاطعِ برہانِ لکھنؤ

مونس، نفیس، اوج و سلیس، انس اور رئیس
روحِ ادب، وقارِ زباں، جانِ لکھنؤ

عاشق، ادب، تعشق و صابر، رشید و صبر
تھے لاجواب مرثیہ گویانِ لکھنؤ

جاوید ہوں، عروج و مودّب ہوں یا جلیس
عارف ہیں اُن کے حق کے ادیبانِ لکھنؤ

فائق، قدیم، فائز و ماہر، ذکی، رفیع
کوئی ہے گُل تو ہے کوئی ریحانِ لکھنؤ

[1] لال بارہ دری جہاں "تاجپوشی" ہوئی تھی۔

ذاکرِ شفیق اور فرید و حسین میں
ہے رُوحِ لکھنؤ تو کوئی جانِ لکھنؤ

گلزار میں اِرم کے جو ہو، یاں ہے وہ نسیم
جنّت نظیر ہے چمنستانِ لکھنؤ

اُلفت کا ہے طلسم فائق کی جو مثنوی
ہے بے نظیر حسنِ حسینانِ لکھنؤ

امرت سمجھ رہے ہیں سبھی زہرِ عشق کو
شوقِ وفا ہے ذوقِ شہیدانِ لکھنؤ

جُود و سخا کی ہوگئی شہرت جہان میں
مشہور اس طرح ہوئے شاہانِ لکھنؤ

شاہِ نجفؑ کو کرتا ہے پہلے سلام شوق
ہر صبح بڑھ کے نیّرِ تابانِ لکھنؤ

اے مُدّعی! حُسینیۂ آصفی کو دیکھ
سوتا ہے کس شکوہ سے سُلطانِ لکھنؤ

آبادیاں حُسینؑ کے صدقے میں ہیں بہت
ہیں کربلائیں رونقِ ایوانِ لکھنؤ

درگاہ و کاظمین و شبیہِ نجف کے پاس
ہے کاظمین مہرِ درخشانِ لکھنؤ

فضلِ خُدا سے روضۂ شاہِ رضا بھی ہے
رشکِ جناں بنا ہے خُراسانِ لکھنؤ

نظریں اُٹھا کے مسجدِ جامع کو دیکھئے
ہے قلبِ پاکِ سجدہ گزارانِ لکھنؤ

کچھ مسجدیں جنوں سے بھی منسوب ہیں یہاں
سجدہ گزار ہیں جن و انسانِ لکھنؤ

اک سمت مسجدیں تو مدارس ہیں اک طرف
علم و عمل ہے زینتِ ایوانِ لکھنؤ

یہ زورِ علم دیکھئے دیتے ہیں درس اب
شرحِ کبیر پڑھ کے صغیرانِ لکھنؤ

پھیلی ہے جن کے دم سے مدارس کی روشنی
نجم الحسن ہیں وہ مہِ تابانِ لکھنؤ

صدرالمحققین اگر ناصرِ حُسین
سبطِ حسن رئیسِ خطیبانِ لکھنؤ

دامن پہ جن کے سجدہ کریں آکے خُود ملک
گزرے ہیں ایسے ایسے فقیہانِ لکھنؤ

ہم نے نہیں سُنی ہے کبھی اس زمین میں
اتنی طویل نظمِ گلستانِ لکھنؤ

حالات کہہ رہے ہیں کہ اب نظم کیجئے
کچھ دیر شوق حالِ پریشانِ لکھنؤ

□□

——— مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی
شاہ گنج، نخاس، لکھنؤ

وفیات

اُردو کے مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر جاوید وششٹ کا ان کے آبائی وطن فتح پور بلوچ (ہریانہ) میں گزشتہ ۸ر فروری ۱۹۹۴ء کو ۴۷ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے نثر و نظم کی تقریباً ۲۴ کتابیں لکھیں۔ ادارہ انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

■ گزشتہ ۱۴ر فروری کا سورج ایک جواں سال و فعال ادیب ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے انتقال کی غمناک خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی ۱۵ر مارچ ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے وہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے فرزند تھے۔ ادارہ نیا دور ان کے ناوقت انتقال پر گہرے رنج و غم و اظہار کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

یادوں کے جھروکے سے

حیات اللہ انصاری

اودھ کا نیا جنم

پہلی جنگ آزادی کے دو بڑے ہیرو ہوئے ہیں۔ ایک بیگم حضرت محل اور دوسرے مولوی احمد اللہ۔ دونوں نے انگریزی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا لیکن غدار زمانے کے ہاتھوں شکست کھاکر بیگم نے نیپال میں پناہ لی اور مولوی احمد اللہ نے قبر میں استراحت فرمائی۔

حضرت محل پارک

آج لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کے نام پر ایک پارک ہے، جو پہلی جنگِ آزادی کی ہیروئن کی یاد دلاتا ہے۔ جب وہ پارک بن کر تیار ہوا تو وہاں صرف چند لوگ گھومتے پھرتے نظر آجاتے تھے اور جنگ آزادی کی یاد دلانے والی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہوتے ہوتے اب وہ پارک سیاسی تحریکوں کا شہر کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے اور جو فرض اس کو ادا کرنا چاہیے تھا وہ ادا کرنے لگا ہے۔ ابھی حالیہ الکشن میں ریاست کے بڑے بڑے جلسے اسی پارک میں ہوئے جن کو پارٹیوں کے بڑے لیڈروں نے خطاب کیا۔ اس طرح یہ مقام، جو اودھ کی یادگار ہے، اودھ کا سب سے جان دار پارک بن گیا ہے۔

سیاسی جلسے ہندستان کی تقسیم کے پہلے امین آباد پارک میں اور پھر امین الدولہ پارک میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جلسوں میں حاضرین کی تعداد بڑھنے لگی اور بڑھتے ہوتے ان پارکوں میں ان کی گنجائش نہیں رہی، اس وجہ سے جلسوں نے بیگم حضرت محل پارک کو اپنا لیا۔

پارک کا یہ استعمال ایک لمبی سیاسی داستان سناتا ہے جو ۱۹۱۹ء سے چلتی ہوئی اور مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔

اس داستان نے اودھ میں ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی، جس سے نوجوان نسل کا بھی اور بعد کی آنے والی نسل کا بھی گہرا تعلق ہے۔ میں اس تاریخ کے ایسے چند واقعات سناتا ہوں جن سے ان منزلوں کا نشان ملے گا جہاں جہاں سے وہ سیاست گزری ہے، جو اب بیگم حضرت محل پارک میں مستقبل سازی کا فرض انجام دے رہی ہے۔

مہاتما گاندھی

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا لکھنؤ میں ایک اجلاس ہونے والا تھا اس میں شرکت کے لئے گاندھی جی آئے، تب ہی میں نے ان کو پہلی بار دیکھا۔ رفاہ عام کے میدان میں بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا، اسکے گیٹ کے سامنے چاندنی بچھائی گئی تھی۔ اس پر چلتے ہوئے مہاتما گاندھی معمولی رفتار سے آرہے تھے، جوان سے معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ سفید کھدر کا لمبا سا کرتا تھا اور سر پہ گاندھی ٹوپی، پاؤں میں چپّل۔ وہ بڑے بڑے قدموں سے چل رہے تھے اور دونوں ہاتھوں سے نمسکار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے کا سکون اور وہ تبسم جس سے وہ سلام کرنے والوں کا جواب دے رہے تھے، لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

خلافت کانفرنس ایک گھرے ہوئے پنڈال میں تھی جہاں داخلہ ٹکٹ سے ہوتا تھا یا پاس سے۔ آل انڈیا ہونے کے باوجود اس میں اتنی ہی بھیڑ تھی جتنی کہ آج کسی معمولی کانفرنس میں ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس مجمع کو لوگوں نے بہت بڑا مجمع مانا تھا اور سرکاری وفادار لوگ کافی پریشان تھے کہ مسلمان باغی ہوتے جارہے ہیں۔ شمس العلماء اور اس قسم کے مولویوں نے اس کانفرنس میں مسلمانوں کی شرکت کو اسلام کے خلاف قرار دے دیا تھا۔ جلسے میں مولانا محمد علی اور چند دوسرے لیڈروں کی تقریروں پر خوب تالیاں بجی تھیں، لیکن گاندھی جی کو دیکھتے ہی مسلمانوں نے جس جوش سے تالیاں بجائی تھیں اس کے سامنے سب تالیاں ماند پڑ گئیں۔

کانفرنس میں ایک طویل نظم پڑھی گئی تھی جس کے ان دو شعروں

پر بہت واہ واہ ہوئی تھی ؎

ایک دل اور جمع ہوں اضداد ناممکن ہے یہ
خوف ہو جس کو خدا کا کیوں ڈرے حکام سے

دوسرا شعر تھا جس میں جلیان والا باغ کی طرف اشارہ تھا ؎

واقعہ پنجاب کا اور یہ ملمع سازیاں
جتنے گورے تھے وہ کورے بچ گئے الزام سے

اس دور میں تغزل میں منطق اور تصنع جتنا گھس آئے تھے یہ نظم اسی کا نمونہ ہے۔ حکیم عبدالقوی صاحب جو کاکلیں بڑھائے ہوئے درویشوں کے لباس میں رہتے تھے، شاعر تھے اور پاٹ دار رسیلی آواز میں اپنا کلام سناتے تھے، انھوں نے ایک نظم سنائی جس کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا:

اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں

بڑے جوش سے اس نظم کو واہ واہ کا خراج ملا۔ اس میں قومی جذبات بھرپور تغزل سے ادا کیے گئے تھے۔

چوک کے پاس مولانا عبدالباری صاحب کی ایک بڑی سی عمارت تھی جو محل سرا کہلاتی تھی، اس میں مولانا نے گاندھی جی کو ٹھہرایا تھا۔ ہم لڑکوں میں مہاتما گاندھی کی دو چیزوں کے بڑے تذکرے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کے ساتھ دو بکریاں آئی ہیں جن کا دودھ مہاتما جی استعمال کرتے تھے اور دوسرے ایک چرخا آیا جس کو وہ، جب بھی فرصت ملتی، چلاتے تھے۔ مجھ کو خاص دلچسپی ہوئی بکریوں سے، لیکن بچے ان کو اتنا چھیڑنے لگے تھے کہ مولانا نے ایک آدمی بٹھا دیا تھا جو بکریوں کے پاس جانے والوں کی روک ٹوک کرتا تھا

میں اجازت لے کر بکریوں کے پاس بہت شوق سے پہونچا اور لکھنؤ کی تہذیب کے مطابق ان کو پان کی دو دو گلوریاں پیش کیں جن میں چکنی ڈلی اور الائچیاں خاص طور سے ڈلوائی تھیں۔ دونوں بکریاں ان کو ایک ایک منہ مار کر چٹ کر گئیں۔ اور ــ اگر کتا ہوتا تو دم ہلاتا اور پاؤں چاٹنے کی کوشش کرتا لیکن دونوں بکریوں نے گلوریاں کھا کر منہ پھیر لیا۔ مجھے یاد ہے کتنی حیرت ہوئی تھی کہ مہاتما جی کی بکریاں اور یہ تہذیب ۔!!

محل سرا کے پھاٹک پر جو ایک گلی میں کھلتا تھا، ایسے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی جو مہاتما گاندھی کے درشن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا نے جو دربان بٹھا رکھا تھا وہ لوگوں کو اندر نہیں جانے دیتا تھا۔ یہ لوگ اگر اندر پہنچ جاتے تو عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ عوام کی بھیڑ گلی سے ہوتی ہوئی سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ خلافت اور کانگریس کو سمجھتے تھے صرف چند نعروں سے۔ ان نعروں کی پشت پر دو باتیں تھیں جو ذہن میں گھسی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہندستانیوں کو انگریزوں نے غلام بنا رکھا ہے، وہ ہمارے ملک کو بڑی بے دردی سے لوٹ رہے ہیں اور انھوں نے اس کو کنگال کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہم سب لوگ غریب ہو گئے ہیں اور یہ کہ گاندھی جی ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔

لکھنؤ میں شاہ مینا کا مزار خاص مرکزیت رکھتا ہے۔ وہاں نوچندی کے دن میلا ہوتا ہے اور مزار پر قوالی بھی ہوتی ہے، کشمیریوں کا ناچ بھی ہوتا ہے اور طوائفیں بھی آتی ہیں۔ خلافت کی کانفرنس کے بعد میں ادھر سے گزرا تو وہی گانا "اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں" مزار پر چند نوجوان قوال لہک لہک کر گا رہے تھے اور حکیم عبدالقوی ایک کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تو یہ نظم گلی گلی گائی جانے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد کسی محفل میں ایک دن یہ غزل سنی ؎

خدا نے چاہا تو اک دن یہ کام کرلیں گے
فرنگی جتنے ہیں سب کو غلام کرلیں گے

پھر یہ نظم بھی گلی گلی گائی جانے لگی ــــ ایک اور نظم جو بہت مقبول ہوئی تھی وہ یہ ہے ؎

بولیں اماں یہ شوکت علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

پہلے ایسی نظمیں سڑکوں اور پارکوں میں گائی جاتی تھیں مگر بیس پچیس برسوں میں زمانہ بدل گیا تھا۔

گیارہ پائی فی کس

چوک کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پارک ہے جو ہرن والا پارک کہلاتا ہے۔ یہ چوک کی سڑک سے قدآدم بلندی پر واقع ہے اس طرح کہ اگر اس کے کنارے پر چوک کی طرف رخ کر کے کوئی شخص کھڑا ہو تو طوائفوں کے کئی بالاخانے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ پارک رات گئے

تک شوقینوں کا مرکز رہتا تھا۔ وہ لوگ یہاں گاتے تھے، تانیں اڑاتے تھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے کنارے پر جاکر کسی طوائف سے نظارے بازیاں کرلیا کرتے تھے۔ جب خلافت اور کانگرسی تحریکوں کا زور بڑھا تو چوک کے خلافتی اور کانگرسی لوگ اس پارک میں جلسے کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ پارک بالکل سیاسی لوگوں کا اڈا بن گیا۔ اب سہ پہر سے رات گئے تک سیاسی بحثیں ہوتی تھیں۔ ہفتے پیچھے ایک آدھ لیڈر بھی آکر تقریر کر جاتے تھے۔

اس پارک نے چند شاعر بھی پیدا کر دیئے تھے جو فن کے لحاظ سے تو ناقص تھے مگر تھے بڑے حقیقت پسند۔ ان میں ایک کی غزل کہو یا نظم جو بہت چلتی تھی اس کا ٹیپ کا مصرع تھا:

گیارہ پائی فی کس جب ہندستان کمائی ہے

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی پروفیسر نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ ہندستان کی فی کس آمدنی اتنی ہے۔ پھر اس بات کا اس طبقے نے جو ہرن والے پارک میں جمع ہوتا تھا، دنوں تذکرہ ہوتا رہا اور اس چیز نے متعدد مقرر پیدا کر دیئے تھے کیوں کہ اس چیز نے سیاسی فکر پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس دور میں کسی نے ایک طویل نظم کہی تھی اس میں قابل توجہ بات یہ تھی کہ محبوبہ کہتی ہے ؎

میں ہوں لیگی تو ہے کانگرسی میرا تیرا میل نہیں

یعنی ان دونوں پارٹیوں کے اختلافات تغزل کی سرحد کو چھونے لگے تھے۔

جواہر لال نہرو

قدیم دور میں فرنگی محل مذہبی تحریکوں کا مرکز رہتا تھا خلافت کی تحریک کا۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سیاست کا بھی دور آگیا اور وہ لائے جواہر لال جی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب میں مسلم یونیورسٹی میں تھا تب وہاں آفتاب ہال قائم ہوا تھا اور ایک نئی یونین بنی تھی "آفتاب مجلس" جس کا میں صدر منتخب ہوا تھا اور تب میں جواہر لال جی کو، جو اس زمانے میں ملک کو سوشلزم کا پیام دے رہے تھے، دہلی سے علی گڑھ لایا تھا۔ اس طرح جواہر لال جی سے کچھ قربت ہوگئی تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوکر میں لکھنؤ میں آگیا تھا اور ایک اسٹڈی سرکل بنائی تھی جس میں فرنگی محل کے طلبا اور کچھ ندوے کے طلبا شامل تھے۔ اتفاق سے جواہر لال جی لکھنؤ آئے اور میں نے ان کو فرنگی محل کے اسٹڈی سرکل میں آنے کی دعوت دی جو انھوں نے منظور کرلی۔

جب جواہر لال جی جلسے میں آئے تو جلسے والا مقام فرنگی محل کے لوگوں سے بھر چکا تھا اور چھتوں پر فرنگی محل کی خواتین نے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ مجمع بالکل خلاف توقع تھا۔ جواہر لال جی نے اپنی تقریر میں اپنا تازہ پیغام دیا۔ وہ کہنے لگے:

"آزادی کے مطالبے کے لئے یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ آزادی کیا ہوگی اور کس کی ہوگی۔ ہم کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے ہیں جو کسانوں اور زمینداروں دونوں کے لئے، یا والیانِ ریاست اور ان کی رعایا دونوں کے لیے مفید ہو۔ ان گروپوں کے مفاد میں زبردست ٹکراؤ ہے۔ سیاست میں اس بات کو سامنے رکھ کر چلنا چاہیئے۔"

جلسے میں کچھ شعرا بھی تھے، ان سے غزلیں پڑھوائی گئیں۔ جواہر لال جی نے بہت دل چسپی سے سنیں اور بعض بعض موقع پر تعریف بھی کی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ شاعر حضرات کو اب ایسے لوگوں کے جذبات کی بھی ترجمانی کرنا چاہیئے جو ملک وقوم کی خاطر جان اور مال سب لٹا رہے ہیں۔

جواہر لال جی کی تقریر میں جو پیغام تھا وہ اس دور میں بالکل نیا تھا، اس نے بہت جلد مسلم لیگیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

جواہر لال جی اسٹیشن روڈ پر، جو میرے گھر سے تقریباً تین میل ہے، ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ سیدھے چلے آئے تھے میرے یہاں جلسے میں۔ لوگوں نے ان کو آتے دیکھ لیا تھا اور کسی طرح معلوم کرلیا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔ جب جواہر لال جی واپس آ رہے تھے تو فرنگی محل کے پل سے لے کر امین آباد تک، یہاں وہاں ایسے لوگ اکٹھا ملے جو اپنے نوجوان لیڈر کے درشن کرنے کے منتظر تھے۔

اس دور میں لکھنؤ کی آبادی ساڑھے تین لاکھ تھی اور وہ خطہ جو سیاست میں حصہ لیتا تھا وہ پرانے لکھنؤ سے لے کر امین آباد کے بیرونی سرے تک بستا تھا، شہر کا وسطی حصہ وہ تھا جہاں جواہر لال جی نے تقریر کی تھی اور دوسرا بیرونی حصہ وہ تھا جہاں وہ مقیم تھے۔ اس طرح جواہر لال جی لکھنؤ کے آدھے سیاسی خطے سے گزر گئے تھے اور وہاں کے جوشیلے سیاسی لوگوں نے کسی نہ کسی طرح ان کے درشن کرلیے تھے۔

مولانا شوکت علی

اس بھاری بھرکم لیڈر سے میرا دوسرا قریبی سابقہ پڑا تھا مسلم یونیورسٹی میں ۔ وہاں وہ "آفتاب مجلس" کے ایک جلسے میں تشریف لائے تھے ۔ اس مجلس کے طلبار جواہر لال جی کی نئی طرز فکر سے کافی متاثر تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندستان کے اصل مسائل ہیں کسان، مزدور اور اوسط طبقے کے بے کار نوجوان ۔ اس جلسے میں مولانا نے نوجوانوں کو آزادی کے لئے قربانیاں پیش کرنے کا جوش دلایا۔

تقریر کے خاتمے پر نوجوانوں نے پوچھا:

"ہم کو آزادی سے کیا ملے گا ۔؟"

مولانا نے اس کے جواب میں ایک قسم کی شاعری کردی ۔ کہنے لگے کہ "قفس کی چڑیوں سے یہ پوچھو کہ آزادی کیا ہے ؟ قیدیوں سے پوچھو کہ رہائی سے کیا ملے گا..." وغیرہ وغیرہ ۔

طلبار کے سامنے جواہر لال جی کا سیاسی نظریہ تھا جو بتاتا تھا سچی سیاست جذباتی نہیں ہوتی ہے وہ عوام کے نفع ونقصان کو دیکھتی ہے اور عوام کا مطلب ہے مزدور، کسان اور بے کار نوجوان ۔ عوام میں سرمایہ دار زمیندار اور والیان ریاست شامل نہیں ۔ اس رو سے طلبار مولانا شوکت علی کی خالص جذباتی تقریر سے اکتا گئے تھے ۔

پہلی بار میں نے مولانا کو قریب سے فرنگی محل میں دیکھا تھا ، وہ مُرید تھے مولانا عبدالباری کے ۔ اس لیے ان کے بزرگوں کے عرس میں شرکت ضرور کرلیا کرتے تھے ۔ میں نے ایک عرس میں ان کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ کھانا نوش فرما رہے تھے ۔

دیکھتے دیکھتے وہ پلاؤ کی تین پلیٹیں سوارت کرگئے تھے اور اب زردہ کی بھری ہوئی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئے تھے ۔

میں نوجوان تھا ، ورزش کرتا تھا اور میرا قد مولانا کے برابر تھا ۔ اس کے باوجود میں نے مولانا کی جو غذا دیکھی تھی ، اس کا صرف چھٹا حصہ میرے لیے کافی تھا ۔ عرس میں شرکت سے کچھ ہی دن قبل مولانا ایک جلسے میں نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہہ چکے تھے کہ " کم خوردن وکم گفتن وکم خفتن کار خردمندان است " (عقل مند کم کھاتا ہے کم بولتا اور کم سوتا ہے)

میں نے مولانا کے بارے میں اپنے یہ سب تجربات اپنے ہوسٹل کے طلبار کو سنائے ۔ اتفاق سے بعض طلبار خود دیکھ چکے تھے کہ مولانا غذا کے ساتھ کس اخلاق سے پیش آتے ہیں ۔ اس لیے میری باتیں سُن کر بڑی سنجیدگی سے یہ بحث چھڑ گئی کہ پیٹ کے رقبے اور عمدہ غذا میں کیا رشتہ پایا جاتا ہے ۔ اس بات کو تو سب ہی مان رہے تھے کہ یہ ایک علت ہے اور دوسرا معلول ۔ مگر یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ علت کون ہے اور معلول کون ۔ آیا اچھی غذا یہ کرتی ہے کہ پیٹ کے اندر پہنچ کر پھیل مچاتی ہے کہ مجھے کہاں کال کوٹھری میں بند کردیا ہے، بڑھاؤ اس کا رقبہ ۔ اور اس طرح وہ دن بدن رقبہ بڑھواتی چلی جاتی ہے ۔ یا یہ کہ پیٹ کا رقبہ ایسی شر انگیز چیز ہے کہ جہاں اس کو اچھی غذا ملی وہ مچل جاتا ہے کہ اور لاؤ اور لاؤ ۔ جتنا بھی اس کے اندر بھرو، اس کی اور اور کی صدا میں اتنا ہی زور آتا جاتا ہے ۔

اس بحث میں ڈاکٹری اور طبی اصول بھی چلے ۔ قحط سالی کے تاریخی حوالے بھی چلے ، لطیفے اور قہقہے بھی اور چائے کی چسکیاں بھی ۔ ایک موقع پر بحث اس نکتے پر دیر تک ٹکی رہی کہ اگر کسی دماغ میں سیاسی خیالات کچے ہوں تو کیا اس کو پکا مُرغ راس آسکتا ہے ۔؟ آخر دن گزر گیا اور شام ہونے کو آگئی ۔ لیکن فریقین میں سے کسی نے بھی ہار نہیں مانی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کُشتی برابر کی چھوٹی ۔ مگر بحث میں فریقین نے اس بات کا بہت لحاظ رکھا کہ مولانا کی شخصیت کا تذکرہ نہ آئے ۔ مگر کنایے کی بات دوسری ٹھہری ۔

کچھ ہی عرصے بعد مولانا شوکت علی اپنے ناقص سیاسی خیالات کو لے کر مسلم لیگ میں چلے گئے، اور نگینہ جاکر حافظ محمد ابراہیم کے خلاف جو کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے، لیگی اُمیدوار کی حمایت کی ۔ اس سلسلے میں ایک اور موقع پر جب وہ تقریر کر رہے تھے تو کسی نے ان سے پوچھا کہ

" غریبوں کی روٹی کے لئے مسلم لیگ والے کیا کریں گے ۔؟"

انھوں نے جواب میں جو فقرہ کہا اس پر مدتوں تک اخباروں اور جلسوں میں بحثیں ہوتی رہیں ۔ انھوں نے کہا ـــــ

" روٹی کے لیے لڑتے ہیں کُتّے ۔!"

مولانا حسرت موہانی

حسرت شاعر بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی ۔ لیکن ان کی شاعری ان کی لیڈری میں کہاں تک داخل تھی، یہ بتانا مشکل ہے ۔ خود حسرت نے اپنے بارے میں جو کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے ؏

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کی سیاست کا مزاج یہ تھا کہ وہ کبھی کٹر کانگرسی تھے، مگر پھر سخت کیونسٹ بن گئے، پھر اچانک لیگی بن گئے۔ لیگی بننے کی انھوں نے جو توجیہ پیش کی تھی وہ بڑی زبردست شاعری تھی، اس سے ان کی سیاست کم، جذبات واضح ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ میں ایک تقریر میں کہنے لگے:

"لوگ کہتے ہیں کہ تم تو کیونسٹ تھے، لیگی کیسے بن گئے؟ میں کہتا ہوں دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک ال ہی تو بڑھ جاتا ہے۔"

حسرت اگر کسی چیز میں شروع سے آخر تک پکے رہے تو وہ تھی ان کی اپنے پیر سے عقیدت۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کو آنکھوں کی شکایت ہو گئی اور ان پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس حال میں سفر کرتے ہوئے وہ آرہے تھے۔ جب لکھنؤ قریب آیا تو یہ شعر زبان سے نکل گیا ہے

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

واقعہ تو یہ ہے کہ حسرت کی ساری زندگی جس میں ان کی سیاست بھی آتی ہے شاعرانہ جد و جہد کی تھی۔

مولانا آزاد

ایک مرتبہ لکھنؤ کی فضا میں اچانک بجلی سی چمک گئی۔ یہ یوں ہوا کہ اس شہر میں مولانا آزاد کی پرشکوہ آواز گونج گئی اور اس نے ہندستان کو جھنجھوڑ دیا۔ کمپنی باغ اس زمانے میں بہت وسیع پارک تھا۔ اس کے بیچ میں ایک عالی شان پنڈال بنایا گیا تھا اور اسی میں آزاد کانفرنس منعقد ہوئی تھی ـــ اس کانفرنس میں، ایک طرف تو ہندستان بھر کے سابق لیگی تھے جو کسی وجہ سے پاکستان نہیں جاسکے تھے، دوسری طرف تھے وہ مسلمان قوم پرور جن کو یہ دکھ تھا کہ وہ نہ تو ہندستان کو تقسیم سے روک سکے تھے اور نہ ہندستانی مسلمانوں کو اس بربادی اور قتلِ عام سے بچا سکے تھے جو تقسیم کے ردِ عمل میں پھٹ پڑا تھا۔

مولانا آزاد نے اپنی گھن گرج آواز اور پرشکوہ الفاظ میں صرف مسلمانوں کو نہیں سارے ہندستان کو جو پیام دیا تھا وہ کچھ ایسا تھا:

"بوجھ جو سر پر آن پڑا ہے اس کو اٹھانے کی ذمہ داری آج دونوں ہاتھوں پر ہے یعنی ہندوؤں پر بھی ہے اور مسلمانوں پر بھی ـ اگر اب تک اس ذمہ داری کو نباہنے میں غفلت برتی گئی ہے تو غلطی کی گئی ہے، شدید غلطی کی گئی ہے۔ اب اس غلطی کو جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے بلکہ کفارے کے طور پر زیادہ زور سے کام ہونا چاہیے۔"

مولانا کے اس خیال کی مدتوں تک گفتگو، تقریروں اور تحریروں میں بازگشت ہوتی رہی۔

حضرت محل کا مجسمہ

لکھنؤ والوں کی خواہش تو یہ تھی کہ بیگم حضرت محل پارک میں پہلی جنگ آزادی کی ہیروئن کا ایک بڑا مجسمہ لگایا جائے۔ لیکن قدامت پسندوں نے اس کو بے پردگی قرار دے دیا۔ اس وجہ سے مجسمہ نہیں لگایا جاسکا لیکن اس عوامی فتوے اور رواج پر ایک واقعہ نے ایسی ضرب لگائی کہ وہ معقولیت کے حدود سے خارج ہو گیا۔

وہ واقعہ تھا آل انڈیا مسلم لیگ کا لکھنؤ میں جناح صاحب کی صدارت میں اجلاس۔ اس اجلاس میں ایک نئی بات یہ ہوئی تھی کہ لگ بھگ ایک درجن مسلم شریف خواتین نے بلا برقع کے مروجہ لباس یعنی نیم آستین کے بلاؤز اور ساری میں اور ساتھ ساتھ مروجہ لپ اسٹک اور پاؤڈر میں، اجلاس میں شرکت کی تھی۔ ان میں سے تین چار خواتین تو ڈائس پر علماء کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں اور علماء اس بات کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے تھے

اب تک پردے کا جو زور تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک سیاسی جلسے میں عورتوں کے لیے چقوں کے پیچھے نشست رکھی گئی تھی، کچھ عورتیں جو برقع میں تھیں وہ ان چقوں سے نکل نکل کر مردانے میں آکر وہاں کی کرسیوں پر بیٹھنے لگیں کیوں کہ زنانے کلاس میں جگہ نہیں رہی تھی۔ مسلمان حاضرین نے عورتوں کی اس حرکت پر شور مچایا۔ وہاں مولانا آزاد موجود تھے۔ انھوں نے کہا:

"اگر خواتین برقع میں ریلوے اسٹیشن جاسکتی ہیں تو اس جلسے میں برقع میں رہ کر کرسیوں پر کیوں نہیں بیٹھ سکتی ہیں؟"

دوسرے دن مسلم اخباروں نے مولانا پر خوب خوب حملے کیے۔ مولانا نے اپنے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ آپ لوگ اپنے اعتراض کو قرآن

پروفیسر محمد حسن
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹

لکھنؤ کے مہاجر ادب پر ایک نظر

اودھ کا اُردو ادب تمامتر مہاجر ادب ہے۔ دلی سے آنے والے اُردو شاعروں کے نشانات نہیں ملتے۔ بعد کے دور میں البتہ یہاں آباد مہاجر خاندانوں نے اس علاقے کو اپنایا اور یہیں ایک نئے رنگِ سخن کی بنیاد ڈالی۔ بعد کو انہی مہاجرین نے لکھنؤ کو ایسا اپنایا کہ ان کی اولاد اودھ کی ہو رہی اور لکھنوی کہلائی۔

پہلا دور میر، سودا، ضاحک اور میر حسن کا ہے۔ یہ سب دلی سے فیض آباد اور پھر لکھنؤ پہنچے اور دلی کی ادبی وراثتوں کے ساتھ پہنچے۔ ان سب کے ہاں (سوائے میر کے) ایک ایسی معروضیت کے آثار ملتے ہیں جو اس سے قبل تقریباً ناپید تھی۔ دلی سے آنے والے مہاجروں نے اپنا غم تو یکسر نہیں بھلا دیا اور میر تقی میر ہوں یا میر حسن یا پھر بعد کے دور کے دریائے لطافت والے انشا اللہ خاں جنھوں نے قتیل کے ساتھ مل کر مبر عنصرِ غیبی کا کردار تخلیق کیا اور مہاجروں کی طرح یادِ ماضی کو پھر سے زندہ کر دیا۔ مگر اودھ آکر اپنی ذات کے خول میں بند شاعروں کو بھی ذات سے ماورا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اس کی نظیر ہے۔

اردگرد کی زندگی کی ساری بہار کو شاعری میں سمونے کا میلان اودھ کی پہچان ہے۔ وجہ اس کی کئی ہیں، ان میں ایک تصوف کی بالادستی کا خاتمہ بھی ہے جو دلی کے شاعروں کو ان کی ذات کے اندر بند کیے رکھتے تھے یہاں آکر وہ بت ٹوٹ گیا، گو گاہے بگاہے اودھ کی غزل بھی تصوف سے یکسر آشنا نہیں مگر یہ کبھی کبھار کی صاحب سلامت ہے۔ تصوف "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی" سے عبارت ہے۔ اودھ کے اُردو ادب نے زندگی کو اس کے معروضی روپ میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پائیں باغ کی وہ کھڑکی جو بقول محمد حسین آزاد، میر نے آکر نہ کھولی، یہاں آکر کھل گئی اور اس کھڑکی کے کھل جانے سے نظارۂ بہار بھی ہوا اور باہر کی ہوائیں بھی اندر آئیں اور ان کے ساتھ خوشبوئیں بھی آئیں اور گرد و غبار کے جھکّڑ بھی۔

اسی لیے مثنوی اُبھری۔ سحر البیان۔ گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق ہی نہیں ہوس کی لیلیٰ مجنوں بھی اور واجد علی شاہ کی غزالہ ماہ رو بھی۔ اسی لئے اندرسبھا کی روایت اُبھری جس نے صرف اُردو ہی میں نہیں، دورِ جدید میں ہندستان کے قومی ڈرامے کا آغاز کیا۔ اسی کے زیرِ اثر واسوخت کا پورا سلسلہ سامنے آیا۔ امانت سے لے کر امیر مینائی تک جس نے اس دور کے تمدن کی جھلکیاں لافانی طور پر محفوظ کرلیں۔ لباس، آرائش و زیبائش سے لے کر رہن سہن کی نجی تفصیلات تک۔ اسی کے زیرِ اثر قصہ گوئی اور داستان گوئی پروان چڑھی جو لکھنؤ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر چوراہے پر داستانیں بیان کی جانے لگیں۔ اسی کے سہارے مرثیہ گوئی نے محض نجی رنج و غم کے اظہار کے دائرے سے آگے قدم بڑھا کر اسے رزمیہ شاعری اور ڈرامائی عناصر سے روشناس کرادیا اور تاثر سے زیادہ واقعہ نگاری کا رتبہ بنا دیا۔

آج بھی بیانیہ شاعری کے نام پر ناک بھوں چڑھانے والوں کی کمی نہیں لیکن یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ اودھ کی اُردو شاعری نے شعری افق کو معروضیت کے سہارے وسیع نہ کیا ہوتا تو اقبال اور جوش ملیح آبادی کا وجود نہ ہوتا اور اُردو شعر و ادب کا کل سرمایہ چند مٹھی سوتی غزلوں اور کچھ تصوف زدہ باطنی تصورات تک محدود رہتا۔

لوک عناصر

اسی معروضیت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اودھ میں چوں کہ اُردو

ادب کا پودا دہلی سے لاکر لگایا جا رہا تھا اور اودھ میں ایسی حکومت پنپ رہی تھی جو برائے نام تو دہلی کے تابع تھی (اور وہاں کی تہذیبی فضا سے متاثر بھی تھی) مگر درحقیقت اپنی انفرادیت اور پہچان رکھتی تھی اس لئے اسے مقامی عناصر سے قریب تر ہونے کی ضرورت تھی کہ مرکز کے مقابلے میں بھی اسے علاقائی اور مقامی مدد حاصل ہو سکے۔ اس لحاظ سے بھی اودھ کے اُردو ادب کے رشتے اس علاقے کی عوامی روایت سے بہت قریبی ہو گئے۔ لکھنوی کلچر اور ادب کے اس پہلو پر ابھی کام نہیں ہوا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس سے قبل عوامی تہذیب کے عناصر کا استعمال اُردو ادب میں شاید ہی کبھی اس قدر اور اس طرح ہوا ہو۔ صرف ایک ہی مثال کافی ہے اور وہ ہے امانت اور مداری لال کی اندر سبھا میں لوک روایت کا بھرپور استعمال۔ یہ عوامی عناصر خواہ کسی پردے میں کیوں نہ پیش کیے گئے ہوں، چھپائے نہیں چھپتے۔ یا پھر واجد علی شاہ کا رادھا کنھیا کا قصہ یا پھر خود مرثیوں اور داستانوں میں لوک عناصر۔ کرشن کنھیا سے واجد علی شاہ کا گہرا لگاؤ بلکہ IDENTIFICATION اور بسنت کا قومی تہوار بن جانا بھی اسی کا ثبوت ہیں۔

عشق کی ارضیت

معروضیت کا ایک تیسرا رُخ بھی تھا۔ اپنے باطن کی گہرائیوں سے نکلنے پر رشتہ نشاطِ زندگی سے بھی مضبوط ہوا۔ کل کے نشاطِ زیست پر آج فحاشی کا لیبل لگا کر پورے دور کے ادب کو مصلوب کرنا نہایت آسان ہے لیکن ذرا ایک اور زاویے سے بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اس سے قبل اردو ادب کا ایک بڑا حصّہ (خاص طور پر شاعری) ایک ایسے محبوب کے بارے میں تھی جس کے نہ دہن تھا نہ کمر۔ شاعروں اور شاعروں کے خوش عقیدہ ناقدوں نے اسے حُسن کا حقیقی پیکر قرار دے کر تصوّف سے اس کا جواز تلاش کر لیا مگر اودھ میں جس عشق کا تصور ابھرا وہ ارضی عشق تھا اور اس کے رشتے ماورائی اور متصوفانہ نہیں تھے۔ گوشت پوست کے انسانوں سے تھے اس لیے دہن بھی تھا اور کمر بھی اور ناز و انداز بھی۔ نشاط و کیف اور درد و کرب بھی۔

ظاہر ہے کہ یہ محض عیاشی نہیں تھی بلکہ عشق کے ایک ارضی روپ کا عمل دخل تھا۔ بے شک اس میں آلودگی بھی پیدا ہوئی مگر پہلی بار اردو ادب میں انسانوں کے انسانی معاملات کسی قسم کی متصوفانہ معذرت یا کسی قسم کے اخلاقی یا نیم اخلاقی جواز کے بغیر پیش کیے گئے نظم ہی میں نہیں نثر میں بھی۔ یہاں شہزادیاں ہوں یا چڑیلیں، دونوں کے روپ کم و بیش ارضی ہیں۔ حتیٰ کہ فوق فطری داستانوں اور قصّوں میں بھی اور دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم کی بکاؤلی میں بھی، اور حسن و عشق کے اس ارضی روپ کی بازیافت اودھ کے کارناموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

یہ بات منفی طور پر تو بہت دہرائی گئی ہے کہ اودھ کے اُردو ادب میں سوز و گداز کی کمی ہے مگر اس کا مثبت پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ زندگی میں بہت سے دکھ درد سہی مگر زندگی تمام و کمال نالہ و فریاد نہیں ہے، نشاطِ زیست کا نغمہ بھی ہے اور یہ نشاطیہ نغمہ یا یوں کہیے کہ زندگی کی لذت کا عکس جتنا اودھ کے ادب میں ملتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ زندگی کی صلابت، اس کے نعمت ہونے کا احساس اور اس کی لذتوں کا ذکر۔ ہمارے ادب میں اودھ ہی کی بدولت ہوا ہے، بعد کے دور میں بھی ان قدروں کے ساتھ جن شاعروں کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے وہ بھی اکثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اودھ کلچر ہی کے پروردہ ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی، یگانہ اور مجاز۔

زبان

اودھ کلچر کی ایک اور پہچان ہے زبان دانی۔ بے شک ادب ہی میں نہیں، روزمرّہ کی زندگی میں بھی صحتِ زبانی پر لکھنؤ میں بہت زیادہ زور دیا گیا، زبان کے آئین و آداب بنے، نعت نویسی پر توجہ صرف ہوئی، قوافی پر کتابیں تصنیف ہوئیں، متروکات کی فہرستیں مرتب ہوئیں اور یہ اعتراض عام ہو گیا کہ لکھنؤ نے کتابی دنیا کو رواج دیا اور ہندی الفاظ کے ساتھ تعصب برتا۔

ان دونوں باتوں میں بھی ادھوری سچائی ہے جو جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ پہلے ہندی لفظوں کی بات کو لیجیے، جنھیں 'ہندی' لفظ کہا جا رہا ہے وہ زیادہ تر برج اور اودھی کے الفاظ ہیں اور انھیں ترک کرنے کی بات اتنی تعصب کے زیر اثر نہیں کہی گئی جتنی شہری شائستگی کے پیش نظر کہی گئی۔ آج کی ایک مثال لیجیے۔ مغربی اتر پردیش کے دیہاتوں میں

اور بعض قصبوں تک میں قریب کے معنی میں 'دھورے' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اسی طرح پھینکنے کے معنوں میں 'لگیلنے' کا لفظ مستعمل ہے مگر وہی لوگ جو بلا تکلف یہ لفظ اپنے گھروں میں یا اپنے قصبوں اور دیہاتوں میں بولتے ہیں، شہروں میں یہ لفظ استعمال نہیں کرتے ۔

اور یہ استعمال نہ کرنا کسی تعصب کی وجہ سے نہیں ہوتا شہری تمدن کے فراہم کردہ لسانی کلچر کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ اودھ میں بھی ایسا ہی ہوا جسے لے کر نت نئی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ۔ اور امرت رائے نے تو اپنی کتاب " ہاؤس ڈوائیڈڈ " میں اسی کو اُردو کی علاحدہ شناخت کی بنیاد قرار دے دیا ۔ سچ یہ ہے کہ شہری زندگی کے عروج سے الفاظ میں یہ کاٹ چھانٹ ہونا لازمی ہے اور اودھ میں اُردو کی یہ آئین بندی ہونا ایک قدرتی لسانی عمل کا نتیجہ تھی ۔

اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ لفظ کی تہ داریوں اور معنویت کی رنگا رنگی کا جو شعور اودھ کے ادب نے عطا کیا اس کی صرف ایک مثال دہلی میں ایہام گوئی میں اور کہیں کہیں میر کی شیوا بیانی ہی میں ملے تو ملے ورنہ نایاب ہے ۔ ہر لفظ کے ہزار گونہ پہلو ہوتے ہیں اور ان میں لہجہ، فضا اور اشاریت مزید اضافے کرتی چلتی ہے ۔ بے شک غزل کی شاعری لکھنؤ میں اعلیٰ درجے کی نہیں ہوئی اور ناسخ کی بے کیفی نے تغزل پر فتح پائی یا یوں کہیے اسے بے کیف کر دیا مگر یہ بھی سچ ہے کہ لفظ کی جو ہزار شیوگی اور رنگا رنگی لکھنؤ نے بخشی وہ نایاب تھی ۔

بعد کے ادبی مورخوں نے ناکافی شواہد کی بنا پر لکھنؤ کو دہلی کے دبستان کے مقابل لا کھڑا کیا ، اور ایسی تصویر بنائی جیسے یہ دونوں مقامی دبستان ایک دوسرے کے مقابل یا ایک دوسرے کی ضد ہوں ۔ جبکہ لکھنؤ کا دبستان شاعری دہلی کا ارتقا تھا اس کی اگلی منزل کی حیثیت رکھتا تھا ۔ یہ ارتقا قدرتی اور فطری تھا ۔ اسی لیے جو رنگ اودھ میں ابھرا اسی کی پیروی بعد میں دہلی میں بھی ہوئی ۔ زبان اور محاورے کے بعض اختلافات سے قطع نظر دہلی میں بھی بعد کو یہی رنگ شاعری غالب ہوا ۔ خود مرزا اسد اللہ خاں غالب نے متعدد غزلیں ناسخ کی زمینوں میں کہی ہیں اتنی کسی اور اُردو شاعر کی زمینوں میں نہیں کہیں ۔ حد یہ ہے کہ میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے تو بھی بقول ناسخ کہہ کر کیا ہے اس کے علاوہ شاہ نصیر کی غزلوں میں بھی ناسخی رنگ کی بے کیفی ہے اور بعد کے ٹھیٹھ دہلوی شاعر داغ دہلوی میں جرأت کی " چوما چاٹی " بھرپور شکل میں موجود ہے ۔ گویا مہاجر ادب کے روپ میں جو کچھ لکھنؤ میں پروان چڑھا تھا وہ اپنے اصل وطن کی طرف وراثت کے طور پر پہونچ گیا ۔

اس کا ایک ثبوت اُردو ادب کی تہذیبی توسیع اور اس کی بڑھتی ہوئی ارضیت بھی ہے جو محمد شاہی دور کی دہلی سے شروع ہوئی اور لکھنؤ میں اپنے عروج کو پہنچی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے نقد میر کے آخری مضمون میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محمد شاہی دور میں کلچر اور علم و ادب کے سبھی شعبوں پر فارسی اور ترکی اثرات کم ہونے لگے اور ہندستانی اور مقامی اثرات کا غلبہ ہوا ۔ اسی کا ایک نتیجہ اس دور کے ایرانی اور ہندستان کے فارسی داں شاعروں کی کشمکش (علی حزیں اور خان آرزو کے معرکے) کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسی سبب دہلی میں فارسی کی جگہ اُردو شاعری کا چلن ہوا سودا نے اپنے قطعے میں واضح طور پر فارسی گو ہندستانی شاعروں کو یہ صلاح دی کہ وہ فارسی چھوڑ کر اُردو میں شاعری کریں ۔
یہی رنگ اودھ پہونچ کر اور پکا ہو گیا اور یہاں کے مقامی بلکہ لوک عناصر کی آمیزش زیادہ نمایاں ہوئی جس کی طرف ASSEMBLY OF RIVALS میں کارلا پیٹی وچ (CARLA PETIEVICH) نے بجا طور پر لکھا ہے :

> THE COURT AND CULTURE OF LUCKNOW PRESENTED A CASE IN POINT. ITS OFFICIAL COURT LANGUAGE WAS URDU, AN INDIAN LANGUAGE, AND MANY OF THE ART FORMS DEVELOVED THERE (ESPECIALLY KATHAK DANCE AND THE THUMRI STYLE OF VOCAL MUSIC - BOTH ART FORMS FEATURED NARRATIVES OF THE LOVES OF KRISHNA AS WELL AS OTHER HINDU LEGENDS) WERE UNABASHEDLY INDIAN - IN FACT HINDU- IN THEME.
> P: 192

مقامی ہندستانی عناصر اور لوک کلچر سے قربت پر اضافہ کچھ ان یورپی اثرات کا ہے جو اودھ میں غیر ملکی ذرائع سے آئے ۔ ان میں خاص طور پر فرانسیسی اور انگریزی کلچر کے اثرات تھے ۔ نصیر الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک فرانسیسیوں اور انگریزوں دونوں کا اودھ میں اچھا خاصا عمل دخل رہا ہے جس کی تصویر کشی PRIVATE LIFE OF AN EASTERN KING اور کسی قدر نمک مرچ لگا کر نجم الغنی کی " تاریخ اودھ " میں کی گئی ہے اور اسی بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے محمد عشر نور الٰہی صاحبان کو یہ مغالطہ ہوا

کہ واجد علی شاہ کے دور میں اندر سبھا کا عروج یورپی ڈرامے کی تحریک سے ہوا۔ انشآ کے کلام میں انگریزوں اور ذرانسیسیوں کی طرف اشارے اور حوالے جابجا ملتے ہیں۔ یہی حال رنگین کا بھی ہے۔ "فسانۂ عجائب" میں سپر مجسٹین جیسے کردار بھی ملتے ہیں۔ غرض تہذیبی امتزاج کا ایک نیا پیکر لکھنؤ کے اُردو ادب میں اُبھرا۔

بے شک غزل سے لکھنؤ کے سکہ بند شاعروں نے کیفیت چھین لی مگر اسی کے عوض مرثیے، مثنوی، ڈرامے، واسوخت کی شکل میں اتنا کچھ دے دیا اور نثر کو اتنا آگے بڑھادیا کہ یہ کمی پوری ہوگئی۔ اس ذخیرۂ ادب کی اپنی خصوصیات اور اپنی پہچان ہے جس میں ارضیت اور زبان کی آئین بندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے لکھنؤ کی شاعری اور ادب پر منفی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے دیانت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کے مثبت اور قابل قدر پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے اور اس کی تہذیبی انفرادیت اور ادبی قدر وقیمت کا بھی معروضی انداز میں تعین کیا جائے، اس کے لئے شاید لکھنؤ کے ادبی سرمائے پر نئے سرے سے دوبارہ نظر ڈالنا ضروری ہے جو تعصب سے پاک اور قدیم تنقید کی سکہ بندی سے آزاد ہو۔

□□

اودھ کا نیا جنم

صفحہ ۱۵ کا بقیہ

اور حدیث کی روشنی میں پیش کیجیے۔

لکھنؤ میں پردے کا ایسا زور تھا کہ لڑکیاں برقع میں یونیورسٹی نہیں جاسکتی تھیں یعنی ان کے لیے علم کا راستہ بند تھا لیکن مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد پردے کا زور ٹوٹنے لگا اور لڑکیاں برقع میں کالج جانے لگیں پھر رفتہ رفتہ کالج کے اندر بلا برقع کے کلاسوں میں جانے لگیں۔

چند برسوں کے بعد لڑکیوں کا برقع بالکل اتر گیا اور مزید چند برسوں کے بعد اس حد تک برقع اتر گیا کہ خواتین بازاروں میں خریداری کے لیے جانے لگیں۔ مسلم لیگ اور جناح صاحب کی یہ دین ایسی ہے جس کا میں بھی معترف ہوں۔ اب بیگم حضرت محل پارک میں جو جلسے ہوتے ہیں وہ سیاست کی گزشتہ ترقیوں اور تبدیلیوں کا البم ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ ہے موجودہ دور کا اودھ۔!!

□□

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹۔ڈی کے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جارہی ہیں:

(۱) مقام اشاعت: لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت: ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام: شری راجیوارورا

قومیت: ہندستانی

پتہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، گوتم بدھ مارگ لکھنؤ

(۴) پبلشر کا نام: شری اَتُل بگائی

قومیت: ہندستانی

پتہ: ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

(۵) ایڈیٹر کا نام: شری سید امجد حسین

قومیت: ہندستانی

پتہ: ایڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں: "نیا دور" سرکاری جریدہ ہے

میں اَتُل بگائی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط)

اَتُل بگائی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

لکھنؤ

(موسیقارِ اعظم اودھ رتن) نوشاد
'آشیانہ'، کارٹر روڈ، باندرہ، بمبئی ۵۰

لکھنؤ کی گائکی لکھنؤ کا کتھک

مولانا حالی نے یہ شعر لکھا تو "دہلی مرحوم" کے لیے تھا، لیکن حرف بہ حرف صادق آتا ہے لکھنؤ کے ان ماہرینِ موسیقی پر، جن کا فن یا تو ان ہی کے ساتھ قبروں میں دفن ہوگیا، یا ان کی چتاؤں کے شعلوں میں جل کر راکھ ہوگیا ؎

ذرّے ذرّے میں ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

افسوس کہ یہ خزانہ یعنی لکھنؤ کا گائکی گھرانہ موسیقی کی تاریخ میں اس طرح محفوظ نہ رہ سکا جس طرح مثال کے طور پر گوالیار یا کرانہ کا گھرانہ رہا۔ حالاں کہ اس شہر نے ایسے ایسے باکمال فن کار پیدا کیے جنھیں اپنے دور میں فن کی آبرو اور انتہا قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم تک ان کی زندگی کی چند کہانیاں ہی پہونچ پائیں، ان کا فن نہیں پہونچ پایا۔

اگر آج بہت سے لوگوں کو ان بے مثال فن کاروں کے نام بھی نہیں معلوم، تو اسکے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن اربابِ قلم کے سپرد یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے تاریخی ورثہ کو لوگوں کے دلوں میں اور کاغذ کے سینے پر محفوظ کرادیں۔ انھوں نے فنِ موسیقی کو وہ رتبہ ہی نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے۔ سماج میں بڑے اور چھوٹے پن کو ناپنے کے دوہرے معیاروں اور جھوٹے پیمانوں کی وجہ سے موسیقاروں، گلوکاروں اور رقاصوں کو ہمیشہ تیسرے درجے کا شہری سمجھا۔

عجب ستم ظریفی ہے کہ جو معاشرہ اپنی تقریبات میں موسیقاروں، گلوکاروں اور رقاصوں کی شمولیت کو وجہِ امتیاز قرار دیتا تھا اور اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اپنے وقار تک کو داؤں پر لگا دیا کرتا تھا، وہی معاشرہ ان فن کاروں کی سماجی حیثیت سے منکر رہا اور انھیں محض سامانِ تفریح سمجھتا رہا۔ ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق ان کا فن ہی ان کے لئے باعثِ محرومی بنا رہا۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ فن کار اپنی سماجی کیفیت میں کسی سے کم رتبہ رہے ہوں، ان میں سے بیشتر کا نسبی اور خاندانی پس منظر شرافت اور نجابت کا آئینہ دار ہوا کرتا تھا، اور یہ بھی نہیں کہ یہ فن کار سماجی ذمہ داریوں سے عاری اور معاشرہ کے لیے بے فیض رہے ہوں۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ فن کار اپنے فن کی دنیا میں اتنے گُم تھے کہ انھیں سماجی رُتبوں کی کوئی فکر نہیں تھی، اپنے فن سے ان کا تعلق وہی تھا جو عابد کا نماز سے ہوتا ہے ؎

بخدا خبر نہ دارم، چو نمازی گزارم
کہ تمام شد رکوعے، و امام شد فلانے

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان فنکاروں میں سے بیشتر اپنی دینداری اتقا اور پارسائی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ان میں جو ہندو تھے وہ اپنے پوجا پاٹھ سے غافل نہیں تھے اور انھیں اپنے دھرم کا گیان شاید پیشہ ور پنڈتوں سے بھی زیادہ تھا اور جو مسلمان تھے وہ نہ صرف اسلام کی اعلیٰ اقدار سے بخوبی واقف تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ صوم و صلوٰۃ مصلیٰ و تسبیح اور حبِ عقیدہ عزاداری اور احترامِ شہادت ان کی زندگی کے اتنے لازمی جزو تھے جتنا کہ خود ان کا فن! اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بھلا کون کافر اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر بسم اللہ خاں کی شہنائی

سے نکلی ہوئی تان سنگیت کی عظمتوں کی قسم کھاتی ہے تو ان کے ماتھے پر سجدوں کا نورانی نشان ان کے روحانی تقدس اور زہد و تقویٰ کی گواہی دیتا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

زمانے کے معیار اب بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ فن کاروں کی ناقدری آج بھی ہے، لیکن بہر حال وہ بے حسی کم ہو چکی ہے جو فن کاروں کو جیتے جی مار دیا کرتی تھی۔ گزرے ہوئے کل کے فن کار کی قسمت میں صرف فراموشگی تھی۔ اس لیے جن آنکھوں نے ان فن کاروں کو دیکھا اور جن کانوں نے ان کے گرانمایہ فن کا فیض اٹھایا، صرف وہی ان کے گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں استثنیٰ صرف ایک کتاب "معدن النغمات" ہے، جس کے مصنف راجا نواب علی تھے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل تھی اور اردو کی شاید پہلی ایسی کتاب تھی جس میں فن موسیقی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں بعض فن کاروں کا ذکر بھی تھا۔ یہ کتاب برسوں سے دوبارہ نہیں چھپی۔ شاید اب بھی اس کی کوئی کاپی امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ یا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہو۔ اس کتاب سے ایک عرصہ تک ہندستان بھر کے گائک مستفید ہوتے رہے اور اگر دوبارہ شائع ہو جائے تو تمام برصغیر کے اردو داں آج بھی اس سے فیض اٹھا سکتے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے جن فن کاروں کے بارے میں جانکاری ہوئی وہ اپنے استاد یوسف علی خاں کے توسط سے ہوئی، جو ستار نوازی میں شہرہ آفاق تھے چنانچہ ان ہی کے مطابق آزادی سے قبل کے لکھنؤ میں گائکی کے سب سے مستند خلیفہ احمد حسین صاحب تھے۔ ۱۹۳۰ء کے دہے میں ان کی سارے ہندستان میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ افسوس کہ نہ ان کی گلوکاری کے ریکارڈ بن سکے نہ اس زمانے میں ویڈیو کا چلن تھا کہ ان کا فن محفوظ کر لیا جاتا۔

ایک اور عظیم فن کار اُستاد چنو خاں تھے۔ بڑی پُر اسرار کہانیاں ان سے منسوب تھیں۔ وہ سرود بجانے میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ غریب آدمی تھے۔ نہ جانے کیسے ایک سرود حاصل کر لیا تھا۔ وہ جب بجاتے بجاتے کہیں سے ٹوٹ جاتا تھا تو اس پر جھلّی یا کسی اور چیز کا پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ دن بھر لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتے تھے اور نہ جانے کیا راز تھا کہ جن دوکانوں پر سائن بورڈ لگا ہوتا تھا انھیں جھک کر سلام کرتے تھے۔

سرود کے علاوہ انھیں جس دوسری چیز سے عشق تھا، وہ افیم تھی۔ دن بھر بھٹکنے کے بعد رات کو کسی مسجد میں سو جاتے تھے۔ لیکن لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا تھا اور کہتا تھا کہ سرود استاد چنو خاں کے لئے ہی ایجاد ہوا تھا۔

ان کے ایک دوست برکت خاں صاحب نے ان کے لیے ایک نفیس جوڑا بنوا دیا تھا جو صرف اس وقت پہنتے تھے جب کسی نواب یا رئیس کی محفل میں سرود نوازی کے لیے بلائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ افیم اس قدر کھاتے تھے کہ اکثر محفلوں میں سرود بجاتے بجاتے پینک میں غافل ہو جاتے تھے۔ طبلے والا طبلہ بجاتا ہی رہتا تھا اور سرود اچانک خاموش ہو جاتا تھا۔ پھر جب برکت خاں انھیں ٹھوکا دیتے تو وہ چونک کر سرود بجانا شروع کرتے تھے اور مزا یہ کہ غفلت سے چونکنے کے بعد بھی ٹھیک سم پر ہی آتے تھے۔ لوگ جو پیسہ نذر کرتے تھے وہ برکت خاں کی جیب میں جاتا اور افیم کا ایک بڑا سا گولا اُستاد چنو خاں کے حصے میں۔

دراصل یہ افیم بازی بھی اس بے حسی کی وجہ سے ہوتی تھی جو معاشرہ میں ان کے فن کے تعلق سے عام تھی۔ یہ فن کار جانتے تھے کہ دنیا ان کے فن کی وہ قدر نہیں کرتی جو کرنی چاہیے اس لیے وہ اپنی اس دنیا میں کھوئے رہنا چاہتے تھے جہاں وہ آپ ہی فن کار تھے اور آپ ہی قدرداں۔ اس دُنیا پر ان کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہوتا تھا۔ اس دنیا میں داخلے کا واحد دروازہ اس زمانے میں افیم کی کنجی ہی سے کھلا کرتا تھا ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اپنے استاد ہی سے میں نے ایک اور استاد کی کہانی سنی تھی جن کا نام نامی بھی کہیں فراموشگی کی گرد تلے دب کر رہ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ استاد بھی اپنے وقت کے خلیفہ تھے، لیکن کسی کو شاگرد نہیں بناتے تھے۔ مگر فن کا دیوانہ ایک لڑکا کچھ اس طرح ان کے پیچھے پڑا کہ انھیں پہلی بار ہار ماننا پڑی۔ استاد نے اس شرط پر اسے شاگردی میں لینا قبول کیا کہ وہ گانا سیکھ تو لے گا لیکن کسی محفل میں کبھی گائے گا نہیں۔ عجیب شرط تھی، مگر شاگرد کو ماننا پڑی۔

استاد نے اسے اپنے بچوں کی طرح گھر میں رکھا، پالا پوسا اور برسوں سکھایا۔ شاگرد ایسا تیار ہوا کہ چاروں طرف اس کے گلے کی دھوم مچ گئی۔

ایک بار کوئی ایسی محفل جمنے والی تھی جس میں بڑے بڑے باکمال استادانِ فن آنے والے تھے۔ یار دوستوں نے لڑکے کو چڑھایا کہ اگر اس محفل میں گا دے گا تو دنیا بھر میں ڈنکا بج جائے گا۔ شاگرد بھی اپنے فن کا کمال دکھانے کو بے تاب تھا۔ استاد کے پاس گیا اور گانے کی اجازت مانگی، ہاتھ پاؤں جوڑے اور بڑی منت سماجت کے بعد استاد نے پھر اس شرط پر گانے کی اجازت دی کہ وہ خود بھی محفل میں شریک ہوں گے۔ اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں شاگرد فوراً راضی ہوگیا۔ استاد اور شاگرد محفل میں گئے۔ شاگرد کی باری آئی تو استاد اس کے آگے فرش پر اپنا گمچھا بچھا کر بیٹھ گئے۔ گانے پر غلغلہ بلند ہوا اور لوگوں نے داد کے ڈونگرے برسائے، اسے استاد اپنے ہاتھوں سے یوں گوچتے تھے جیسے مداری سکّوں کو یا کرکٹ کا کھلاڑی گیند کو گوچتا ہے۔ گوچ کر اسے گمچھے میں ڈالتے تھے۔ گانے کے خاتمے پر انھوں نے گمچھے کی گٹھری باندھی اور اسے اپنی پیٹھ پر یوں لادا جیسے مزدور گیہوں کی بوری لادتا ہے۔ شاگرد کے پوچھنے پر انھوں نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ اس گٹھری میں اس کے فن کا صلہ بندھا ہے اور اب اس سے ضروریات زندگی پوری کی جائیں گی، آب و دانہ خریدا جائے گا، کپڑے سلوائے جائیں گے اور گھر بنایا جائے گا۔ پھر ڈانٹ کر کہا کہ اسی لیے محفل میں گانے سے منع کیا تھا۔ یہاں صرف فن کو داد ملتی ہے، فن کار کو روزی نہیں۔

دراصل اسی بے حسی نے بہت سے فن کاروں کو استاد چھجّو خاں کی روش پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بہت سے استادانِ فن ان حوصلہ شکن حالات کے باوصف کسب کمال میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں استاد بڑے آغا خاں کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ موسیقی کے پروفیسر اور میرس کالج کے پرنسپل تھے اور انھوں نے اس فن کو سماجی مرتبت دلانے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ انھوں نے ہی لکھنؤ میں گائکی کا چلن بھی عام کیا۔

طبلہ نوازی میں استاد عابد حسین کے لیے یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے وقت میں سارے ملک میں کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ اچھے اچھے رقاص اور موسیقاران کی سنگت سے گھبراتے تھے۔ ان کی گدی ان کے داماد واجد حسین کو ملی جن کے نام کا آج تک شہرہ ہے۔

استاد عابد حسین کا ایک قصہ بہت مشہور ہوا۔ ان کے زمانے میں کتھک کے ایک رقاص استاد بھورے خاں (راجستھان) کی سارے ہندستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، اچھے اچھے طبلہ نوازوں کو ان کا نام سن کر پسینہ آجاتا تھا۔ ایک بار وہ لکھنؤ آئے اور انھوں نے چیلنج کیا کہ جس کو اپنی طبلہ نوازی پر ناز ہو، وہ سامنے آئے اور جسے اپنی آبرو رکھنی ہو بہتر ہے طبلہ لے کر رخصت ہو جائے۔

محفل میں استاد عابد حسین موجود تھے اور جانتے تھے کہ بھورے خاں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے غرور نہیں بلکہ خود اعتمادی اور برسوں کا ریاض ہے لوگوں نے ان سے چیلنج قبول کرنے کے لیے کہا۔ واجد حسین اس وقت تک نوآموز تھے اور تعلیم سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔ استاد عابد حسین نے بھورے خاں سے دوست ہونے کے ناطے گزارش کی کہ پہلے وہ اس بچے کا دل بڑھانے کے لئے ایک چھوٹا سا موقع دیں تاکہ بچہ تازندگی اپنے نصیب پر ناز کر سکے کہ اسے بھورے خاں جیسے عظیم رقاص کے ساتھ سنگت کا موقع ملا تھا۔

بھورے خاں راضی ہو گئے۔ بچے کا دل رکھنے کے لیے انھوں نے دو چار توڑے پیش کر دیے۔ پھر استاد عابد حسین سے کہا:

"آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ اب آپ میدان میں آئیے۔"

استاد عابد حسین اس اثنا میں بھورے خاں کے توڑوں کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اسٹیج پر آئے اور اپنے طبلے پر ایک چکّر دار پرن بجائی اور کہا کہ "بھورے خاں کا سارا کمال رقص اس پرن کے دائرے میں اسیر ہے۔ اب وہ چاہے جہاں سے آغاز کریں، سم پر یہیں آئیں گے۔"

بھورے خاں نے انھیں گلے لگا لیا اور کہا کہ صرف اُن کا سا باکمال استاد اس ترکیب سے ان کے رقص کی حدوں کو بندی بنا سکتا تھا۔

ستار نوازی میں استاد مردت حسین خاں کی دھوم تھی۔ انھوں نے ستار ہی پر ٹھمری اور دادرے کے ایسے بول بنائے تھے جنھیں ہر گانے والا گاتا تھا۔ ان کی ایک مشہور ٹھمری کچھ یوں تھی:

"گھڑی پَل چھِن تو نے جادو ڈارا مورے پیا سنوری یاں"

پیا تخلص کرتے تھے اس لیے اپنے بنائے بولوں میں پیا کا لفظ ضرور لاتے تھے، رائے بریلی کے رہنے والے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے لکھنؤ جب بھی آتے تھے، صرف کسی مسجد ہی میں ٹھہرتے تھے۔

ایک بار کسی محفل میں پاس ہی ایک ہارمونیم والا بیٹھا تھا بات کرتے کرتے

اس کے ہارمونیم پر انگلیاں پھیرنے لگے۔ اس نے طنز سے کہا:
"اُستاد! یہ ستار نہیں ہارمونیم ہے، ہر کوئی نہیں بجا سکتا۔"
بس دل کو لگ گئی۔ خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا۔ چھت کے کنڈے سے بال باندھ کر، ہاتھ میں کڑا ڈال کر جو ہارمونیم کا ریاض شروع کیا تو چار سال اسی عالم میں گزار دیئے۔ چار سال بعد حال یہ ہوا کہ کثرتِ ریاض سے ہاتھ ٹیڑھا ہو گیا لیکن ہارمونیم غلام بن چکا تھا۔

ستار نوازی میں میرے استادِ محترم یوسف علی خاں صاحب کا نام ایک روایت کی حیثیت رکھتا تھا۔ سرود نوازی میں سخاوت حسین خاں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو فن کو دولت جوڑنے کا ذریعہ نہ بنا سکے۔ انہیں تو صرف یہ دُھن تھی کہ اپنے اپنے فن میں یوں ڈوب جائیں کہ "من تو شدی تو من شدم" کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

لکھنؤ کے ساتھ اگر بنارس اور رقص کا نام نہ لیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی، جہاں گائکی کے میدان میں سدھیشوری بائی اور رسولن بائی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ چوکھٹ چومے بغیر چھوڑی جا سکتی ہے کہ بیگم اختر فیض آبادی ان ہی کے لگائے چمن کا معطر پھول ہیں۔ رقص میں جادوگری کا درجہ پانے والا ایک گھرانہ تھا جس کے چشم و چراغ آج بھی زندہ ہیں۔ خدا انہیں لمبی عمر دے۔ یہ گھرانہ کالکا بندادین کا تھا۔ کتھک کا یہ گھرانہ اختر پیا کی اندر سبھا کا صحیح وارث بھی تھا اور اس نے خود کو اس تاجداری کا حقدار ثابت بھی کیا۔

ہندوستان میں رقص کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہندو روایات میں اس کا درجہ زمین نہیں آسمان ہے۔ بھارت ناٹیم، کتھا کلی، کچی پڑی اور منی پوری رقص دیوی دیوتاؤں کی پاکیزہ زندگی کا آئینہ ہیں۔ واجد علی شاہ نے کتھا کلی کو آسمان سے زمین پر اُتارا، اس کی پاکیزگی میں انسانی جذبات اور احساسات کا رس گھولا اور اس کا نام کتھک رکھا۔ کتھک دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستان میں اتنا مقبول ہوا کہ حد نہیں رہی۔ شاید وجہ یہ تھی کہ دیو مالاؤں میں دلِ انسان کی دھڑکنیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

اس روایت کو آگے بڑھایا کالکا بندادین کے گھرانہ نے۔ اسی گھرانے کی وجہ سے کتھک میں ٹھمری کے رنگ بھاؤ دکھانے کا چلن نکلا۔ کتھک کے میدان میں کالکا بندادین کا درجہ جگت گرو کا ہے۔

کاش آج کا لکھنؤ اس وراثت کو سنبھال سکتا۔

شامِ اودھ

شارب لکھنوی

اک بہارِ بے خزاں شامِ اودھ ہے آج بھی
جنّتِ ہندوستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

کل بھی اس کے تذکرے تھے انجمن در انجمن
داستاں در داستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

جانِ عالم کی کمی محسوس ہوتی ہے مگر
انجمن آرائے جہاں شامِ اودھ ہے آج بھی

حسنِ قیصر باغ کھنچ آیا ہے حضرت گنج میں
رنگ و نکہت میں رواں شامِ اودھ ہے آج بھی

کل بھی غنچے مسکراتے تھے سکندر باغ میں
گلستاں در گلستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

آج بھی بستے ہیں رومان گومتی کی گود میں
اہلِ دل کی رازداں شامِ اودھ ہے آج بھی

کہہ رہی ہے یہ شہیدانِ وفا کی یادگار
رہبرِ عزمِ جواں شامِ اودھ ہے آج بھی

ضوفشاں ہے آفتابِ جراتِ حضرت محل
صبحِ نو کی داستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

خون کا رشتہ ہے شیخ و برہمن کے درمیاں
ایسی بزمِ دوستاں شامِ اودھ ہے آج بھی

کل بھی دامن میں تھے اسکے عقل و دانش کے چراغ
علم و فن کی پاسباں شامِ اودھ ہے آج بھی

میہماں کل بھی ہوئے تھے میر جیسے باکمال
اہلِ فن کی میزباں شامِ اودھ ہے آج بھی

روشنی پھیلا رہی ہے شمعِ فیضانِ انیس
مرکزِ اہلِ زباں شامِ اودھ ہے آج بھی

کل بھی تھا شارب یہاں پیاسوں کو پاس میکدہ
عزتِ پیرِ مغاں شامِ اودھ ہے آج بھی

(پروفیسر) گیان چند
۹/۲۵، اندرانگر۔ لکھنؤ

داستانِ امیر حمزہ۔ لکھنؤ میں

داستانِ امیر حمزہ کی عظمت اس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ذہن میں داستان کا جو تصور ہے وہ قصۂ حمزہ ہی پر قائم ہے۔ یہ کسی ایک کتاب کا نام نہیں، یہ صنفِ داستان کی ایک نوع بزرگ ہے جس کے زیرِ سایہ متعدد شاہکار وجود میں آئے۔ اردو داستان گوئی اور داستان نویسی کی معراج داستان امیر حمزہ ہی ہے اور یہ بہت کچھ اودھ کے داستان نگاروں کی دین ہے۔ یہ داستانِ اعظم سب سے پہلے کلکتے میں اور پھر رام پور میں پھولی پھلی لیکن اس کے باغبان اودھ ہی کے فن کار تھے۔ اس کی دو مشہور شکلیں ہیں۔ ۱۔ داستانِ امیر حمزہ ایک جلد جو فارسی رموزِ حمزہ پر مبنی ہے۔ ۲۔ داستان امیر حمزہ کے آٹھ دفتر اور ان کی لاتناہی توسیعات۔ دونوں اپنے نشو و نما کے لیے اہلِ اودھ کے ممنونِ احسان ہیں۔

اردو میں داستانِ امیر حمزہ کی شہرت خلیل علی خاں اشک کے یک جلدی ترجمے سے ہوئی۔ اشک کی پرورش فیض آباد میں ہوئی تھی جہاں سے یہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں داستانِ امیر حمزہ کا فارسی سے ترجمہ کیا۔ اسی سے مماثل ترجمہ نواب مرزا امان علی خاں بہادر غالب لکھنوی کا ہے۔ اس کا سنِ تالیف ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء ہے۔ یہ اسی سال میں مطبع حکیم محتشم الیہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن نہایت نادر ہے لیکن یہ اصلاح شدہ شکل میں نولکشور پریس کے طفیل زندہ ہے۔ منشی نول کشور کے حکم سے مولوی سید محمد عبد اللہ بلگرامی نے غالب کے ترجمے پر نظرِ ثانی کی اور ۱۸۷۱ء میں شائع کیا۔ اصل میں انھوں نے کوئی خاص اصلاح و ترمیم نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نولکشور پریس نے سید عبد اللہ کا نام محض اس لیے ٹانک دیا کہ غالب کے ترجمے کو اپنا مال بنایا جا سکے۔

یہ جو مشہور ہے کہ نول کشوری ایڈیشن اشک کے نسخے پر مبنی ہے وہ صحیح نہیں۔ دراصل یہ غالب کے نسخے کا قالبِ نو ہے۔ ۱۸۸۷ء میں سید تصدق حسین مصححِ نول کشور پریس نے اس نسخے کو مرتب اور منقح کیا۔ بیسویں صدی میں عبد الباری آسی نے اس نسخے کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ آسی نے دو کام کیے: ۱۔ اشعار کو یک قلم خارج کر دیا، ۲۔ رنگین بیانی میں کہیں کہیں کچھ کمی کر دی۔ یہ ایڈیشن نول کشور پریس کے وارث تیج کمار بھارگو پریس نے شائع کیا۔

لیکن داستانِ امیر حمزہ کی دلداری اور دلربائی اس یک جلدی نسخے کے طفیل نہیں، یہ اس کے ہوشربائی دفتروں کی بدولت ہے۔ یہ دفتر پہلے رام پور میں اور پھر لکھنؤ میں لکھے گئے۔ رام پور کے دفتر غیر مطبوعہ رہے، رضا لائبریری میں دفن ہیں۔ عوام کی نظروں سے اوجھل ہیں یہ بھی زیادہ تر لکھنوی داستان گویوں کی تخلیق، لیکن اس داستان کو عوام کی ملک بنانے کا سہرا نول کشور پریس کو ہے۔ چونکہ تقدمِ زمانی رام پور کو حاصل ہے اس لیے وہاں کے لکھنوی فن کاروں کی نام شماری میں بخل نہ کروں گا۔

داستانِ امیر حمزہ کے سلسلے میں بڑا نام میر احمد علی کا ہے۔ یہ لکھنؤ کے مشہور داستان گو تھے جو رام پور چلے گئے۔ ان کی تصنیف سے سلسلۂ حمزہ کی دو کتابیں ملتی ہیں، ایک فارسی اور دوسری اردو۔ کہا جاتا ہے کہ طلسمِ ہوشربا میر احمد علی کی اختراع ہے لیکن ان کے قلم سے اس کا کوئی فارسی یا اردو نسخہ نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے انھوں نے اسے محض زبانی مجلس آرائی تک محدود رکھا ہو۔ لکھنؤ کے دوسرے بڑے داستان گو میر قاسم علی بھی رام پور میں ملازم تھے۔ انھوں نے اردو میں کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا۔ میر احمد علی کے شاگرد حکیم سید اصغر علی خاں نواب محمد سعید خاں (۱۸۴۰ء تا ۱۸۵۵ء) کے عہد میں لکھنؤ سے رام پور گئے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں حمزہ کے سلسلے کی کئی داستانیں لکھیں۔ کتنے عالم ہوں گے یہ داستان باف کہ فارسی میں بے تکلف لکھ سکتے تھے۔ انداز ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے

اواسط میں کافی قارئین فارسی میں لکھی داستان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ اصغر علی خاں کے بیٹے مشہور شاعر ضامن علی جلاؔل لکھنوی بھی رام پور میں بحیثیت داستان گو ملازم ہوئے جہاں انھوں نے والد کے ساتھ مل کر حمزہ کے دفتر بالا باختر کی کچھ جلدیں لکھیں۔

ایک پُرگو لکھنے والے منشی انبا پرشاد رسؔا لکھنوی تھے۔ یہ بھی نواب محمد سعید خاں کے عہد میں رام پور گئے۔ یہ بھی میر احمد علی کے شاگرد تھے۔ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا تھا۔ ان کے بیٹے غلام رضا ان سے بھی زیادہ کثیر التصانیف تھے۔ ایک اور داستان گو حیدر مرزا تصوّر لکھنوی داستان گوئی میں اصغر علی خاں کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۵ ضخیم جلدوں میں ایک داستان لکھی۔ دوسرے داستان گو حاجی علی ابن مرزا مکھو بیگ لکھنوی اور ان کے بیٹے سید حسین زیدی تھے۔ ایک اور فن کار مرتضیٰ حسین وصال لکھنوی تھے۔ ان سب کی معرکہ آرا تصانیف کے مخطوطے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ ان کی اشاعت کی کوئی امید نہیں۔

داستان گوئی کا مرکز داستانِ امیر حمزہ ہے اور داستانِ حمزہ کا وطنِ ثانی لکھنؤ ہے۔ رتن ناتھ سرشار اپنے سحر آفریں رنگ میں سماں باندھتے ہیں۔

"لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یارانِ صادق اور داستان موافق شب کے وقت کہ پردہ دار عاشقاں ہے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر ہاتھ تیز کر رہا ہے۔ جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنّے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصّہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب بہ لحنِ داؤدی زمار رہے ہیں، اور خوں خوار ظلماتی ......؛ ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرشِ بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

(تقریظ طلسمِ ہوشربا جلد ہفتم)

عشرت لکھنوی نے اپنے مضمون 'لکھنؤ کی داستان گوئی' میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اول مرزا طوؔر نے داستان گوئی میں اصلاح کی۔ ان کے بعد سب سے مشہور بڑے منشی میر فدا علی[1] تھے۔ مرزا طور اور میر فدا علی کی لکھی ہوئی کوئی داستان موجود نہیں جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ محض داستان گو تھے، داستان نگار نہیں۔ داستان نگاری کا شاہکار داستانِ حمزہ کا وہ لامتناہی طومار ہے جو نول کشور پریس میں معرضِ تحریر میں آیا۔ اس کی شروعات طلسمِ ہوشربا سے ہوئی اور بعد میں ماقبل اور مابعد کے دفتر لکھے گئے۔ اور ان کے بعد ان کی توسیعات جو اصل دفتروں سے بھی زیادہ فراواں تھیں۔ نول کشوری دفتروں کی تفصیل یہ ہے:

نام	جلد	مصنف	سنہ
۱۔ نوشیرواں نامہ	۲ جلد	مولفۂ شیخ تصدق حسین	۱۸۹۳ء
ہرمز نامہ	۱ جلد	"	۱۹۰۰ء
ہرمان نامہ	۱ جلد	احمد حسین قمر	۱۹۰۱ء
۲۔ کوچک باختر	۱ جلد	تصدق حسین	بعد ۱۸۹۲ء
۳۔ بالا باختر	۱ جلد	"	"
۴۔ ایرج نامہ	۲ جلد	"	"
۵۔ طلسم ہوشربا	جلد اول	محمد حسین جاہ	۱۸۸۱ء
"	" دوم	"	۱۸۸۴ء
"	" سوم	"	۱۸۸۸-۸۹ء/۱۳۰۶ھ
"	" چہارم	"	
"	جلد پنجم حصہ اول	احمد حسین قمر	۱۸۹۱ء
"	جلد پنجم حصہ دوم	"	
"	جلد ششم	"	۱۸۹۲ء
"	جلد ہفتم	"	۱۸۹۲ء یا اوائل ۱۸۹۳ء
۶۔ صندل نامہ	۱ جلد	محمد اسمٰعیل اثر	۱۸۹۵ء
۷۔ تورج نامہ	جلد اول	پیارے مرزا باعانت تصدق حسین	
"	جلد دوم	تصدق حسین بہ تصحیحِ اسمٰعیل اثر	
۸۔ لعل نامہ	۲ جلد	تصدق حسین	۱۸۹۶ء
آفتابِ شجاعت	۵ جلد	مصنفۂ تصدق حسین	۱۹۰۳-۰۸ء
گلستان باختر	جلد اول و دوم	تصدق حسین بہ تصحیح اسمٰعیل اثر	۱۹۰۶ء
"	جلد سوم	"	" طبع ۱۹۱۷ء
"	"	"	بعد وفاتِ مصنف

[1] خواجہ عشرت: لکھنؤ کی داستان گوئی۔ نگار مئی ۱۹۳۵ء

طلسمِ فتنۂ نور افشاں	۳ جلد	احمد حسین قمر	۱۸۹۶ء
بقیہ طلسم ہوشربا	۲ جلد	"	۱۸۹۷ء
طلسمِ ہفت پیکر	۳ جلد	"	۱۸۹۷ء
طلسمِ خیالِ سکندری	۳ جلد	"	۱۹۰۰ء
طلسمِ نوخیز جمشیدی	۳ جلد	"	۱۹۰۱ء
طلسمِ زعفران زارِ سلیمانی	۲ جلد	احمد حسین قمر و تصدق حسین	
"	"	" ترتیب : اسمٰعیل اثر	۱۹۰۵ء

طلسمِ ہوشربا جلد پنجم اور آفتابِ شجاعت' جلد پنجم دو حصّوں یعنی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اس طرح کُل ۴۶ جلدیں ہیں۔ مندرجہ بالا داستان نگاروں میں منشی محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر ممتاز ہیں۔ ان دونوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

محمد حسین جاہ لکھنوی

یہ بڑے منشی میر فدا علی کے شاگرد تھے اور چھوٹے منشی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں 'طلسمِ فصاحت' تصنیف کی لیکن یہ داستانِ حمزہ سے متعلق نہیں۔ اس کی اشاعت بھی ہوئی۔ جاہ کی شہرت مطبع نول کشور کی ملازمت سے ہوئی۔ منشی نول کشور نے انھیں 'طلسم ہوشربا' لکھنے پر مامور کیا۔ چار جلدیں لکھی تھیں کہ بقولِ عشرت معاوضے پر جھگڑا ہو گیا اور یہ منشی گلاب سنگھ لاہوری کے مطبع میں چلے آئے جو اس وقت لکھنؤ میں تھا۔ گلاب سنگھ نے ھوشربا کا ایک مختصر ٹکڑا شائع کیا لیکن نول کشور نے منشی احمد حسین قمر سے لکھا کر ھوشربا کی جلد پنجم شائع کر دی جس کے آگے گلاب سنگھ کے مطبع کا چراغ نہ جل سکا۔

(لکھنؤ کی داستان گوئی۔ نگار مئی ۱۹۳۵ء)

داستانِ امیر حمزہ کے تمام راویوں میں جاہ کا ادبی مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ وہ رنگین بیانی پر بھی قادر ہیں اور روزمرہ لکھنے پر بھی۔ اردو انشا پردازوں کے کسی انتخاب میں جاہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مُشتے نمونہ از خروارے۔ ملکہ بہار کا جادو۔ یہ اسلام کی طرف دار ہو گئی ہے۔ افراسیاب کی طرف سے شدید جادوگر آتا ہے:۔

" شدید کا پکارنا سُنا فوراً تخت بڑھایا اور ایک گلدستہ اٹھا کر جنگل کی طرف مارا کہ پہاڑوں کی جانب سے ایک ظلمت مثلِ شبِ دیجور پیدا ہوئی اور تاریکی تمام عالم میں چھا گئی۔ اس وقت بہار نے نقابہ کھول کر اپنی پیشانی پر افشاں اور چاند ٹیکی لگائی۔ اس وقت اس تاریکی میں ایک چاند اور ستارے چھٹکتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی رات ہے' دن نہ ظاہر ہوتا تھا۔ شدید دنگیں ردِ سحر پڑھ کر دینے لگا کہ بہار نے دوسرا گلدستہ مارا اور پکاری کہ اے بہار آؤ۔ جھونکے ہوائے سرد کے آنے لگے اور لشکرِ شدید کے ساحر تالیاں بجانے لگے کہ بہار نے تیسرا گلدستہ مارا۔ ہزارہا عورت' نازنین مہ جبین ہاتھوں میں ساز اور باجے لیے پیدا ہوئیں ... انھوں نے ساز اپنے اپنے نہایت خوش آہنگی سے بجائے کہ لشکرِ حریف ان پر دونوں پر عاشق ہوا کہ بہار نے چوتھا گلدستہ مارا کہ آنکھیں اہلِ لشکر کی بند ہوئیں اور موسم بہار کا ظاہر ہوا۔ عجب لطف تھا کہ شبِ ماہ میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی اور باغ و چمنستاں دُور تک دکھائی دیتے تھے۔ نسیم مشک بار ہر بینائے شجر سے ٹکراتی تھی' غنچے چٹک کر جماہی لیتے تھے۔"

افسوس صفحات کا دامن تنگ ہے' میں دوسرے گوناگوں اسالیب کے نمونے نہیں دے سکتا۔

منشی احمد حسین قمر لکھنوی

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں قمر کے دو بھائی کام آئے۔ ذریعۂ معاش کے طور پر قمر نے وکالت کی سند حاصل کرنا چاہی لیکن اس میں ناکام رہنے پر داستان گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔ قمر بہت زود نویس تھے اور سحر اور رزم لکھنے پر خاص طور سے قادر تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے ھوشربا جلد پنجم کے دو حصّے نیز جلد ششم اور جلد ہفتم لکھیں۔ اس کے بعد ایک طرف تو انھوں نے بقیہ طلسم ہوشربا کی دو جلدیں تصنیف کیں جن میں ھوشربا سے قبل کا کچھ حصّہ ہے اور کچھ طلسم ھوشربا کی جلدوں سے متوازی چلتا ہے' دوسری طرف انھوں نے ہوشربا کا سلسلہ اپنے طور پر آگے بڑھایا۔ مروّجہ دفاتر میں ھوشربا کے بعد صندل نامہ ہے لیکن قمر ہوشربا کی جلد ہفتم کے سلسلے میں بالترتیب طلسمِ فتنہ' نور افشاں' طلسمِ ہفت پیکر' طلسمِ خیال سکندری اور طلسمِ نوخیز جمشیدی کے بعد' زعفران زارِ سلیمانی' لکھ رہے تھے کہ ۱۹۰۹ء میں اجل نے آدبوچا۔ تصدق حسین نے اس دفتر کی تکمیل

کی۔ ۱۹۰۱ء میں قمر نے ھنومان نامہ بھی شائع کیا۔ یہ نوشیرواں نامہ کی جلد دوم سے متعلق ہے لیکن دراصل بیچ میں ایک حشو ہے۔ اس میں کچھ بیان ھرمز نامے سے بھی مشترک ہے۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے طلسم تاریخ بھی تصنیف کیا۔ یہ نوشیرواں نامہ کے ایک جزو سے مشترک ہے۔

نائب حسین نقوی کے مطابق قمر بھی اچھے ادیب ہیں گو جاہ کے مرتبے کے نہیں۔ ان کی تحریر کے نمونے کے طور پر شہنشاہ طلسم ہوشربا افراسیاب جادو کے قتل کا منظر ملاحظہ ہو:

"لوح کا عکس پڑا۔ تیغۂ نورافشانی چمک کر گرا۔ سپر سحر کے پُرزے اڑ گئے۔ شب سپر کٹی۔ تیغۂ نورافشانی مثل ہلال شب اول چمکا۔ سپر کو کاٹ کر، تیغ نے تاجِ فرودِ افراسیاب کو کاٹا۔ سراسر وہ سر دو نیم ہوا جس میں نخوت کا مقام تھا، اپنے غرور سے ناکام تھا۔ تا جگرگاہ تیغۂ نورافشانی پہنچا۔ افراسیاب آہ کا نعرہ کر کے گرا۔ اس وقت کی کیا کیفیت تحریر کروں۔ ایک غبارِ سیاہ بلند ہوا۔ ہزارہا طائر نخلستان سے اڑے۔ طاؤس پروں سے سر پٹینے لگے۔ صدہا مکان گرے۔ دریا کھول کر خشک ہوئے۔ چشموں کا پانی اُبلا۔ منزلوں تک تاثیر قتلِ افراسیاب پہنچی۔ بعد عرصۂ دراز آئی

کُشتی مرا نام من افراسیاب جادو شہنشاہِ طلسم ہوشربا بود، افسوس
مُردیم و جاں دادیم و مطلبِ خود نہ رسیدیم"

شیخ تصدق حسین

عشرت نے لکھا ہے کہ شیخ تصدق حسین جاہل تھے اور کاتبوں سے لکھاتے تھے (نگار مئی ۱۹۳۵ء) پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بھی اس کی تائید کی۔ واضح ہو کہ نول کشور پریس سے متعلق شیخ تصدق حسین اور سید تصدق حسین دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ ھرمز نامے کی تمہید میں خود شیخ تصدق حسین نے مطبع نول کشور کے نامی حضرات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں منجملہ دوسرے حضرات کے سید تصدق حسین مصحح کا نام بھی شامل ہے۔ سید تصدق حسین نے داستان امیر حمزہ مولفۂ سید عبداللہ بلگرامی کی زبان پر ضرور نظر ثانی کی۔ اس کے علاوہ انھیں داستان نگاری سے کوئی سروکار نہیں۔

ھوشربا کی تکمیل کے بعد تصدق حسین کی قلم کاری کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے اول نوشیرواں نامہ، ۲ جلد، کوچک باختر، بالا باختر، اور ایرج نامہ ۲ جلد لکھے۔ اس کے بعد منشی پیارے مرزا کو ساتویں دفتر 'تورج نامے' کی جلد اول کی تالیف میں مدد دی۔ 'تورج نامے' کی جلد دوم خود انھیں کے قلم کا کارنامہ ہے۔ آٹھواں دفتر لعل نامہ بھی تصدق حسین ہی نے لکھا۔ لعل نامے سے فارغ ہو کر ۱۹۰۰ء میں انھوں نے ہرمز نامہ لکھا جو نوشیرواں نامہ جلد دوم سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لعل نامے کے قصے کو آگے بڑھاتے ہوئے آفتابِ شجاعت کی پانچ جلدیں تصنیف کیں۔ اس دفتر کی پانچویں جلد دو ضخیم جلدوں میں ہے یعنی یہ دفتر دراصل چھے جلدوں پر مشتمل ہے۔

آفتابِ شجاعت کی جلد چہارم میں تصدق حسین لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرشید عبدالعزیز رعنا لاہوری معتمد ریاست بھاول پور کی وساطت سے انھوں نے نواب بھاول پور کی ملازمت کی۔ چنانچہ جلد چہارم نواب بھاول پور کے حکم پر باستعانتِ منشی اسمٰعیل اثر تصنیف کی۔ جلد پنجم کے دونوں حصّوں کا دیباچہ اور خاتمہ عبدالعزیز کا لکھا ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت سے مُراد کسی قسم کا وظیفہ ہے جو تصدق حسین نے لکھنؤ بیٹھے بیٹھے حاصل کیا کیونکہ وہ آخر دم تک نول کشور پریس سے وابستہ رہے۔

'آفتابِ شجاعت' کی تکمیل کے بعد تصدق حسین نے پھر کام مانگا جس پر منشی پراگ نرائن نے قمر کے تحریر کردہ 'زعفران زار سلیمانی' کے قریب ساٹھ جزو مکمل کرنے کے لیے دیے۔ انھوں نے محمد اسمٰعیل آثر کی مدد سے دو جلدوں میں داستان ختم کی جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے 'آفتابِ شجاعت' کے سلسلے میں 'گلستانِ باختر' تصنیف کی۔ اس کی دو جلدیں ۱۹۰۹ء تک شائع ہوگئیں۔ تیسری جلد ان کی وفات کے بعد پہلی بار مارچ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ جلد سوم میں بدیع الملک صاحب قرانِ ثالث کے بعد عادلِ کیواں شکوہ صاحبقرانِ رابع ظاہر ہوتے ہیں۔

امیر حسن نورانی نے تصدق حسین کی دو اور داستانوں کا ذکر کیا ہے جن کے مخطوطے نول کشور پریس کے محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔ پہلی داستان 'چرخِ گردوں' ہے جو ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری داستان 'انیس دلربا' تین جلدوں میں دو ہزار صفحات کو محیط ہے۔ یہ رومانی داستان قصۂ حمزہ سے متعلق نہیں۔ (امیر حسن نورانی: 'غیر مطبوعہ نثری داستانیں' ھماری زبان ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء)

حالانکہ تصدق حسین بے پڑھے لکھے تھے لیکن یہ بھی داستان گو خوب نباہ گئے ہیں۔ جاہ اور قمر کے رنگ سے بے میل نہیں ہونے پاتے۔ کیا ذیل کی عبارت کا مصنف ناخواندہ ہو سکتا ہے؟

"ہر درخت بوقلموں فیضِ ہوا سے سرسبز ہے، ہرا ہے۔ ایک ایک شاخ اتنی اونچی ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ ادھر بیخ میں گاؤزمین تک پہنچتی ہے۔ آیۂ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء، انھیں اشجار کی شان میں ہے۔ معلوم نہیں درختِ طوبیٰ کس گمان میں ہے۔ میوے تر و تازہ لگے ہیں کہ فقط جن کے خیالوں سے زبانوں پر مزے ہیں اور ان کے نوش کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ کھانے والے کو حیاتِ ابدی ملتی ہے مرنے سے ہاتھ دھوتا ہے..... ہزارے کے فوارے چھوٹتے ہیں گویا موتیوں کا مینھ برس رہا ہے، دیکھنے والے مزے لوٹتے ہیں۔"

محمد اسمٰعیل اثر

انھوں نے صندل نامہ سحر برکیا اور زعفران زار سلیمانی اور گلستانِ باختر کی ترتیب میں تصدق حسین کی مدد کی۔

پیارے مرزا

یہ مرزا محسن علی خاں عرف آغا جو ہندی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تصدق حسین کی مدد سے تورج نامے کی جلد اول لکھی۔ ان کا خاص کارنامہ بوستانِ خیال کے لکھنوی ترجمے کی ترتیب ہے۔

مرزا رضا علی

یہ احمد حسین قمر کے شاگرد تھے۔ انھوں نے 'آفتاب شجاعت' جلد چہارم کے سلسلے میں 'صولت الضیغم' معروف بہ داستانِ اسد ثانی لکھی۔ کتاب کی تصنیف لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی لیکن طبعِ اول لاہور میں ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔

محمد امیر خاں

جاہ و قمر کے ہم عصر ایک داستان گو محمد امیر خاں تھے۔ بقول عشرت انھیں عیاری لکھنے پر ناز تھا چنانچہ داستانوں میں عمرو کی عیاریاں انھیں کے بیانات کا چہرہ ہیں۔ یہ نول کشور کے یہاں نہیں گئے۔ ان کے رام پور جانے کا بھی پتا نہیں چلتا لیکن ان کی تصنیف سے ایک مخطوطہ طلسم ہوشربا جلد دوم رام پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

رضا لائبریری رام پور کی طرح نول کشور پریس لکھنؤ میں بھی داستانوں کے متعدد مخطوطے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض کرم خوردہ ہو کر ضائع ہو گئے ہیں لیکن کچھ مصنفین کے کارنامے ابھی تک محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل امیر حسن نورانی نے ہماری زبان کے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء کے بعض شماروں میں دی۔ انھیں سے استفادہ کرتے ہوئے محض نام شماری پر اکتفا کی جاتی ہے۔

انور حسین آرزو لکھنوی

انھوں نے 'داستان جوہر' لکھی۔ اس کے مخطوطے میں ۸۰۰ صفحات ہیں۔

سید میرن آبرو رضوی لکھنوی

انھوں نے ایک داستان 'طلسم تخت الارض' نواب بھاول پور کو پیش کی ان کے یہاں سے طباعت کی غرض سے یہ داستان نول کشور پریس میں پہنچی۔ آبرو نے اپنی دوسری داستانیں بھی نول کشور پریس کو دیں لیکن کسی نے اشاعت کا منھ نہ دیکھا۔ تفصیل یہ ہے:

۱۔ داستان معرکہ آرا۔ (فارسی) پچاس پچاس جزو کی ۲ جلدیں۔ اس کا سلسلہ 'لعل نامہ' دفتر ہشتم امیر حمزہ سے ملتا ہے۔
۲۔ اقبال نامۂ غضنفری۔ پچاس پچاس جزو کی ۴ جلدیں۔ بسلسلۂ داستان معرکہ آرا
۳۔ توزک صاحب قرانی۔ پچاس پچاس جزو کی ۴ جلدیں بسلسلۂ اقبال نامۂ غضنفری۔
۴۔ طلسم دار الجنون ۲ جلدیں۔ اس کا سلسلہ بھی اقبال نامۂ غضنفری سے ملتا ہے۔ اس میں عیاریاں اور سحر بہت حیرت انگیز ہیں۔
۵۔ طلسم آفت خیز۔ ۴ جلد۔ یہ توزکِ صاحب قرانی سے متعلق ہے۔ مصنف کے مطابق یہ ہوشربا سے زیادہ دلچسپ ہے۔
۶۔ طلسم کرشمہ گاہ جمشیدی۔ ۴ جلد۔ یہ بھی توزکِ قرانی سے متعلق ہے۔ بقولِ مصنف یہ داستان اکبرثانی نے فارسی میں تصنیف کرائی تھی۔
۷۔ طلسم تخت الارض۔ ۳ جلد، بہ سلسلۂ طلسم زعفران زار سلیمانی۔ از تصدق حسین۔
۸۔ طلسم بزم آرائے سامری ۲ جلد۔ بہ سلسلۂ تخت الارض۔
۹۔ طلسم انجم آرائے جمشیدی۔ ۲ جلد۔ بہ سلسلۂ تخت الارض۔
۱۰۔ طلسم نہہ ملک ۱۰ جلد۔ بہ سلسلۂ تخت الارض
۱۱۔ دفتر اختتام داستان ۴ جلد۔ اس میں خاندانِ صاحب قراں کے خاتمے کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق امیر حمزہ کے بارھویں دفتر (یعنی دراصل ۹) سے ہے۔

(باقی صـ۳۴ پر)

عشرت علی صدیقی
۱۸۳ - زنبور خانہ ۔ کینٹ روڈ
لکھنؤ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اودھ کا محاذ

جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر حملہ اور قبضہ کر لیتا ہے تو محکوم قوم محکومی کی زنجیریں توڑنے کی کوششیں کرتی ہے۔ اس کوشش اور بدیسی حکومت کے استحصال میں قریبی تعلق اور براہِ راست تناسب ہوتا ہے۔ یہ کوشش کامیاب ہو کر انقلاب بن جاتی ہے اور ناکامی کی صورت میں غدر کہلاتی ہے۔ اسی بنا پر ہندستان کی پہلی بڑی جنگِ آزادی کو انگریزوں اور ان کے کاسہ لیسوں نے جان بوجھ کر اور دوسرے لوگوں نے بے سوچے سمجھے "غدر" کہا ہے۔ چونکہ اس لڑائی میں انگریز کامیاب ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے اور ان کی خوشامد میں بعض ہندستانیوں نے بھی آزادی کے اس جہاد اور اس میں حصہ لینے والے مجاہدوں کے بارے میں حقائق کو چھپایا اور مسخ کر کے پیش کیا۔

اودھ کے علاقے میں آزادی کی لڑائی ملک کے دوسرے زیادہ تر علاقوں سے زیادہ دیر تک چلی ــــ دہلی کے سقوط کے ۶ مہینے بعد تک! اس علاقے کی زرخیزی اور مردم خیزی کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں جائز و ناجائز فرزندوں نے اس کو زیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ہر طرح کی چالیں چلیں، بدترین قسم کے ظلم کیے، جھوٹ بولنے کی انتہا کر دی لیکن جادو ایک مرحلے پر سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور سچ جھوٹ کے ملبے سے ہمیشہ ڈھکا نہیں رہ سکتا۔

ظاہرا اسباب

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے جو اسباب عام طور پر بتائے اور سمجھے جاتے ہیں وہ پوری حقیقت بیان نہیں کرتے۔ ان اسباب کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب تھے جو زیادہ گہرے اور زیادہ بڑے تھے۔ اگر اصل سبب کارتوسوں کے اندر کی چربی ہوتی تو گورنر جنرل کی طرف سے ان کارتوسوں کے استعمال کی ممانعت ہو جانے پر بغاوت سے بہت پہلے ہی یہ سبب دور ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ معاملہ صرف سپاہیوں سے متعلق تھا۔ اور فوجی اور غیر فوجی افسر، اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے لیڈر تو قابلِ اعتراض کارتوس استعمال نہیں کر رہے تھے نہ ہندستانی زمینداروں اور تعلقداروں اور رجواڑوں کے جو لشکر مجاہدین سے آملے ان سے چربی لگے کارتوس استعمال کرنے کو کہا گیا تھا۔ جو ہندو و مسلم زمیندار اس جہاد میں شریک ہو گئے ان سب کو زمین کے نئے بندوبست میں نقصان نہیں ہوا تھا بلکہ بعض کو فائدہ ہی پہنچا تھا لیکن اس فائدے کے باوجود وہ نیا بندوبست لانے والی حکومت کو ختم کر دینے کے درپے ہو گئے۔ اودھ اور دوسرے علاقوں میں جن ہندستانی حکمرانوں سے حکومت کے اختیارات چھین لئے گئے ان کی بابت کہا گیا کہ وہ اپنی عیش پرستی کی وجہ سے نظم و نسق پر ٹھیک سے توجہ نہیں کر پا رہے تھے اور ان کی رعایا ان سے بیزار ہو چکی تھی۔ لیکن رعایا کے رویے سے ثابت ہو گیا کہ وہ ہندستانی حکمرانوں سے نہیں بلکہ انگریزی حکومت سے بیزار تھی۔

اصل مقصد

اس معاملے میں کمپنی اور اس کے کاسہ لیسوں نے اودھ کے حکمرانوں کو سب سے زیادہ بدنام اور مطعون کیا ہے ــــ خاص کر آخری تاجدار واجد علی شاہ کو۔ لیکن جب جانِ عالم جلا وطنی کے سفر پر روانہ ہوئے تو لکھنؤ کے عوام اُن پر عقیدت اور وفاداری کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ جُدائی کا سوگ منا رہے تھے۔ ان کی واپسی کے لیے مندروں مسجدوں میں دعائیں کر رہے تھے اس طرح عوام کی بیزاری والے جھوٹ کا پول کھُل گیا۔ اور جہاں تک نظم و نسق کی خرابی کا تعلق ہے اس کی ذمّہ داری شاہ سے زیادہ ان کو دبانے اور کنٹرول کرنے والے کمپنی بہادر کے افسروں پر ہے۔ جنہوں نے شاہ پر دباؤ ڈال کر انہیں راہ راست سے ہٹا دیا۔ اس چالبازی کی ایک مثال یہ ہے کہ واجد علی شاہ اپنی تخت نشینی کے بعد روزانہ شاہی افواج کی پریڈ کا معائنہ کرنے خود جنرل کی وردی پہن کر جاتے تھے اور نہ صرف دیر سے آنے والی پلٹن کو بلکہ خود دیر سے آنے والے حکمراں کو بھی دو ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ گورنر جنرل کی ایما سے

انگریز ریذیڈنٹ نے شاہ کو پریڈ میں جانے سے منع کر دیا۔

دراصل انگریز چونکہ ہندستان کی دولت لوٹنے کے لیے اس پر اپنی حکومت جمانا چاہتے تھے اس لیے وہ یہاں کی مرکزی اور علاقائی حکومتوں کو طاقتور بننے اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے سے روک رہے تھے۔ ہندستان ان کے نزدیک سونے کی چڑیا تھا دہلی اس چڑیا کی کلغی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اودھ اس کے جسم کا سب سے اہم حصّہ گویا دل تھا۔ اس لیے اس کو کمزور اور اپنی گرفت میں رکھنے کی خاص فکر تھی۔ چنانچہ یہاں کے نوابوں کو اپنی طاقت بڑھانے سے یہ کہہ کر روکا گیا کہ انگریزی فوج ان کا دفاع زیادہ اچھی طرح کرے گی وہ اپنی فوج پر خرچ بڑھانے کے بجائے انگریزی فوج کا خرچ برداشت کریں۔ حکومت کی مشینری میں کمپنی نے اپنے آدمی کلیدی جگہوں پر بٹھا دیے اور مختلف بہانوں سے بدیسی حکومت دیسی حکمرانوں پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنے لگی۔ چکنی چپڑی باتیں بنا کر انھیں اپنے اختیارات سے دستبردار ہونے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی پھر وراثت اور جانشینی کے معاملات میں مداخلت کی گئی تاکہ اپنے آدمی کو تخت نشین کرا دیا جائے۔ جب کمپنی کے افسران اور عملداروں کی بھوک زیادہ بڑھی تو انہوں نے حکمراں کی معزولی، سلطنت کے انتزاع اور براہ راست قبضے کا طریقہ اختیار کیا ۱۸۵۷ء کا انقلاب اسی شرارت کو روکنے کی ایک بڑی کوشش کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کوشش کا اصل مقصد بدیسی راج سے چھٹکارا پانا تھا۔

ریہرسل

یہ شرارت ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں بہت نمایاں ہو گئی تھی اور اسکی کاٹ کی تیاری بھی تبھی سے شروع ہو گئی تھی پونا کے نانا فرنویس اور میسور کے حیدر علی نے انگریزوں کی شرارت سے ہندستان کو لاحق خطرات محسوس کر لیے تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی شرارت کی کاٹ پر غور کیا جا رہا تھا۔ ویلور کی ۱۸۰۶ء والی بغاوت جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر برپا کی تھی ۱۸۵۷ء کے لیے ایک ریہرسل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اودھ پر ان کے حالات کا اثر پڑ رہا تھا۔ ملک کے دوسرے حصّوں کی طرح یہاں بھی جنگ کا بگل بجنے سے پہلے ہی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ یہ تیاری دربار کی سطح پر نہیں بلکہ عوام کی سطح پر کی جا رہی تھی۔ پنڈت اور مولوی دھرم یدھ اور جہاد کے لیے پرچار اور تلقین کر رہے تھے۔ عوام کی ذہنی تربیت میں نانا صاحب اور مولوی احمد اللہ شاہ بھی مصروف تھے۔ احمد اللہ شاہ کا خاندان گوپامئو ضلع ہردوئی کا تھا مگر ان کے پردادا دکن شاہی ملازمت پر چلے گئے تھے ان کے دادا والیِ کرناٹک پایاں گھاٹ تھے۔ ان کے والد بھی اسی عہدے پر فائز رہے مگر احمد اللہ نے اپنے لیے وسیع تر میدان مشکل تر کام اور بلند تر مقام کا انتخاب کیا۔ ترکِ وطن کر کے حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں سے انگلستان گئے جہاں کی حکومت ان کو آلہ کار بنانا چاہتی تھی مگر احمد اللہ شاہ اس جال میں نہیں پھنسے۔ وہ مدراس میں ایسٹ کمپنی کی ریشہ دوانیاں دیکھ کر پہلے ہی ہوشیار ہو گئے تھے۔ کوئی ترغیب کارگر نہیں ہوئی اور وہ حج و زیارت کے لیے حجاز عراق اور ایران کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہاں سے درویشی کا طریقہ اور جہاد کا جذبہ لے کر واپس آئے۔

پُراسرار شخصیت

ہندستان کے مختلف مقامات میں گھوم کر انہوں نے مذہبی بزرگوں عالموں اور صوفیوں کی صحبت میں خاصا وقت گزارا، دنیاوی اور روحانی معاملات کا درس حاصل کیا۔ عبادت اور ریاضت میں انہماک دکھایا۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومے۔ صاحبِ کشف کرامات بنے۔ پیر روشن ضمیر محراب شاہ نے خلافت عطا کی اور جہاد کی تلقین کی۔ وہ مولوی سے مدبّر اور مدبّر سے فن جنگ کے ماہر بن گئے۔ جہاد کا پہلا مرکز آگرہ بنا۔ وہاں جمعیۃ العلماء قائم کی جلسوں میں جہاد کا چرچا ہوتا اور ہندو اور مسلمان جہادِ آزادی میں شرکت کا عہد کرتے۔ انگریز حاکم مخبروں سے خبر پا کر پریشان ہو گئے مگر براہ راست گفتگو کے بعد کوئی مزید کارروائی نہیں کی۔ اور احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کیا۔ مستقر بدل گیا مگر گفتگو کا موضوع اور وعظ و تلقین کا انداز نہیں بدلا۔ حکام پریشان ہوئے گھر پر پہرہ بٹھا دیا گیا، عقیدت مندوں اور حق کے متلاشیوں کی حاضری گھٹ گئی۔ کوتوال کو حکام نے ڈرایا دھمکایا اس نے شہر سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔

یہی کچھ فیض آباد میں بھی ہوا جو احمد اللہ شاہ کا اگلا پڑاؤ بنا۔ جہاں سرائے چوک میں قیام ہوا اور جہاد کا پہلا معرکہ وقوع پذیر ہوا۔ یہ معاملہ فروری مارچ ۱۸۵۶ء کا ہے جب انتزاع سلطنت ہو چکا تھا اور فیض آباد پر انگریزوں کی گرفت لکھنؤ سے زیادہ سخت تھی۔ احمد اللہ شاہ اس گرفت کو توڑنے کے لیے لوگوں کو اکساتے تھے۔ ان کے ہمراہی ہتھیار بند رہتے تھے۔ انگریز کمشنر نے اسکی اطلاع پا کر انھیں پوچھ گچھ کے لیے بُلایا۔ انہوں نے جانے سے انکار کیا۔ کمشنر نے خود آ کر گفتگو کی۔ ہتھیار حوالے کرنے کے لیے حکام نے بہلایا پھسلایا اور ڈرایا دھمکایا۔

آخر میں فوج طلب کر لی۔ مقابلے میں کئی مجاہد اور ان کے رہنما احمد اللہ شاہ زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ فوجی اسپتال میں داخل کیے گئے اور زخموں کو مندمل ہونے پر جیل بھیج دیے گئے۔ مقدمہ چلا۔ پھانسی کا حکم ہوا فیض آباد کے ہندو مسلم باشندوں کے تشویش نے طیش کی شکل اختیار کر لی۔ انگریزی حکومت کی ہندستانی فوج بھی باغی ہو گئی۔ جیل خانے کا پھاٹک توڑ کر احمد اللہ شاہ کو آزاد کرا لیا گیا۔ انہوں نے انگریزی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد شہر کا انتظام راجہ مان سنگھ کو سونپ دیا اور خود لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ احمد اللہ شاہ کی طرح مان سنگھ بھی قریہ قریہ گھوم کر عوام کو آزادی کی لڑائی میں شرکت کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔ اور احمد اللہ شاہ کی طرف سے ان کو فیض آباد کی حکومت سونپ دیا جانا دونوں لیڈروں کے مقصد کی یکسانگی اور قریبی تعاون کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اودھ کے چیف کمشنر سر ہنری لارنس مجاہدین میں انتشار پھیلانے کے لیے جھوٹ داستانیں بیان کر کے اور مذہبی تعصب ابھار کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلانے کی جو کوشش کر رہے تھے وہ تمامتر شرارت پر مبنی تھی۔

برہم ورت کے حکمراں ناناصاحب کے ساتھ بھی احمد اللہ شاہ کا قریبی تعاون اس وقت تک قائم رہا جب تک احمد اللہ شاہ کو پوایاں ضلع شاہجہاں پور کے راجا جگناتھ سنگھ اور ان کے بھائی کنور بلدیو سنگھ نے ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء کو دھوکے سے شہید نہیں کر دیا۔ ان دونوں نے ملک و قوم کے ساتھ یہ غداری بدیسی حکومت سے پچاس ہزار روپیہ انعام حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ اس دغابازی سے پہلے راجہ جگناتھ سنگھ احمد اللہ شاہ کی دوستی کا دم بھرتا تھا اس لیے انہوں نے اس سے جنگ آزادی میں تعاون چاہا تھا۔ جس سلسلے میں راجا نے انھیں گفتگو کے لیے بلایا تھا۔ حالانکہ احمد اللہ شاہ کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۲۰ر مارچ ۱۸۵۸ء کو محمدی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ تاہم تاریخ میں تذکرہ بھی موجود ہے کہ احمد اللہ شاہ نے تعاون کے لیے بیگم حضرت محل کی مہر لگا کر بھیجا تھا جو واجد علی شاہ کی اہلیہ اور ان کے جانشین برجیس قدر کی ماں اور ولی تھیں۔

خفیہ تحریکیں اور تنظیمیں

اودھ کے نظام حکومت میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کی ملک بدری کا بندوبست کر کے جو تبدیلی کی تھی اس کی وجہ سے عوام کے مزاج میں بھی تیزی سے تبدیلی آ گئی۔ درحقیقت کمپنی بہادر کی حرکتوں کی وجہ سے تمام ہندستانیوں کی قومی خودداری کو ٹھیس لگی تھی۔ انقلاب کے اسباب، حالات اور آثار ملک کے کئی حصوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ خفیہ تنظیمیں قائم ہو گئی تھیں کبھی چپاتی کے ٹکڑے تبرک اور پرشاد کی شکل میں تقسیم کیے جاتے اور انقلاب کی تیاری کی علامت بن جاتے اور کبھی سرخ کنول گشت کرایا جاتا جسے سونگھ کر لوگ انقلاب کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ان تیاریوں سے انگریزی حکومت بے خبر رہی۔ اس کے ہندستانی ملازم بھی انقلاب کے منصوبے میں شریک تھے لیکن ظاہر میں وہ حکومت کے وفادار تھے۔ خفیہ تنظیموں کے تال میل سے انقلاب کے آغاز کے لیے ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ لیکن کچھ تو حکومت کی غیر معمولی سختی کچھ عوام کے غیر معمولی جوش اشتعال اور غصے اور کچھ تنظیم کے ڈھیلے پن کی وجہ سے بعض مقامات پر بزن کا بگل بیس روز پہلے ہی بجا دیا گیا اور میرٹھ بریلی وغیرہ کے مجاہدین اپنے وہاں انگریزوں اور ان کی حکومت کا صفایا کر کے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے استحکام اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے دہلی کی طرف چل پڑے۔

اودھ کی خفیہ انجمن نے جس کا مستقر لکھنؤ میں تھا ۳۱ر مئی کی تاریخ منظور کر لی تھی۔ اور اگرچہ فیض آباد میں مولوی کے ہمراہیوں اور کمپنی کے ملازموں میں جھڑپ پہلے ہی ہو گئی تھی مگر انقلاب کے آغاز کی توپ لکھنؤ میں ۳۰ر اور ۳۱ر کی درمیانی رات کو ۹ بجے داغی گئی۔ اور سڑکوں پر کچھ لوٹ پھونک بھی ہوئی ۳۱ر مئی کو چیف کمشنر ہنری لارنس فوج لے کر انقلابیوں کو کچلنے کے لیے آگے بڑھے مگر ان کے ساتھ کی ہندستانی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قلعبند ریزیڈنسی میں واپس چلے گئے۔ بغاوت کی آگ تیزی سے پھیلی ۵۱ میل دور سیتاپور میں ۶ر مئی کو کچھ انگریزوں کے گھر جلا دیے گئے۔ ۲ر جون کو کچھ فوجیوں نے شکایت کی کہ انھیں جو آٹا ملا ہے اس میں ہڈیوں کا سفوف ہے۔ حکام نے یہ سارا آٹا گنگا میں پھنکوا دیا۔ لیکن اگلے روز انقلابیوں نے سرکاری خزانے پر قبضہ کر لیا اور کچھ انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ سیتاپور کے بعد انقلاب کی آگ نے فرخ آباد، میلانی، محمدی، شاہجہاں پور، بہرائچ، گونڈہ، فیض آباد، سلطان پور اور سلونی وغیرہ میں انگریزی راج کو بھسم کر دیا۔ کانپور، جھانسی اور روہیل کھنڈ میں بھی انقلابیوں نے ایسی ہی آگ بھڑکائی اور اس کی گرمی انگریزی حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔

انقلاب کی شدت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ عوام انگریزوں کے ہاتھوں

اپنے حکمراں کی ذلت برافروختہ تھے۔ جاگیرداری سماج میں جاگیرداروں، زمینداروں اور بادشاہ کے ساتھ عوام کی وابستگی بہت گہری ہوتی ہے۔ انگریزی راج نے ہندستانی امرا کو ذلیل کرنے کے علاوہ لوٹا کھسوٹا تھا اور ہندستانی صنعت و حرفت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ شاہی فوج کی تخفیف نے بہت سے فوجیوں کو بے روزگار کر دیا تھا۔ انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہی زیادہ تر اودھ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ مادر وطن کی تذلیل ان کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔ اور ان کے دماغ جہاد کی تلقین اور دھرم یدھ کی باتوں اور "چپاتی" اور "سُرخ کنول" جیسی تحریکوں سے بہ آسانی متاثر ہوگئے۔

کانپور کا مورچہ

۳۰ اور ۳۱ مئی کی درمیانی رات میں انقلاب کی ہراولی توپ دغنے کے بعد صوبے بھر میں انقلابیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں۔ ۱۰ جون تک قریب قریب پورا صوبہ آزاد کرا لیا گیا۔ صرف لکھنؤ سے انگریزوں کو نکالنا باقی رہ گیا تھا۔ کانپور کے محاصرے کو لکھنؤ کے معرکوں کی تمہید کہا جا سکتا ہے۔ اس مورچے کی اپنی بھی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ وہ پنجاب، دہلی اور کلکتہ کو جوڑنے والے رسل و رسائل اور نقل و حمل کے سلسلوں میں کلیدی اہمیت رکھتا تھا۔

نانا صاحب ان کے بھائی بالا صاحب، ان کے سپہ سالار تانتیا ٹوپے اور ان کے وزیر اعظم عظیم اللہ خاں اس مورچے کی نگرانی کر رہے تھے۔ نانا صاحب نے انگریز حکام کو ایک دن پہلے نوٹس دے کر ۶ جون کو حملہ شروع کر دیا۔ اس حملے میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والے ہندستانی سپاہیوں اور نانا صاحب کے لشکر کے علاوہ شہر کے لوگ 'صنعت کار' دکان دار غرضکہ سب طبقوں اور سب فرقوں کے لوگ شریک تھے۔ دوپہر کے بعد قلعے کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ اس روز کانپور میں ایک ہزار انگریز عورتیں اور مرد تھے اور ۲۷ جون کو جب انقلابی فتح سے ہم کنار ہوئے تو انگریزوں کے صرف ۴ مرد اور ۱۲۵ عورتیں زندہ بچی تھیں۔

محاصرہ اتنا مضبوط تھا کہ باہر سے رسد نہیں جا سکتی تھی۔ قلعے کے اندر کھانے بلکہ پانی تک کی کمی ہو گئی۔ ۲۳ جون کو جو جنگ پلاسی کی سویں سالگرہ کی تاریخ تھی انقلابی توپوں، سواروں اور پیادوں نے کانپور کا قلعہ فتح کرنے کے لیے اس پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ اور ۲۵ جون ۱۸۵۷ء کو جنرل وھیلر نے قلعہ کی فصیل پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔ نانا صاحب کے وزیر عظیم اللہ خاں نے ایک قیدی انگریز عورت کے ہاتھ جنرل وھیلر کو یہ تحریر بھیجی کہ جو لوگ ہتھیار ڈال دیں گے انھیں حفاظت سے الٰہ آباد بھیج دیا جائے گا۔ الٰہ آباد اور بنارس میں اس سے پہلے انگریزوں نے انقلابی سپاہ اور عوام پر زبردست مظالم کیے تھے۔ کانپور کے محاصرے کے وقت ان دونوں اور کئی دوسرے مقامات سے مظلوم اور ان کے رشتہ دار مظالم کا بدلہ لینے کے لیے کانپور آ گئے تھے۔ اگرچہ نانا صاحب نے انگریز قیدیوں کو الٰہ آباد لے جانے کے لیے کشتیوں اور کھانے پینے کے سامان کا انگریزوں کے حسب اطمینان بندوبست کر دیا تھا۔ پھر بھی قافلے کو روانگی کا سگنل ملتے ہی قیدیوں کا قتل عام شروع۔ لیکن جو عورتیں اور بچے نانا صاحب کی قید میں تھے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا۔

اس مورچے کے بیان میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۸ جون کو جب نانا صاحب نے انگریزی راج پر ہندستانیوں کی فتح کے اعزاز میں دربار کیا تو ان کے توپ خانے نے سب سے پہلے شہنشاہ دہلی کے اعزاز میں سلامی کے ایک سو ایک گولے داغے۔

لکھنؤ کے معرکے

کانپور کی فتح نے لکھنؤ میں انقلابیوں کے حوصلے بڑھا دئے وہ چنہٹ کی طرف چل پڑے۔ انگریز چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے آگے بڑھ کر لوہے والے پُل پر صف بندی کی۔ انہوں نے کچھ مواضعات بھی فتح کر لیے ان کے پاس اسلحہ نسبتاً زیادہ تھے لیکن انقلابیوں کے جوش اور جذبے نے آگے بڑھتی ہوئی بدیسی فوج اور اس کے دیسی حاشیہ برداروں کو زبردست نقصان پہنچایا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ریذیڈنسی میں جا چھپے اور سر ہنری لارنس نے مچھی بھون سے بھی اپنی سپاہ وہیں منتقل کر لی۔ ۳۰ جون کے اس معرکے میں انقلابیوں کی رہنمائی احمد اللہ شاہ کر رہے تھے۔

دوسرے معرکے میں مجاہدین نے ریذیڈنسی کے بیلی گارد والے پھاٹک پر حملہ کیا۔ ۲۰ جولائی کو گولہ باری اچانک رُک گئی اور دیوار کے نیچے بارودی سُرنگوں کے زبردست دھماکوں کے بعد کئی سمت سے دشمن پر ہلّہ بول دیا گیا۔ اس معرکے میں اگرچہ انقلابیوں کو کامیابی نہیں ہوئی تاہم انہوں نے وہ انگریز چیف کمشنروں سر ہنری لارنس اور میجر بینکس کو چپ لیا۔ ان کی اپنی صفوں کے سپہ سالار احمد اللہ شاہ بھی زخمی ہو گئے اور شدید نقصان کے باوجود پالا انگریزوں کے

ہاتھ رہا۔ لیکن وہ اس لائق نہیں رہے کہ محاصرہ توڑ کر ریزیڈنسی سے باہر نکل سکیں۔ انہوں نے کانپور سے مدد منگوائی اور وہاں سے خبر آئی جنرل ہیولاک کمک لے کر ۵۔۶ دن میں لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ ہیولاک نے اس مقصد کے لئے ۲۹ر جولائی کو گنگا پار کر لی۔

ان کی روانگی کی خبر پاکر نانا صاحب نے اودھ کو خیر باد کہہ کر کانپور کا رُخ کیا۔ ان کی نقل وحمل کی خبر پاکر ہیولاک منگلور کی طرف ہٹ گئے اور مجاہدین نے اس علاقے میں بشیرت گنج فتح کر لیا۔ اس پر قبضہ چند دنوں میں تین بار بدلا۔ لیکن فیصلہ کن اور مستقل کامیابی جنگ کے کسی فریق کو میسّر نہیں ہوئی۔ اس اثنا میں نانا صاحب بٹھور کی طرف سے کانپور پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ اور جنرل ہیولاک کو جنرل نیل نے کانپور واپس بُلا لیا۔ انہوں نے کمپنی کی اعلا کمان سے جو کلکتہ میں تھی کمک کی درخواست کی تاکہ لکھنؤ جاکر ریزیڈنسی کا محاصرہ توڑ سکیں لیکن کمک آنے سے پہلے ہی لکھنؤ جانے والی فوج کی کمان ان سے لے کر سر جیمس ووٹرم کو دے دی گئی۔ البتہ ووٹرم اپنی مرضی سے ہیولاک کی ماتحتی میں کام کرنے لگے۔ اور ۲۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ووٹرم نیل اور ہیولاک تین ہزار دو سو پچاس افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ جس میں بارہ سو دیس سے دغا کرنے والے دیسی فوجی تھے عالم باغ پہنچ گئے۔ وہیں انگریزی فوج کو دہلی کے دوبارہ فتح ہو جانے کی خبر ملی اور ہیولاک کی سپاہ نئے ولولے کے ساتھ لکھنؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ ۲۵ر ستمبر کو وہ چارباغ میں تھی۔

ریزیڈنسی کے مورچے پر ۸۷ دن کی لگاتار جنگ میں سات سو جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ تقریباً پانچ سو انگریز اور چار سو ہندستانی ابھی زندہ تھے اگرچہ ان میں کچھ زخمی بھی شامل تھے۔ اور ہیولاک کے ساتھ جو کمک بھیجی گئی تھی اس کے ۲۲۷ آدمی کمک کے ریزیڈنسی پہنچنے سے پہلے کام آچکے تھے۔ اس مورچے پر انگریزوں کی عزت بلکہ ہندستان میں ان کے وجود کا انحصار تھا اسی لئے کمانڈر انچیف سر کولن کیمبیل خود کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ پنجاب، مدراس اور ملک کے دوسرے حصّوں کے علاوہ نیپال سے بھی کمک منگائی گئی اور بحری دستہ بھی الہ آباد سے ناؤوں پر کانپور لایا گیا۔

جہاد کا فریضہ

سر کولن ۳ر نومبر ۱۸۵۷ء کو کانپور ۹ر نومبر کو عالم باغ پہنچے۔ ۱۴ر کو لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی۔ ۲۶ر دسمبر کو ریزیڈنسی کا محاصرہ ٹوٹ گیا۔ باہر سے آنے والی فوج محصور فوج سے مل گئی۔ مگر مجاہدین نے ہار نہیں مانی نہ ہتھیار ڈالے۔ کانپور کے علاقے میں نانا صاحب اور اودھ میں احمد اللہ شاہ آزادی کے متوالے محبانِ وطن کو ساتھ لے کر انگریزی فوج کو ہراساں کرتے رہے۔ اور انگریز جنرلوں کو چکمے و جھانسے دیتے رہے۔

جب انقلابیوں کی کامیابی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تب بھی وہ جہاد کو ایک فریضہ مان کر ملک کے دشمنوں سے لڑتے رہے۔ جب لکھنؤ میں انگریزی فوج اور اس کے ہندستانی پٹھوؤں نے غدر مچا دیا، ایک کے بعد ایک قلعہ اور مورچہ فتح کر لیا ——— سکندر باغ، دل کشا، قدم رسول، شاہ نجف، بیگم کوٹھی وغیرہ وغیرہ اور آخر میں خاص قصر شاہی پر چھاپہ مارنے کے لیے قیصر باغ پر حملہ کیا تو انقلابیوں نے اپنے بادشاہ اور ان کی ماں کو دشمن کے نرغے سے نکالنے کا بندوبست کر لیا۔ کرنل ہوپ گرانٹ نے ان کا پیچھا کیا مگر احمد اللہ شاہ نے پیچھا کرنے والی فوج پر پیچھے سے حملہ کر کے اسے اُلجھا لیا۔

اس کے بعد بھی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کے محلّے سعادت گنج میں مورچہ بنایا۔ انگریزوں نے سوچا کہ وہ انھیں اس جگہ گھیر کر ہلاک یا گرفتار کر لیں گے مگر یہ عظیم مجاہد ایک مرتبہ پھر نرغۂ اعدا سے بچ نکلا۔ اور اس کے بعد بھی سیتاپور اور شاہجہاں پور کے ضلعوں میں مجاہدوں کی تنظیم اور جہاد کی سرگرمیوں میں صحت کی خرابی کے باوجود مصروف رہا۔ لکھنؤ کی لڑائی کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ ہندستان بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے سر کاٹنے والا انگریز افسر ہڈسن اسی شہر میں مجاہدین کے ہاتھوں ۱۰ر مارچ ۱۸۵۸ء کو مارا گیا۔ اس طرح اودھ کا محاذ گویا دہلی کے محاذ سے مل گیا۔ انتزاع سلطنت سے پہلے اودھ کی سرحدیں سکڑ گئی تھیں مگر جہاد شروع ہونے پر جنگ کا محاذ جغرافیائی حدود سے باہر تک پھیل گیا۔

بے مثال بہادری

جہاد کے دوران انگریز حاکموں نے کئی مرتبہ مجاہدوں کو معافی، انعام اکرام کا اور عہدے جاگیر کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے آزادی کی خشک روٹی بلکہ فاقہ کشی کو خوف و ذلّت کے حلوے پر ترجیح دی۔ ان کے لیے وفاداری بہ شرطِ استواری عین ایمان تھی۔ شنکر پور کے قلعہ دار بینی مادھو کو جب انگریزی فوج نے تین طرف سے گھیر لیا تو کمانڈر انچیف نے انھیں پیغام بھیجا کہ اب لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں اور ہتھیار ڈال

دینے سے انھیں نہ صرف مکمل معافی بلکہ اپنی پوری املاک بھی مل جائے گی۔
اس مجاہد نے جواب دیا " اب قلعہ کو بچانا ناممکن ہو گیا ہے اسے چھوڑ رہا ہوں لیکن میں خود کو کبھی بھی آپ کے حوالے نہیں کروں گا اس لیے کہ اپنی ذات کا مالک میں خود نہیں ہوں بلکہ یہ میرے بادشاہ کی ملکیت ہے۔ قلعہ ہتھیار ڈال سکتا ہے مگر بینی مادھو نہیں۔

لکھنؤ کے قریب نواب گنج پر ۱۳ جون ۱۸۵۸ء کو انگریز جنرل ہوپ گرانٹ نے اپنی کالی گوری سپاہ کے ساتھ اچانک حملہ کر دیا۔ اور یہ افسر خود اپنی تصنیف " سپاہیوں کی جنگ کے واقعات " میں اس معرکے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ " زمیندار کے آدمیوں نے دو توپوں کے ساتھ ہم پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ میں نے ہندستان میں بہت سے بہادروں کو جیتنے یا جان دے دینے کے عزم دارادے کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا ہے لیکن مجھے کبھی ان زمینداروں جیسا شاندار کردار دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے دو اسکواڈرن سے زائد سپاہ نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ تین گھنٹے کی معرکہ آرائی کے بعد میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور دو توپوں کے پاس ۲۵ لاشیں پڑی تھیں "۔

لکھنؤ سے ۱۵ میل دور رویئاں کے چھوٹے سے زمیندار نرپت سنگھ پر جو جہاد آزادی میں شریک ہو گیا تھا ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو ایک طاقتور انگریز دستے نے حملہ کیا۔ قلعہ میں صرف ڈھائی سو آدمی تھے مگر وہ انگریزوں سے اپنے ملک اور اپنی مملکت کی اہانت کا بدلہ لینے پر بہ ضد تھے۔ قلعہ فتح کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنے دو جنرل لگا دیے جن میں سے ایک مارا گیا پھر بھی یہ حملہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ نرپت سنگھ کو ہلاک یا گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ اور یہ بہادر انگریزوں کے لیے مصیبت بنا رہا۔

عنبر پور کا یہ قلعہ فروری ۱۸۵۸ء میں دہلی اور لکھنؤ دونوں پر سبقت لے گیا۔ وہاں صرف ۳۴ بہادر تعینات تھے۔ انگریز جنرل نے اپنے ساتھ کی نیپالی فوج کو یہ قلعہ فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ قلعہ کا دفاع کرنے والے بہادروں نے حملہ آوروں میں سے سات کو ہلاک اور ۳۴ کو زخمی کر دیا۔ اور قلعہ پر مجاہدوں کا قبضہ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ ان کا ایک ایک آدمی مادر وطن پر قربان نہیں ہو گیا۔ اس کارنامے کی دوسری مثال ہندستان کیا دنیا کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملے گی۔

□□

داستانِ امیر حمزہ

صفحہ ۲۸ کا بقیہ

نورالدین احمد علوی کیفی کاکوروی

ان کی تصانیف کا تعارف امیر حسن نورانی یوں کراتے ہیں:-
" اردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانوں میں غالباً نونگار سے بڑی کوئی داستان نہیں ہے اور مصنف کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی ۱۹ جلدیں ہیں اور چند جلدیں دو دو حصوں میں ہیں۔ اس لیے کل داستان ۲۴ حصوں میں ہے۔ ہر حصہ بڑے سائز کے کم سے کم ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بعض حصے ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ داستان یوں تو امیر حمزہ کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور داستان میں نہیں۔ اس میں علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سید حشمت علی

انھوں نے ایک ہزار صفحات کی ایک جلد میں طلسم ہفت حجرہ لکھا۔ یہ بہت دلچسپ ہے۔

طلسم لالہ زار سلیمانی ۲ جلد۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ کو جس طرح لکھنؤ نے پروان چڑھایا وہ بے نظیر و بے مثال ہے۔ تمام شاہی سرپرستی کے باوجود رام پور اس باب میں نول کشور پریس کے تجارتی ادارے کو نہیں پہنچا۔

آج دنیائے اردو میں داستانِ امیر حمزہ کا جو غلغلہ ہے وہ محض لکھنؤ میں تصنیف شدہ اور شائع شدہ دفاتر کی وجہ سے ہے۔ ان کی ضخامت ان کی قدر پرستی میں آڑے آئی ہے۔ ان کے صفحات میں وہ ادبی جوہر و گوہر بھرے پڑے ہیں جو اردو کی چوٹی کی داستانوں میں ملتے ہیں۔ اگر یہ مختصر ہوتیں تو زیادہ قاریوں کو اپنی کمند میں اسیر کر سکتی تھیں۔ اگر لکھنؤ سلسلۂ حمزہ میں محض طلسم ہوشربا کا تحفہ ہی پیش کرتا تو وہ اردو کی کسی داستان اور داستان نگار سے ہیٹا نہیں رہتا۔

□□

پروفیسر سیّد مجاور حسین رضوی
۵۳۴۔ اتر سوئیا۔ حسن منزل۔ الہ آباد

طلسمِ ہوش رُبا میں نِسوانی مُعاشرہ

خدا مغفرت کرے نواب مرزا شوق کی۔ ہوسکتا ہے ان کے عہد میں کچھ عورتوں کا "حال پوشیدہ" نہ رہا ہو اور انھیں عورت "آفت اور قیامت نظر آئی ہو۔ اور اللہ معاف کرے مرزا رُسوا کو! انھوں نے اتنا اچھا ناول لکھا کہ آج کے پڑھنے والے کو انیسویں صدی کے لکھنؤ میں صرف امراؤ جان، بسم اللہ جان، خورشید جان، خانم اور آبادی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اُس دور کے نسوانی معاشرے کا تشخص طوائفیت اور جسم فروشی سے ہی کیا گیا۔ لکھنؤ کی عیاشی کی کہانیاں انیسویں صدی کے لکھنؤ کی پہچان بنادی گئیں۔! تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ اور ماہرینِ سماجیات کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک چھوٹے سے طبقے پر پورے معاشرہ کا قیاس کرلیا گیا۔!

حالاں کہ انیسویں صدی کا معاشرہ صرف امراؤ جان آدا اور فریبِ عشق کا معاشرہ نہیں تھا، یہ مرثیوں کا بھی معاشرہ تھا، جس کے کرداروں کے تقدس کی خود پاکیزگی بھی قسم کھاتی ہے اور جہاں عصمت و عفت کے کبھی نہ بجھنے والے چراغ روشن ہیں!

پھر ایک اور رُخ سے اس مسئلہ کو دیکھئے:

کیا تاریخ میں کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہے جب معاشرہ میں جسم فروشی نہ رہی ہو؟ کسی زمانے میں بھی ــــــ لیکن کیا اس زمانے کی پہچان یا اس علاقے کی شناخت آوارگی یا جسم فروشی سے کی گئی؟ کیا آج کال گرلس نہیں ہیں؟ امراؤ جان میں کسی نے کسی کو ایڈس کا تحفہ نہیں دیا۔ اور آج نائٹ کلب ہو یا ہوٹل ہوں یا کیبرے ہو یا گلیاں ہر جا شاعر کو کہنا پڑتا ہے ع

جسم امراض کے نکلے ہوئے تودوں سے

تو کیا آج کے معاشرے کی یہ پہچان بنے گی۔؟

آج اسکرین پر نظر آنے والی اداکارہ آرٹسٹ ہے، فن کار ہے۔ آج تو اس کے جسم کی اسکرین سے لے کر معمولی کاغذ تک پر نمائش ہوتی رہتی ہے، تو ہمیں کیا حق ہے کہ گزرے ہوئے کل کی رقاصہ اور مغنیہ کے فن کی نمائش کو عصمت فروشی کے تختہ دار پر لاکر کھڑا کردیں۔ اس کی پیشانی پر بد چلنی کی کیلیں ٹھونک دیں اور اس کے پورے جسم میں عیاشی کا تختہ جڑ دیں۔!!

شریف اور شائستہ مزاج لکھنؤ ــــ تہذیب کا دلدادہ، تمدّن کا رسیا، اعلیٰ ترین اقدار کا پاسبان و امین، اپنی شخصیت کو قربان کرکے دوسروں کی شخصیت کو "پہلے آپ" کہہ کر اُبھارنے والا لکھنؤ ــــ اور اپنی تاریخ پر کوئی آہنی پردہ نہ ڈالنے والا لکھنؤ ــــ ان تمام اہلِ قلم سے پوچھنا چاہتا ہے جو طوائف کو لکھنؤ کی "زوال آمادہ تہذیب" کی علامت قرار دیتے آئے ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ دشمن، انگریزوں کے زر خرید اور متعصب لکھنے والوں کی تحریریں پڑھتے ہوئے اپنے ذہن کے دریچے کیوں بند کرلیے۔؟ صداقتِ فکر سے کیوں محروم ہوگئے؟

بے شک تخلیق کار کا قلم کیمرے کی آنکھ ہوتا ہے لیکن انیسویں صدی کے لکھنؤ میں اگر آپ انیس و دبیر، ضمیر و تعشق کے مرثیے نہیں بھی دیکھنا چاہتے تو داستانیں ہی پڑھ لیجئے کہ ان داستانوں میں ایک مکمل سماجی نظام موجود ہے اور اس سماجی نظام میں عورت بہت اہم ہے اور یہ عورت مضبوط کردار کی مالک، باحیا، صاحبِ عصمت ہونے کے ساتھ بہادر، کارزارِ حیات میں معرکہ آرا، منتظم، اپنی کمزوریوں کے ساتھ تمامتر

لطافتوں اور رعنائیوں کا پیکر ہے۔

اودھ کی داستانوں میں بوستانِ خیال کے ترجمے، ملک محمد گیتی افروز وغیرہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چند لمحوں کے لئے فسانۂ عجائب کی ہی سیر کر لیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماہِ طلعت کج عورت ہے کج بحثی کرتی ہے، ہٹ دھرمی کرتی ہے۔ خود پسند ہے لیکن شوہر سے محبت میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، باحیا ہے۔ مہر نگار تو غیرت و عفت کی دیوی ہے عقل و دانش کا پیکر ہے۔ انجمن آرا خوبصورت ہے مگر بدچلن نہیں۔ بنی اسرائیل کی عورت یعنی قاضی کی بھاوج عصمت مآب ہے۔ غرض کہ ایک جادوگرنی کو چھوڑ کے ساری خواتین اپنی کمزوریوں کے ساتھ عصمت و عفت کی علامتیں ہیں۔ کیا مجال ہے جو ان میں سے کبھی کسی کے دل میں اپنے محبوب کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال بھی آیا ہو۔!

لیکن اس داستانچے سے قطع نظر طلسم ہوش رُبا کی اگر سیر کریں تو ہر گزرگاہِ خیال پر محبتوں کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ اس طلسم کی عورتوں کی کچھ خصوصیات پر غور کیجئے۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ شہزادہ اسد کو طلسم ہوش رُبا کو فتح کرنا ہے۔ اس میں افراسیاب سے محاربات کا تذکرہ ہے اور اسد مہ جبیں پر عاشق ہے جو افراسیاب کی لڑکی ہے۔

داستانوں کے ماحول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سماج میں مرد حاوی نہیں ہے بلکہ مرد و عورت دونوں برابر سے ایک دوسرے کے شریک کار نظر آتے ہیں۔ لاچین و بلقیس ثانی، افراسیاب و ملکہ حیرت، بہار و قباد۔ مخمور و نورالدہر، براق و ایرج، عمرو عیار و صرصر۔ قراں و صبا رفتار، اسد و مہ جبیں، غرض کہ صنفی اعتبار سے طلسم ہوش رُبا میں توازن ہے۔ نہ عورت مرد کی کنیز ہے اور نہ مرد مطلق العنان۔!

سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو طلسم ہوش رُبا میں اقتدار کی تقسیم تقریباً برابر کی ہے۔ جادوگروں میں بے شک مختار کل افراسیاب ہے لیکن اس کی ایک وزیر ملکہ صنعت سحر ساز ہے۔ اس کی نانی اور دادی یعنی آفاتِ چہار دست اور ماہیان زمرد پوش محافظ سلطنت ہیں۔ حجرۂ ہفت بلا کی ایک بلا تاریک شکل کش ہے اور حجرۂ پنجم کی یاقوت سخنداں جس کے ساتھ ہر وقت دو نہریں بہا کرتی ہیں اور پھر بے شمار جادوگرنیاں ہیں جنھیں حکومت کا کل پرزہ سمجھنا چاہیے۔ پھر مخبری اور سراغ رسی کے لیے عیار بچیاں یعنی صرصر، صبا رفتار، تیز نگاہ خنجر زن، شمیمہ نقب زن اور صنوبر ہیں — لیکن ان سب سے بالاتر افراسیاب کی بیوی ملکہ حیرت ہے جو منتظم اعلیٰ بھی ہے اور "جو سکہ خطبہ افراسیاب کا مگر عمل دخل ملکہ حیرت کا ہے"۔

ان تمام عورتوں میں کوئی بھی نہ طوائفیت رکھتی ہے نہ بدچلن ہے نہ کسی پر مرزا شوق کے مصرعے صادق آتے ہیں اور نہ ہی یہ رسوا ہیں۔

ان کے اور نقائص ہوں گے اور ہیں لیکن جو معاشرہ ان عورتوں کا ہے اس سے محمد حسن عسکری، عزیز احمد یا خورشید الاسلام یا اس قبیل صرف نادم ہو سکتے ہیں یا اپنے ذہنی تعصب پر تاسف کر سکتے ہیں۔ غیظ سے اپنی انگلیاں کاٹ سکتے ہیں —! مگر اس معاشرہ کو طوائفیت کا نام نہیں دے سکتے۔

اور یہ جادوگروں کا معاشرہ تھا جس معاشرے سے نہ مصنف کی ہمدردیاں وابستہ ہیں نہ سننے والوں کی۔ لیکن اس معاشرہ میں نہ کہیں عدم توازن ہے اور نہ بدچلنی — نہ عورت خود جلتی ہے نہ مرد کو جلاتی ہے۔ مصور اور صورت نگار میں کبھی کبھی خوش فعلی کے طور پر مار پیٹ ہو جاتی ہے چنانچہ مصور نے صورت نگار کو طمانچہ مارا تو صورت نگار نے بھی ہزاروں گالیاں دیں۔ دو ہتھڑ رسید کیا۔ صرصر عیارہ نے عمرو عیار سے محبت کے باوجود اسے ایک لات بھی رسید کر دی۔ یہ ایک رُخ ہے۔ دوسری طرف عورتیں بڑی اچھی منتظم ہیں۔ ایک ملکہ گلزار عنبریں مو ہے۔ اس کے یہاں سب قیدیوں کو کھانا تو ملتا ہی ہے، آٹھویں دن مٹھائی بھی ملتی ہے چنانچہ بدیع الزماں کو بھی مٹھائی ملی تھی۔ اسی طرح ملکہ حیرت کے ایک انتظام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "عمرو نے شہر ناپرساں کو خوب لوٹا۔ ملکہ حیرت نے شاہی خزانے سے سب کے نقصان کی تلافی کر دی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ آئندہ حکومت کسی نقصان کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ لوگ اپنی حفاظت آپ کریں۔"

حالتِ جنگ میں جب ایمرجنسی ہو، ایک اچھا انتظامیہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔؟

یہ جادوگرنیاں اپنے عہد کی سائنس (جادو) سے واقف ہیں ان میں سے

ہر ایک اپنے فن کی ماہر ہے۔ بدچلنی یا بدکرداری کا کیا ذکر، کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے تو دیدے پانی کی طرح بہہ جائیں۔

ان عورتوں میں فوجی مہارت اور جنگی صلاحیت ہے۔ یہ اپنے اپنے صوبوں کی گورنر (قلعہ دارنیاں) ہیں۔ کوئی موقع پڑتا ہے تو فوج لے کر نکلتی ہیں۔ ان میں نہ بزدلی ہے اور نہ زندگی کی حقیقتوں سے فرار اور ان تمام باتوں کے ساتھ یہ جس کی ہیں اس کی ہیں ___ بستر کی چادر کی طرح مرد بدلنے کی قائل نہیں ہیں ___!

یہ تو ہوا جادوگروں کی مملکت کا حال جہاں عورت بڑے وقار، دبدبے اور کلّے ٹھلّے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ عورت کی ایک صحت مند معاشرے میں کیا حیثیت ہونی چاہیے۔ وہ ان جادوگروں کے دیس میں ہے ___ جو آج کے اعلیٰ ترین نسائی حیثیت کے علمبردار ممالک میں نہیں۔!

اب اس کے مقابل جو معاشرہ ہے اس کے لیے داستان گو لفظ اسلام یا خدا پرستوں کے لشکر کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ یہاں دو طرح کی خواتین ملتی ہیں:

۱۔ وہ خواتین جو امیر حمزہ کی رشتہ دار ہیں، جن کی جھلک چشم فلک نہیں دیکھ سکتی، وہ خوش رہتی ہیں، سکون سے چراغِ خانہ بن کر رہتی ہیں۔

۲۔ وہ خواتین جو جادوگرنیاں تھیں اور ہیں اور اب اسد کے لشکر میں ہیں اور افراسیاب سے لڑ رہی ہیں، ان میں اور افراسیاب کے لشکر کی جادوگرنیوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ علوم متداولہ سے یہ دونوں واقف اور باخبر ہیں۔ اپنے فن کی ماہر ہیں، بزدل نہیں بہادر ہیں۔ گو کہ افراسیاب کے ساتھ والی خواتین کی غالب اکثریت بدچلن نہیں ہے اور ملکہ حیرت افراسیاب کے مرنے کے بعد جس شوہر پرستی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ لیکن خدا پرستوں کے لشکر کی جادوگرنیاں یا شہزادیاں کردار کے اعتبار سے ایک روشن مینار ہیں۔ شوہر پرست، باوفا، صاحب ایثار ہیں، ایک کی ہو کر رہنے والی، دنیاوی عیش و آرام کو ٹھکرانے والی ___ زمردشاہ باختری عرف خداوند لقا کی لڑکی لالان خوں قبا "ثابت قدم کوئے محبت بننے کے لئے جس جگہ وارث نے بٹھایا وہیں جان دینا چاہتی ہے۔" مہ جبیں افراسیاب کی لڑکی ہے۔ افراسیاب نے اسے ہر طرح کی لالچ دی ہے، اس پر دباؤ ڈالا ہے۔ سمجھایا ہے کہ وہ اسد کی محبت سے باز آجائے لیکن مہ جبیں ؎

ہم ان سے اقبال دور رہ کر اگر جئے بھی تو کیا کریں گے

ذرا اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ان کے (شہزادہ اسد) ساتھ تڑپ تڑپ کے مرجاؤں گی کہ یہی لطفِ زندگی ہے۔"

بہار اور مخمور دونوں کے لیے افراسیاب نے ہر طرح کی لالچ اور طلسمی جنّت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر ناممکن ہے کہ ذرا سی لغزش بھی ہو جائے۔

ان عورتوں کا ایک اور نفسیاتی پہلو ہے جو معاشرت کا حسن ہے یعنی ان عورتوں میں باہم ایک دوسرے کے خلاف حسد کا جذبہ نہیں ہے۔ اسد پر بہت سی عورتیں عاشق ہیں مگر یہ سب ایک دوسرے سے اس لیے محبّت کرتی ہیں کہ ہم ایک ہی شمع کے پروانے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے وقت پر کام بھی آتی ہیں۔ مثلاً بہار یا مخمور یا ملکہ برّاں۔ ان سب کے محبوب الگ الگ ہیں۔ مگر یہ سب شہزادہ اسد کے لیے اور ایک دوسرے کے لیے خلوص کے خزانے رکھتی ہیں۔ جان دینے سے گریز نہیں کرتیں۔ انھیں میں ملکہ محبوب کا کل کشا بھی ہے جس کا کردار ایثار و قربانی کی معراج ہے صورت حال یہ ہے کہ عفریت طلسم بڑھتا چلا آرہا ہے اور وہ صرف ملکہ محبوب کا دل کھا کر مطیع ہو سکتا ہے۔ محبوب اپنی کوکھ پر خنجر مارتی ہے۔ دل نکال کر پیش کرتی ہے اور عفریت کی مصیبت سے اسد کو چھٹکارا دلاتی ہے۔

یہ عورتیں پیکرِ مہر و وفا ہیں۔ یہ نہ آفت ہیں نہ قیامت بلکہ یہ ایک مثالی معاشرہ کی وہ خواتین ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں ہندستانی تاریخ کے صفحات میں اپنا وجود رکھتی تھیں۔ رضیہ سلطان، چاند بی بی۔ حیات بخشی بیگم۔ مخدومہ جہاں؛ علی مردان خاں کی بیٹی۔ رانی دُرگا وتی۔ اہلیہ بائی ___ خواتین کا یہ زرّیں سلسلہ تھا جس کا منطقی نتیجہ بیگم حضرت محل تھیں اور طلسم ہوش رُبا کی یہ خواتین انھیں روایات کا روشن اور تابناک عکس تھیں۔

ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ساری شہزادیاں عاشق مزاج ہیں تو حق یہ ہے کہ عورت کا عشق کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اگر وہ ایک کی

ہوکر رہے۔ یہ شہزادیاں ایک ہی بار عشق کرتی ہیں جس سے عشق کرتی ہیں اسی کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے اپنے کفو سے عشق کرتی ہیں۔ کمتر درجہ کے آدمی کی ان کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے اگر کسی کمتر نے ان کے بارے میں سوچا بھی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایسا نہیں ہے کہ طلسم ہوش رُبا میں، جو معاشرہ ہے اس میں خواتین صرف شہزادیاں یا پریاں ہیں بلکہ ایک طبقاتی سماج ہے جس میں ہر طبقے کی عورت نظر آتی ہے اور لباس وزیورات سے پہچانی جاتی ہے۔

شہزادیاں اور ملکہ "انگیا گوکھرو کی یا کامدانی کی، پرزر کرتیاں سبز بادلے کی۔ ململ اور آب رواں کی پیشواز، زردار پاجامے، پائینچے گلبدن کے لچھے دار مشجر اور زربفت کے لہنگے، شبنم کے دوپٹے اور زیورات میں ٹیکہ، کنگن، چمپا کلی، کرن پھول، چاند ٹیکی، جھومر، یاقوت اور احمر کے جھمکے، جگنو کا توڑا، ناک میں نتھ، کان میں بجلیاں، بالے، جھمکے، مُندرے، اُدراج، بازوبند، نوگرہی، جوشن، دست بند، پازیب، چھڑے، جھانجھ، گھنگھرو خلخال، پیر میں زردوزی کی زیرپائی، آرام پائی۔"

یہ ہے وہ متمدن معاشرہ خوش حال لوگوں کا مگر اسی کے ساتھ کنیزیں جلیسیں، خواصیں، آتوجی، چھوچھو، ماما، اصیلیں، مغلانی، قلماقنی بھی نظر آتی ہیں۔ ملکہ حیرت کے سرپر وزیرزادیاں مگس رانی کرتی ہیں۔ تین چار سو تو صرف چتر بردار ہیں۔ دیہات کی عورتیں البتہ غربت کا شکار ہیں۔ ان کے "لہنگے پھٹے ہوئے ہیں یہ پیتل کی بالیاں پہنتی ہیں۔ گاڑھے کی کرتیاں" ہیں۔ شہر میں ساقنیں حقہ پلاتی ہیں۔ ہزار بناؤ کئے دُلائی سفید اودی گوٹ کی اوڑھے، آگے سے طوق سونے کا دکھانے کو گلا کھولے۔ پائینچے پاجامے کے پیچھے تخت پر پڑے۔"

ان کے آگے بڑھ کر کبڑنوں اور سنگریوں کی بہار دیکھیے کہ:

"لہنگے قیمت کے پہنے سامنے ٹوکروں میں ترکاریاں، انار امرود، شریفے، چنے تھے۔ گنڈیریوں کے لیے گنے پونڈے چھیلتی تھیں۔"

یہ ساری عورتیں نفاست پسند ہیں، ان میں شوخی ہے لیکن بدکاری نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ ترین معیار کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ "ان کے پاس عقیق کی سُرمہ دانی ہے۔ دانتوں میں مسی لگاتی ہیں۔ گلگونہ، غازہ تو ہوتا ہی ہے پور پور مہندی رچی ہوتی ہے۔

"بی گل رنگ! تم کو اپنی صورت کی قدر نہیں۔ ابٹنا منھ پر ملا کرو، چند دنوں میں رنگت کھل جائے گی۔"

یہ خواتین حقہ اور پان سے شغل کرتی ہیں۔ ہوادار تخت رواں، محافہ، پالکی نالکی جیسی سواریاں استعمال کرتی ہیں۔ ان کے یہاں دسترخوان بھی دیبا کا ہوتا ہے۔ ان کے بستر جب بچھتے ہیں تو

"چار گھڑی دن رہے حکم دیا کہ پلنگ ہمارا بالائے بام بچھاؤ کہ چاندنی کی کیفیت دیکھیں گے اور وہیں آرام کریں گے۔ بمجرد حکم پلنگ کوٹھے پر آراستہ ہوا اور اوٹ پھولوں کے کھڑے کر دیئے۔ گلاب اور کیوڑے کے قرابوں اور عطر کے شیشوں کے منھ کھول کر رکھ دیئے۔ گلدستے جا بجا چُن دیئے کنیزوں نے کہا داری خواب گاہ آپ کی درست ہے۔"

ان کی نفاست اور ایک سحر کار ماحول کی تخلیق وہ چاہے باغ کا نقشہ ہو، جشن ہو ساز ہوں، موسیقی کے مختلف راگ ہوں، جو بھی ہو ان سب میں نفاست ہے لیکن آوارگی اور بدچلنی نہیں ہے۔ بیشک شہزادیاں شراب پیتی ہیں لیکن یہ "ماڈرن ڈرنک" نہیں ہے یہ کوئی بھی مشروب ہو سکتا ہے جس سے سرور آتا ہے اس کے نشہ میں خرمستی، بدمستی نہیں۔

یہ عورتیں ان تمام باتوں کے ساتھ ہمدرد بھی ہیں، ذہین بھی ہیں۔ ان ہی عورتوں میں ملکہ آسمان پری ہے جس نے امیر حمزہ کو مرہم سلیمانی دیا تھا جس سے ہر زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ ان میں جہاں طب کا یہ پہلو ہے وہاں ٹونا ٹوٹکا بھی ہے کہ۔ "اگر سات جمعرات سوت کا نام لیکر نیم کی پتی اور نمک کنوئیں میں چھوڑ دیا جائے تو وہ مال زادی فوراً نکل جائے گی۔!!"

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ داستان گو عوامی زندگی سے باخبر نہ تھے۔ عوامی زندگی سے اگر مُراد یہ ہے کہ بیل کس طرح ہنکائے جاتے ہیں، سیار کس طرح بھگائے جاتے ہیں۔ ہڑتال کیسے ہوتی ہے تو یقیناً یہ معاشرہ تو داستانوں میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ داستانوں کی فضا شرفائے شہر کی ہے مگر اس شہر میں گھسیارے، لکڑہارے، بھٹیے، چڑیمار، کپڑا بننے والے اور ان سب کے ساتھ کھاردے اور گاڑھے کی لُنگیاں اور انگرکھے ملتے ہیں، لیکن

یہ سب ہے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ــــ عمرو کی زنبیل سے کلوار برآمد ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ کشتی مہترانی بھی دکھائی دیتی ہے جو ٹوکرا بغل میں رکھے بالیاں اور جھمکے پہنے نظر آتی ہے ۔ یہ مہترانیاں مخبری بھی کرتی ہیں ۔ داروغہ ان سے گھر گھر تلاشی لینے کا بھی کام لیتے ہیں ۔

یہ ساری باتیں ہیں لیکن ان میں کہیں بھی نہ "زوال آمادہ تہذیب" ہے ، نہ "بدکار معاشرہ" نہ بدچلن عورتیں ۔ لکھنؤ کا یہ خوددار معاشرہ ، متنوع معاشرہ بہر حال طوائف سے خالی نہیں ہے ۔ مگر ذرا طوائف کا تذکرہ دیکھئے :

"کسی طرف ساقنوں کی بناوٹ ہے ، رنڈیاں طرحدار چکلہ چوک میں آباد ۔ تماش بین دلشاد ، عورتیں جوان ، لہنگے زربفت کے ، دھوتی کے انداز میں کسے" ۔ کہیں کہیں اس طرح

کہیں کہیں اس طرح کے فقرے مل جاتے ہیں مگر اہمیت طوائف کی نہیں ہے بلکہ عالم یہ ہے کہ اگر ملکہ نسرین عنبریں مو محفل میں آگئی تو اجلال جادو اسے بے غیرت کہتا ہے ۔

تخلیق کار کا قلم کیمرہ ہوتا ہے ـــــ اس فقرہ کی تکرار صرف اس لیے ہے کہ اگر شرر کے بیان ' فریب عشق اور امراؤ جان ادا کی تصویر کشی کی بنا پر لکھنؤ کی پہچان اور اس کا تشخص کچھ یرقان زدہ اذہان نے طوائفیت سے کیا تو انیسویں صدی کی اس داستان کے واضح بیان سے لکھنؤ کا تشخص اور اس کی پہچان بہادر ، باعفت اور ہشت پہل شخصیت کی مالک خواتین سے ہونا چاہیئے ۔

طلسم میں علم کی قدر ہے ۔ "تم نے ذہانت کو ہماری صاحبزادی کی دیکھا ۔ بے شک پڑھنے لکھنے سے آنکھیں چار ہو جاتی ہیں" ملکہ ہوشنگ نے کہا ۔

یہ ایک پہلو ہے ۔ اب ایک رُخ ملاحظہ ہو ۔ طلسم میں شہزادیاں ہوں یا جادوگرنیاں ، یہ سب خلا میں نہیں رہتیں ۔ ان سب کے ایک دوسرے سے رشتے ہیں اور وہ ان رشتوں کے مطابق رہتی ہیں ۔ مثلاً بہار افراسیاب کی سالی ہے ۔ برّان کوکب کی بیٹی ہے ۔ مررخ مرجبیں کی نانی ہے ، آفات چہاردست اور ماہیان زمرد پوش افراسیاب کی نانی اور دادی ہے ۔ لعل سخن داں یاقوت سخنداں کی حقیقی بہن ہے ۔ ان رشتوں میں کبھی تصادم ہوتا ہے ۔ مثلاً لعل سخن داں اسد کی طرف دار ہے یاقوت سے لڑتی ہے ۔ اسد کے بازو پر اگو باندھتی ہے ۔ بہار بھی اپنی بہن حیرت سے لڑتی ہے مگر ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب حیرت کو شہنشاہ کوکب تلوار کے سائے میں لیتا ہے تو بہار بے چین بھی ہو جاتی ہے ۔

ہندستانی سماج میں جتنے امکانی رشتے ہو سکتے ہیں اور ان رشتوں کی جو نزاکتیں ہیں وہ سب اس معاشرے میں ملتی ہیں البتہ یہ حقیقت ہے کہ مہابھارت کی طرح اصول پر رشتے قربان کر دیئے جاتے ہیں ۔

محبت اور فرض کی کشمکش میں بھی فرض کی فتح ہوتی ہے ۔ پانچوں عیار بچیاں مخالف کے لشکر کے عیاروں سے عشق کرتی ہیں لیکن افراسیاب کی حیات تک ان کی وفاداریاں افراسیاب کے ساتھ ہیں اور موقع پڑنے پر وہ مخالف لشکر کے بڑے سرداروں کو قید بھی کرتی ہیں اور فرض اور وفاداری کا جو تقاضا ہے اس کے مقابل اپنے عاشقوں کو بھی ڈاج دینے سے نہیں چوکتیں ۔

طلسم ہوش ربا کے سلسلے میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ تمام اہم شہزادیوں کے جادو دراصل عورت کے مزاج کی مختلف کیفیتیں ہیں ۔ بہار بیکو رنگ و بو ، مخمور نشہ و مستی ، برق خنداں و گریاں رونے اور ہنسنے کی کیفیت ۔ برّان کا اختر مروارید فضا کی بیکراں وسعتوں تک عورت کی پہونچ حیرت کے بال حسین جال مجلس کی گڑیاں ، عورت کا بھولا پن اور کھیل کی کیفیت وغیرہ ۔ لیکن یہ پہلو ضمناً عرض کیا گیا ۔ موضوع نسوانی معاشرہ ہے ۔ یہ معاشرہ صحت مند ہے اس میں بدچلنی نہیں ہے ، بدکرداری نہیں ہے ۔ آزاد خیالی ہے ، لطافت ہے ، شوخی ہے ، بذلہ سنجی ہے ۔ عورت بہادر ہے منتظم ہے ۔ اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے ۔

ــــ ایک داستان کی مثالی عورت دیکھئے :

" یہ اپنے باپ کی جانشین ہے ۔ اس کی نسبت تلاش کی جا رہی ہے ، ایسے سے جو رنگ سنگ ڈھنگ رکھتا ہو ' رنگ علم و ہنر کا ، سنگ شریفوں کا ، ڈھنگ غیرت کا ۔ اگرچہ یہ لائق و فائق عورت ہے مگر جے پال شاہ عورت کی اطاعت کو دل گوارا نہیں کرتا ۔ ہاں ایک صورت ہے نکاح کر لے" ۔

اور نکاح شریف زادیاں کرتی ہیں ، طوائفیں نہیں ـــــ اس لئے انیسویں صدی کے لکھنؤ کی عورت کا تشخص اور پہچان ' فریب عشق ' ، ' بہار عشق ' ،

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پروفیسر محمد ولی الحق انصاری
'دارالامان'، ۲۷، فرنگی محل، لکھنؤ ۳

فرنگی محل کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات

خانوادۂ علمائے فرنگی محل غالباً دنیا کا تنہا خاندان ہے جس میں کم از کم ایک ہزار سال سے نہ صرف پڑھے لکھے لوگ بلکہ نابغۂ روزگار علماء پیدا ہوتے رہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں اہم علمی خدمات انجام دیں۔

اس خاندان کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی اور میزبانِ رسولِ اکرمؐ حضرت ابو ایوب خزرجی انصاری تک پہنچتا ہے۔ حضرت ابو ایوب کے بیٹے یا پوتے ابو منصور "مت" (یا بقول علاء الدین چشتی برناوی "صامت") حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں احنف بن قیس کے ہمراہ خراسان تشریف لائے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کی آٹھویں پشت میں ایک زبردست عالم، صوفی، شاعر اور نثار پیدا ہوا جس کا شمار آج افغانستان کی محترم ترین شخصیتوں اور فارسی ادب کے بہترین اہلِ قلم میں ہوتا ہے اور جو علمی اور مذہبی دنیا میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری (متوفی ۲۲ ذی الحجہ ۴۸۱ھ مطابق ۸ مارچ ۱۰۸۹ء) کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ الاسلام کا حضرت ابو ایوب انصاری تک شجرۂ نسب اس طور سے ہے:

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ابن ابو منصور محمد بلخی ابن جعفر ابن ابو معاذ ابن محمد ابن احمد ابن علی ابن جعفر ابن ابی منصور مت (صامت؟) الانصاری الہروی تابعی ابن ابو ایوب انصاری۔

شیخ الاسلام عبداللہ ۳۹۶ھ مطابق ۱۰۰۶ء میں ہرات میں پیدا ہوئے اور اس وقت سے اب تک ہندستان کے علاوہ ان کی نسل کے لوگ ہرات میں موجود ہیں۔ انصاریانِ ہرات کے علاوہ ہندستان آنے کا سلسلہ عہدِ التمش سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں وسط ایشیا، خراسان، ایران وغیرہ پر چنگیزی حملے کی وجہ سے دیگر علماء اور صلحاء کی طرح انصاریانِ ہرات کو بھی ہندستان ہجرت کرنا پڑی۔ انھیں مہاجرین میں حضرت عبداللہ انصاری کے بھائی منصور ابن ابی منصور محمد کے پرپوتے خواجہ سلیم ابن خواجہ ابو اسمٰعیل ابن خواجہ عبیداللہ ابن خواجہ منصور کے بیٹے خواجہ جلال الدین بھی تھے وہ دیگر اہلِ قبیلہ کے ساتھ دہلی کے پڑوس میں سرسل نامی ایک قصبے میں آباد ہو گئے تھے۔ حالات کے ناموافق ہونے کی وجہ سے پانچ پشتوں تک ہندستان میں قیام کرنے کے بعد مشہور بزرگ مخدوم بدرالدین برناوی کے والد خواجہ شرف الدین کے علاوہ باقی تمام افرادِ قبیلہ ہرات واپس چلے گئے۔ مخدوم بدرالدین نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ارشاد کے مطابق موضع برناوا (ضلع میرٹھ) میں قیام کیا اور وہیں ۸۰۰ھ (مطابق ۱۴۰۳ء) میں وفات پائی اور اب تک ان کی نسل کے افراد وہاں موجود ہیں۔ مخدوم بدرالدین کے پوتے مخدوم علاء الدین ابن مخدوم نصیر الدین (متوفی ۸۷۵ھ مطابق ۱۴۷۰ء) کا آخری زمانہ وہ تھا جب تیموری لشکر وسط ایشیا، ترکی، ایران اور خراسان وغیرہ ممالک کو تاراج کر رہا تھا۔ اسی تاریک دور میں انصاریانِ ہرات کے کچھ افراد کو دوبارہ ہجرت کر کے ہندستان آنا پڑا اور ان مہاجروں میں قطبِ عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی بھی شامل تھے جو علمائے فرنگی محل کے ہندستان آنے والے اجداد میں پہلے شخص ہیں اور جن کا خواجہ عبداللہ انصاری ہروی تک سلسلۂ نسب اس طور سے ہے:

قطبِ عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی ابن خواجہ اسمٰعیل ابن خواجہ اسحٰق ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ عزیز الدین ابن خواجہ جمال الدین ابن خواجہ دوست محمد ابن خواجہ پیر غیاث الدین ابن خواجہ پیر معز الدین ابن خواجہ پیر حبیب اللہ ابن خواجہ شمس الدین ابن خواجہ جلال الدین ابن خواجہ ظہیر الدین ابن خواجہ سلطان محمد ابن خواجہ نظام الدین ابن خواجہ شہاب الدین محمود ابن خواجہ عوض ابن ایوب ابن جابر مقرب باری ابن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری۔

فرنگی محل کی خاندانی روایات کے مطابق اس خاندان کے اجداد برناوا سے سہالی ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے تھے اور اسی وجہ سے کچھ حضرات کو سہو ہو گیا کہ انصاریانِ فرنگی محل انصاریان برناوہ ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ان روایات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی ہندستان آنے کے بعد اپنے ہم نام مخدوم علاء الدین برناوی کے آخری زمانے میں یا کچھ اس کے بعد اپنے ہم جد عزیزوں کے پاس برناوا میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے شیخ نظام الدین انصاری برناوہ سے موجودہ ضلع بارہ بنکی کے قصبہ سہالی آ گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور سہالی کے قریب ایک مقام "روضہ" میں دفن ہوئے۔

شیخ نظام الدین کے قیام کے بعد سہالی علم و فن کا مرکز بن گیا اور ان کی آٹھویں پشت میں مشہور زمانہ عالم ملا قطب الدین شہید پیدا ہوئے جن کے متعلق علامہ غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں :

"ملا قطب الدین شہید امام اساتذہ و مقتدائی جہابذہ است۔ معدن عقلیات و مخزن نقلیات ......
ملا قطب الدین عمر با انجمن درس آراست و جہان جہان ارباب تحصیل را بپایۂ تکمیل رساند۔ امروز سلسلۂ استفادۂ اکثر علماء کشور ہندوستان براو منتہی می شود"۔ لہ

یہی ملا قطب الدین شہید خانوادۂ علماء فرنگی محل کے جد ہیں اور انھیں کے چاروں بیٹے یا ان کی اولادوں نے مشعلِ علم کو اس طرح روشن کیا کہ آٹھ پشتوں تک سارے ہندستان میں اس کی روشنی پھیلتی رہی اور ہر نسل میں ایک سے زیادہ ایسے عالم ہوتے رہے جنھیں بجا طور پر نابغۂ روزگار کہا جا سکتا ہے اور جن کے علم کی روشنی نے نہ صرف ہندستان کو بلکہ اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کو بھی منور کیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اگرچہ علم کی نوعیت بہت حد تک بدل چکی ہے۔

ملا قطب الدین کی شہادت لہ (۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۶۹۲ء) کے بعد شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے ملائے شہید کی اولاد کے قیام کے لئے ان کے دونوں بڑے بیٹوں ملا محمد اسعد کو لکھنؤ میں احاطۂ چراغ بیگ میں ایک نیل اور گھوڑوں کے یورپین تاجر کی چھوڑی ہوئی خالی عمارت جو فرنگی کا محل کے نام سے مشہور تھی، دے دی گئی اور ۱۶۹۴ء میں ملا سعید اپنے چھوٹے بھائیوں ملا نظام الدین اور ملا رضا نیز دیگر افراد خاندان کو اسی فرنگی کے محل میں آباد کر کے حیدر آباد چلے گئے اور تمام افراد خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کم عمر ۱۶ سالہ نوجوان کے سر آ پڑی جو آئندہ استاذ الہند ملا نظام الدین کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے وہ درس ترتیب دیا جو آج بھی بیشتر عربی و فارسی مدارس میں رائج ہے اور جس نے اس ادارے کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت سیکڑوں سے زیادہ عربی و فارسی نیز اردو تصانیف وجود میں آئیں۔

ملا نظام الدین (پیدائش ۱۰۸۹ھ، وفات ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ مطابق ۲۷ اپریل ۱۷۴۸ء) نے اپنے والد نیز دیگر علماء مثل ملا امان اللہ بنارسی، ملا علی قلی جائسی وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کے بعد ملا غلام نقش بند لکھنوی سے فاتحۂ فراغ پڑھا اور چھبیس سال کی عمر میں تحصیل سے فراغت کے بعد مسندِ درس لہ آراستہ کی اور اپنے چھوٹے بھائی ملا رضا اور بڑے بھائی ملا سعید کے بیٹوں ملا احمد عبدالحق (وفات ۹ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۷۵۴ء) اور ملا عبدالعزیز (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء) کے ساتھ اس علمی ادارے کو وجود میں لائے جو ان کی فرنگی کے محل میں سکونت کی وجہ سے "فرنگی محل" کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں اس وقت تک تین سو سے زیادہ حضرات گزر چکے ہیں جن میں شاید ہی کوئی کم علم رہا ہو۔ یہ علماء بنیادی طور سے صاحبِ درس تھے اس لئے ان کی بیشتر تالیفات کا تعلق بھی درس ہی سے ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی تالیفات میں شرحوں اور حاشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ محض حواشی ہیں۔ حقیقتاً وہ بلند پایہ مستقل تصانیف کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

ملا نظام الدین کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی مدارس کے لئے متفقہ درس ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے درس میں منقولات پر زیادہ زور دیا۔ جبکہ ملا نظام الدین نے اپنے ترتیب دادہ درسِ نظامی میں منقولات و معقولات دونوں پر یکساں زور دیا تھا۔ ملا نظام الدین کے ترتیب دادہ اس درس نے پورے ملک میں شرف قبولیت حاصل کیا اور آج تک زیادہ تر مدارس میں اسی کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے۔ ملا نظام الدین کو بحیثیت استاد کے اپنی

زندگی ہی میں وہ مرتبہ حاصل ہو گیا تھا کہ اکناف و اطراف ملک سے نہ صرف طالبانِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بلکہ دوسرے اساتذہ کے طلباء بھی فاتحہ فراغ کے لیے ملا نظام الدین (جو اس وقت تک استاذ الہند کے لقب سے شہرت حاصل کر چکے تھے) ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسا کہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں :-

"تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اشتہار عظیم یافت۔ امروز علمای اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند و کسی کہ سلسلۂ تلمذ بہ اومی رساند بین فضلاء علم امتیاز می افرازد و مردم بسیار دیدہ شد کہ تحصیل جاہا می دیگر کردند و برای اعتبار فاتحۂ فراغ از مولوی گرفتند۔"

ایک زبردست استاد ہونے کے علاوہ ملا نظام الدین متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں شرح مسلّم الثبوت، شرح تحریر الاصول لابن الہمام صبح صادق، منار الاصول، حاشیہ شرح عقائد جلالی، حاشیہ حواشی قدیمہ دوانیہ حاشیۂ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ، شرح رسالہ مبارزیہ، مناقب رزاقیہ اور رسالہ دربیان وضوِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شامل ہیں۔

ملا نظام الدین نے جس شمع کو روشن کیا تھا اس کی روشنی نے آئندہ نسل میں پورے ہندستان کو جگمگا دیا۔ اس نسل کے علماء میں ملا عبدالعلی بحرالعلوم (پیدائش ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۲۹ء - وفات ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۱۰ء)، ملا محمد حسن المعروف بہ ملا حسن (متوفی ۳ صفر ۱۲۰۹ھ / ۳۰ اگست ۱۷۹۴ء)، ملا احمد انوار الحق (پیدائش ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء - وفات ۲۹ شعبان ۱۲۳۶ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۲۱ء)، ملا مبین (پیدائش ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء - وفات ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۸۱۰ء)، ملا نور الحق ابن مولانا انوار الحق (وفات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۸۲۲ء) وہ حضرات ہیں جن کا اسلامی علمی دنیا میں جواب نہ تھا اور جن سے تمام مسالک کے لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ ان حضرات میں ملا عبدالعلی بحرالعلوم اور ملا حسن کا خصوصی رجحان معقولات کی طرف تھا۔ ملا حسن ابن قاضی غلام مصطفےٰ اپنے والد کے نامور چچا استاذ الہند ملا نظام الدین کے شاگرد تھے اور علوم معقولات میں ابو سینائے عصر سمجھے جاتے تھے۔ ایک عرصے تک فرنگی محل میں درس و تدریس اور تالیفات کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد کچھ خاص حالات اور مقامی سیاست کے تحت لکھنؤ چھوڑ کر حافظ رحمت خاں کے پاس شاہجہاں پور میں رہے اس کے بعد ضابطہ خاں نے انھیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کے ماموں نے ملا کمال الدین فتحپوری کی جگہ دارانگر کے مدرسے میں ان کا تقرر کر دیا۔ ضابطہ خاں کے پاس سے ملا حسن نواب فیض اللہ خاں کے پاس رام پور چلے گئے جہاں سرکاری مدرسہ آپ کے سپرد کر دیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور جہاں دفن ہوئے وہ پورا علاقہ آج بھی انھیں کے نام سے موسوم ہے۔

ایک بلند پایہ عالم اور استاد ہونے کے علاوہ ملا حسن ایک اہم مصنف بھی تھے جن کی مختلف شرحیں اور حاشیے مثلاً شرح مسلّم العلوم شرح مسلم الثبوت، حواشی صدرا، حواشی زوائد ثلثہ، حاشیہ شمس بازغہ معارج العلوم اور معارج العلوم علمی دنیا میں عالی مقام رکھتے ہیں۔ ملک العلماء ملا عبدالعلی بحرالعلوم صحیح معنی میں علم کا ایک ایسا سمندر تھے جس کی تھاہ لگانا مشکل تھا۔ ملا نظام الدین کے شاگرد رشید ملا کمال الدین سے تکمیل علم کے بعد "فاضل بے نظیر اور جامع معقول و منقول، عالم ظاہر و باطن ہوئے اور مدت تک لکھنؤ میں فیض علم جاری رکھا اور اس کے بعد انھیں حالات کے تحت جن میں ملا حسن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا انھیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔ وہ اولاً شاہجہاں پور پھر رامپور تشریف لے گئے اور وہاں سے بوہار ضلع بردوان (بنگال) پہنچے جہاں شایانِ شان قدر افزائی ہوئی۔ بعد چندے نواب ارکاٹ نے مدراس بلوا لیا جہاں ان کی وہ قدردانی ہوئی جو چند علماء کے حصے میں آئی۔ نواب ارکاٹ نے انھیں ملک العلماء کا خطاب عطا فرمایا۔ بحرالعلوم کا خطاب انھیں مشہور زمانہ بزرگ شاہ عبدالعزیز سے عطا ہوا تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا حسن کے قیام دہلی کے دوران شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد ان سے بحث میں الجھ گئے، لیکن ملا حسن کے جوابوں سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس واپس ہو کر انھوں نے ملا حسن کے علم و فضل کی تعریف کی، جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ معقولی حدیث و قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں، کسی نے اس گفتگو کی اطلاع ملا عبدالعلی کو دی۔ جنھوں نے علم فقہ میں ارکانِ اربعہ لکھ کر شاہ صاحب کو روانہ کر دی، جسے پڑھ کر شاہ صاحب

اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے خط میں ملا عبدالعلی کو بحرالعلوم کے خطاب سے یاد فرمایا اور اس وقت سے یہ خطاب نام سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

ملا بحرالعلوم کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اور ان دونوں زبانوں میں ان کی تالیفات موجود ہیں جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور یہ تالیفات معقولات و منقولات و تصوف ہر فن میں ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: ——

ہدایت العرف۔ شرح فقہ اکبری (دونوں فارسی میں مطبوعہ)۔ شرح سُلّم العلوم (مطبوعہ)۔ شرح مسلم الثبوت (مطبوعہ)۔ حواشی بر زواہد ثلثہ، حاشیہ رسالہ میر زاہد (مطبوعہ)۔ تحریر الاصول۔ شرح مثنوی معنوی (متعدد مطبوعہ جلدیں)۔ حواشی بر میر زاہد شرح مواقف۔ حاشیہ صدرا (مطبوعہ)۔ شرح فارسی منار وحدت الوجود پر تین رسالے، رسالہ بر احوال قیامت۔ ارکان اربعہ یا رسائل الارکان (مطبوعہ)۔

مولانا کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقول مفتی عنایت اللہ صاحب "وہ معقولات میں ابن ہمام، جلال دوانی اور صدرا شیرازی سے کم نہ تھے۔"

اس دور کی تیسری بڑی ہستی مولانا احمد انوار الحق نے اپنے عہد کے بزرگ ترین علماء یعنی ملا احمد حسین ابن ملا رضا ابن ملا قطب الدین شہید، ملا عبدالعلی بحرالعلوم ابن ملا نظام الدین اور ملا حسن سے کسب علوم ظاہری حاصل کیا اور تربیتِ روحانی اپنے والد ملا احمد عبدالحق ابن ملا سعید سے پائی۔ اس طرح علوم دین کے زبردست عالم ہونے کے ساتھ وہ اپنے عہد کے بزرگ ترین صاحبِ عرفان سمجھے جاتے ہیں اور آج بھی باغ مولوی انوار صاحب میں ان سے روحانی فیضان حاصل کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔[۱۳]

ان کے فرزند ملا نور الحق جید عالم اور فاضل کامل تھے اور فرنگی محل کے ان چند علماء میں سے تھے جن کے بے شمار شاگرد تھے جن میں بعض مثلاً مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مرزا حسن علی محدث، مولانا حسین احمد محدث، مولانا اولاد حسن قنوجی (نواب صدیق حسن کے والد) اور بہت سے فرنگی محل کے حضرات خود زبردست اور صاحبِ سلسلہ عالم ہوئے ہیں۔

ملا نور الحق نے مختلف کتبِ درسیہ پر حواشی لکھنے کے علاوہ سورۂ فاتحہ کی ایک اہم تفسیر بھی لکھی۔ ملا حسن کے برادر خورد ملا ولی بھی اسی دور کے عالم ہیں۔ اپنے حقیقی ماموں ملا کمال الدین فتحپوری سے کسب علم کرنے کے بعد وہ فاضل نامدار ہوئے۔ آپ کا سلسلہ درس و تالیف تا عمر جاری رہا اور آپ کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے علماء روزگار فارغ التحصیل ہو کر مشہور زمانہ ہوئے۔ مولانا کی تالیفات میں سلّم العلوم کی شرح اور حواشیہ زاہدیہ علی الجلالیہ اور حواشی زاہدیہ علی شرح مواقف پر آپ کے حواشی مستقل ہیں۔ فرنگی محل کے اس دور کے علماء میں ملا مبین ابن ملا محب اللہ نہایت ممتاز ہیں۔ یہ یگانۂ عصر فرنگی محل کے سب سے زیادہ صاحبِ تصنیف علماء، اور بے مثل حل مطلب کرنے والے جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول واعظ و محدث تھے۔ آپ نے کتب درسیہ از اول تا آخر ملا حسن سے پڑھیں اور استاد کی موجودگی ہی میں سلسلۂ درس و تدریس شروع کر دیا اور ان کی رامپور روانگی کے بعد صحیح معنی میں ملا مبین ان کے جانشین ہوئے۔ زبردست معقولی ہونے کے باوجود ملا مبین نہایت خوش عقیدہ تھے اور اپنے چچا مولانا انوار الحق سے نہایت اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ کی تالیفات میں زیادہ کا تعلق درسیات سے ہے اور وہ تعلیقات اور حواشی پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ مستقل تالیفات میں سلم العلوم (کامل) شرح مسلم الثبوت (تا ختم مبادی کلامیہ)، حواشی زواہد ثلثہ حل بحث مثناۃ بالتکریر مذکورۂ صدرا، رسالہ فی الزکوٰۃ کنز الحسنات فی مسائل الزکاۃ، شرح اسماء حسنیٰ، ترجمہ حکایات الصالحین، وسیلۃ النجاۃ، احوال ائمہ اثنا عشری جواہر الفوائد اہمیت کی حامل ہیں۔

فرنگی محل کے تیسرے دور کے علماء میں مفتی ظہور اللہ ابن ملا ولی (پیدائش ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۰ء - وفات ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۹ مئی ۱۸۴۰ء)، ملک العلماء ملا حیدر ابن ملا مبین (وفات ۱۲ محرم ۱۲۵۶ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۴۰ء)۔ مولانا ولی اللہ (پیدائش ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۷۶۰ء - وفات صفر ۱۲۷۰ھ مطابق نومبر ۱۸۵۳ء)، مولانا ظہور علی (وفات ۳۰ رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء)، مولانا عبدالولی (پیدائش ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء - وفات ۲۲ شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۲ فروری ۱۸۸۳ء) اور ان کے کم عمر معاصرین ملا برہان الحق (پیدائش محرم ۱۲۱۴ھ مطابق جون ۱۷۹۹ء - وفات ۱۲ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء)، مفتی محمد یوسف (پیدائش ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء - وفات ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء)، مولانا عبدالرزاق (پیدائش ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۲۱ء - وفات ۵ صفر ۱۳۰۷ھ

مطابق ۱۱ر اکتوبر ۱۸۸۹ء)، مولانا نعمت اللہ (متوفی ۳ر محرم ۱۲۹۰ھ مطابق ۳ر مارچ ۱۸۸۳ء) مولانا رحمت اللہ (متوفی ۱۷ر جمادی الاول ۱۳۰۵ھ مطابق یکم فروری ۱۸۸۸ء) اور مولانا عبدالحلیم ابن مولانا امین اللہ (پیدائش ۱ر شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۱ر اپریل ۱۸۲۴ء - وفات ۲۹ر شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ر دسمبر ۱۸۶۸ء) فلک علم کے روشن ستارے تھے۔ ان حضرات میں ملا ظہور اللہ اپنے والد اور چچا ملا حسن کے لائق شاگرد تھے اور سرکار اودھ میں عہدۂ افتاء ان کے سپرد تھا۔ لیکن اس عہدے سے متعلق مصروفیات کے باوجود سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔

شاگردانِ فرنگی محل کو چھوڑ کر ان کے بیرونی اہم شاگردوں کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے اور ان کی تالیفات میں تمام کتب درسیہ خاص کر کتب فقہ پر مختلف حواشی ہیں جن میں زوائد ثلثہ پر مطول حواشی اور شمس بازغہ کے رسالہ دوحہ کی شرح خصوصیت کی حامل ہیں۔ ملک العلماء ملا حیدر ابن ملا مبین نے کتب درسیہ اپنے والد ماجد اور مفتی ظہور اللہ سے پڑھیں اور سرکار اودھ کی طرف سے اعزاز پاتے رہے لیکن کچھ انھیں اسباب کے تحت جن کے تحت ملا عبدالعلی بحر العلوم اور ملا حسن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا، انھیں بھی ترکِ وطن کرنا پڑا اور سفر حج کے بعد مستقلاً حیدرآباد میں آباد ہو گئے جہاں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہوئی۔ آپ کی تالیفات میں ایک رسالہ منطق میں، ایک رسالہ اوراد میں، ایک رسالہ کیفیاتِ حج میں اور اکثر کتب درسیہ پر حواشی ہیں۔

مولانا ولی اللہ نے مولانا عبدالقدوس ابن مفتی محمد یعقوب، مفتی ظہور اللہ اور اپنے چچا ملا مبین سے تحصیل علم کی اور ساری عمر درس و تدریس اور خدمتِ علم میں بسر کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں سے بہت کافی ضائع ہو گئی ہیں پھر بھی مندرجہ ذیل باقی ہیں:- حاشیہ بر میر زاہد۔ حاشیہ بر میر زاہد ملا جلالی، حاشیہ بر شرح ہدایت الحکمت للصدر شیرازی، حاشیہ بر حاشیۂ کمال علی شرح العقائد الجلالی، رسالۂ ایقاظہات ایک رسالہ بحث تشکیک میں، شرح سلم العلوم نفائس الملکوت۔ شرح مسلم الثبوت (دو ضخیم جلدوں میں)، حاشیہ بر میر زاہد شرح مواقف۔ آداب السلاطین یعنی رسالہ در مباحث سلطنت و ریاست، مرۃ المومنین و تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین۔ شرح غایت العلوم، شرح معارج العلوم کشف الابرار فی خصائص سید الابرار، حاشیۂ ہدایہ (چار ضخیم جلدوں میں عبادات و معاملات پر)، تذکرۃ المیزان، تکملۂ شرح سلم مولانا احمد عبدالحق، تکملۂ شرح مسلم ملا حسن، تفسیر معدن الجواہر (سات جلدوں میں)۔

ان تمام تالیفات کے علاوہ فن رجال پر مولانا کی دو اہم فارسی تصانیف ہیں یعنی عمدۃ الوسائل اور اغصان اربعہ۔ ان میں اول الذکر حضرت قطب الاقطاب حضرت سید عبدالرزاق بانسوی اور ان کے خلفاء اور ملا قطب شہید اور ملا نظام الدین کے بعض تلامذہ کے حالات میں ہے اور ثانی الذکر مولینا انوار الحق صاحب کی سوانح عمری ہے جس میں کچھ دوسرے حضرات فرنگی محلی کے حالات بھی شامل ہیں۔

مولوی ظہور علی ملک العلماء ملا حیدر کے بیٹے اور شاگرد تھے والد کی وفات کے بعد حیدرآباد چلے گئے اور وہاں بھی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ تصانیف میں علاوہ کتبِ درسیہ پر حواشی کے رسالہ معراج النبوت اور الطریقۃ الوسطیٰ فی سماع الموتیٰ اور شرح خطبۂ سلم قاضی مبارک ہیں۔

مولانا عبدالوالی، مولانا برہان الحق اور مولانا عبدالرزاق زبردست عالم ہونے کے علاوہ صوفیانِ کبار بھی تھے جن سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں اوّل الذکر اپنے نامور ماموں ملا انوار الحق کے شاگرد تھے اور بعد تحصیل علم مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ تالیفات میں کتبِ درسیہ پر حواشی ہیں۔ ثانی الذکر اپنے والد ملا انوار الحق کے شاگرد تھے اور والد کی حیات ہی میں درس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تالیفات میں مختلف کتب درسیہ پر حواشی ہیں۔ ثالث الذکر بھی مولانا عبدالرزاق میلاد رسول اکرم سے متعلق مختلف رسائل کے علاوہ حاشیہ شرح وقایہ (ناتمام)، منہج الرضوان فی قیام رمضان کشف الغفات عن امور الاموات، انوار غیبیہ، رسالہ سعد و نحس، رسالہ آدابِ مطالعہ، عمدۃ الوسائل اور اس کی شرح احسن الخصائل، رسائل دراذکار خلفاء و سبطین، گیارہ رسائل در احوال و سیر حضرت غوثیت اور دیگر چند رسائل کے مصنف ہیں۔

مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر نے کتب درسیہ اپنے والد اور کچھ کتابیں مفتی ظہور اللہ سے پڑھیں اور مدت تک وطن میں درس دیتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد عہدۂ افتاء آپ کے سپرد ہوا اور ۱۲۷۷ھ میں جون پور چلے گئے۔ تصانیف یہ ہیں: حاشیہ شرح سُلّم ملا حسن، حاشیہ شرح سُلّم

قاضی مبارک، حاشیۂ شمس بازغہ، تکملۂ حواشی ملا حسن برشمس بازغہ، حاشیۂ طبیعات شفا، حاشیۂ شرح وقایہ۔ ان کے علاوہ بخاری شریف اور بیضاوی پر تعلیقات بھی ہیں۔

مولانا کا حلقہ درس وسیع تھا اور نامور شاگردوں میں مولانا عبدالحی صاحب کے والد مولانا عبدالحلیم اور مولانا عبدالرزاق شامل ہیں۔

مولوی نعمت اللہ ابن مولوی نوراللہ ابن ملا ولی اپنے والد اور نامور چچا مفتی ظہور اللہ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں عہدۂ افتا مدتوں آپ کے سپرد رہا۔ آپ کی آخری عمر دتیا میں بسر ہوئی اور انتقال بنارس میں ہوا۔ مولانا نے اپنی تالیفات خود جلا دیں لیکن کچھ چشمۂ رحمت کالج جون پور اور مولانا عبدالحیٔ کے کتب خانے میں جو اب علی گڑھ یونیورسٹی میں ہے، موجود ہیں۔ ملّا نعمت اللہ کے بھائی مولوی رحمت اللہ نے تحصیلِ علم اپنے بھائی سے کی اور چچا مولوی ظہور اللہ کے بعد مفتیِ عدالت ہوئے اور تھوڑے عرصے کے بعد غازی پور چلے گئے اور وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت جاری کیا جو ایک اہم کالج کی شکل میں اب تک موجود ہے۔

مولانا عبدالحلیم نے تحصیلِ علم مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد یوسف، مولوی نعمت اللہ، مرزا حسن علی محدث، ملا حسین احمد محدث اور اپنے والد سے کی اور اس کے بعد عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اولاً باندہ اور جونپور کے مدارس میں درس دیتے رہے اور اس کے بعد حیدر آباد دکن میں مدرسہ سرکاری میں ملازم ہو گئے۔ مولانا کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے اور یہی حال ان کی تصانیف کا بھی ہے جن میں کم از کم ۳۳ کا ذکر تذکرۂ علمائے فرنگی محل میں کیا گیا ہے بلکہ مولانا کے مفصل حالات زندگی ان کے نامور صاحبزادے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے اپنی تصانیف مقدمہ سعایہ وعمدۃ الرعایا اور حسرت العالم بوفاۃ مرجع العالم میں بیان کیے ہیں۔

آئندہ نسل یعنی چوتھے دور میں بھی خاندان فرنگی محل نے اپنی علمی برتری اور روایات کو برقرار رکھا اور اس دور میں اس نابغۂ روزگار نے پرچم علم بلند کیا جسے دنیا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے نام سے جانتی ہے۔ مولانا کی ولادت باندہ میں ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو ہوئی۔ تحصیلِ علم اپنے والد ماجد مولانا عبدالحلیم ابن مولوی امین اللہ اور مولانا نعمت اللہ ابن مولانا نوراللہ سے کی۔ ابتدائی قیام حیدر آباد کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

مولانا نے کل انتالیس سال کی عمر پائی لیکن اس مختصر عمر میں ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے جن میں بہت سے خود بلند مقام عالم ہوئے۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد تذکرۂ علمائے فرنگی محل میں ایک سو دس بتائی گئی ہے۔ جن کا تعلق مختلف علومِ نقلیہ وعقلیہ سے ہے لیکن ان میں صرف چار ہی ایسی ہیں کہ اگر مولانا ان کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی علمی دنیا میں زندۂ جاوید ہو جاتے۔ یہ چاروں کتابیں چار مختلف علوم میں ہیں اور یہ ہیں:

(۱) مصباح الدجیٰ یعنی حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد۔ رسالے کا مبسوط حاشیہ مولانا کی وسعت نظر اور قوت علمی اور منطق میں بے مثل محقق ہونے کا گواہ ناطق ہے

(۲) سعایہ یعنی شرح وقایہ کا حل المتن حاشیہ

(۳) التعلیق الممجد یعنی موطا امام محمد کا مبسوط حاشیہ۔

(۴) ظفر الامانی جو اصول حدیث میں رسالۂ سید شریف کی شرح ہے۔ لیکن اہمیت کے حساب سے ایک مستقل تصنیف ہے۔ اس علامۂ بے نظیر کا انتقال بمرض صرع ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ (مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء) میں ہوا۔

مولانا عبدالحیٔ کے معاصر شمس العلما مولانا محمد نعیم (وفات ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۹۰۰ء) زاہد یگانہ اور عالم زمانہ تھے جنھوں نے اپنے پردادا ملا عبدالعلی بحر العلوم کی روایات کو برقرار رکھا۔ علوم فقہ اور انساب میں وہ یگانۂ عصر تھے۔ اس کے علاوہ وہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ زیادہ تر نامکمل رہیں۔ تنقید الکلام التبنۃ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی۔

مولانا عبدالوہاب بن مولانا عبدالرزاق (وفات ۲ محرم ۱۳۲۱ھ مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء) اس نسل کے ایک تیسرے جید عالم ہیں جنھوں نے اپنے دیگر بلند پایہ معاصرین مثلاً مولانا ابواحیا عبدالحلیم بن مولوی عبدالحکیم (متوفی ۱۵ شعبان ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء)، مولانا امان الحیٔ بن ملا برہان الحق (متوفی ۱۹ ربیع الاول ۱۳۰۵ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۸۸۷ء)، مولانا فضل اللہ بن نعمت اللہ (متوفی ۱۱ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء)، مولانا انعام اللہ بن مولانا ولی اللہ (متوفی رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۰۲ء)، مولانا افہام اللہ ابن مولانا انعام اللہ (متوفی ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء)، مولانا المعان الحق

بن ملا برہان الحق (متوفی ۱۵ رمضان ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء) کے ساتھ علمی روایات فرنگی محل کو برقرار رکھا۔

بیسویں صدی میں بھی فرنگی محل نے اپنی علمی روایات کو برقرار رکھا

اس دور کے علماء میں مولانا عبدالباقی بن ملا علی محمد (پیدائش ۱۸ رجب ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۸۶۹ء - وفات ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء)، مولانا محمد عظمت اللہ ابن مولانا احمد اللہ (ولادت: ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء - وفات: ۲۳ جمادی الآخر ۱۳۵۴ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء)، مولانا برکت اللہ ابن مولوی احمد اللہ (ولادت: ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء وفات: ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۲۵ء)، شمس العلماء عبدالمجید (پیدائش: ۲ صفر ۱۲۷۰ھ وفات: ۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۰ھ)، شمس العلماء مولانا عبدالحمید (پیدائش: ۱۴ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ - وفات ۱۵ شوال ۱۳۵۳ھ)، مولانا قیام الدین عبدالباری (پیدائش: ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۸۷۸ء - وفات: ۴ رجب ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء) سربرآوردہ ہیں۔

اول الذکر نے دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالحیؒ اور ان کے مایہ ناز شاگرد مولانا عین القضاۃ، مولانا نعیم اور مولانا عبدالرزاق سے دولتِ علم حاصل کی اور خود فخرِ زمانہ ہوئے۔ وطن میں جب تک قیام رہا سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں مدینہ منورہ میں قیام کے بعد یہ سلسلہ اس دیارِ پاک میں قائم رہا اور لاتعداد غیر ہندستانی بھی مولانا کے شاگردوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے جن میں سے زیادہ تر مدینہ منورہ میں تکمیل پذیر ہوئیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: حاشیۂ توضیح تلویح (ناتمام)، تکملۂ خیر العمل، حسرت الفحول فی نائب الرسول، التعلیق المحمود حاشیۂ سننِ ابی داؤد (ناتمام)، زبدۃ الخصائل شرح عمدۃ الوسائل، نور العینین فی تقبیل الابہامین عقد ذکر الشہادتین، رسالہ ذکر الشہادت سبط اصغر جواہر العبقریہ، شرح رسالۂ غوثیہ رسالہ فی جواز السمع، رسالہ فی مسئلہ علم الغیب وغیرہ۔

مولانا کے برادرِ خورد مولانا عبدالہادی صاحب (متوفی ۱۹۴۳ء) بھی ایک صاحب استغنا بزرگ، جید عالم اور صاحب تصانیف متعدد تھے۔ مولانا عظمت اللہ بن مولوی احمد اللہ نے اپنے چچا محمد فضل اللہ، ملا محمد انعام اللہ، مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور مولانا عبدالحمید سے تحصیلِ علم کی اور درسِ نظامی کے علاوہ فنونِ جدید بھی پڑھے۔ مولانا نے تین سال مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس کے فرائض بھی ادا کیے۔ آپ کی تصانیف میں نفحۃ الیمن پر حاشیہ ہے جس کا نام ازالۃ المحن ہے۔ ملاحسن، مقالات حریری وغیرہ پر بھی آپ کے حواشی موجود ہیں۔

مولانا کے برادرِ خورد مولانا برکت اللہ بھی صاحبِ استعداد عالم تھے۔ بعض کتابیں انھوں نے مولانا عظمت اللہ سے، بعض ملا انعام اللہ ابن مولانا انعام اللہ سے اور بعض مولانا عبدالباری سے پڑھیں اور مدرسۂ نظامیہ میں علوم عربیہ اور فارسی کا ایک زمانے تک درس دیتے رہے۔ تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے جن میں بعض یہ ہیں: ترجمۂ فصوص الحکم، ترجمہ تذکرۃ الاولیاء، ترجمہ درۃ الناصحین، ترجمۂ جواہر خمسہ کے علاوہ حاشیۂ قطبی و میر قطبی و حواشی مسلم حمد اللہ و ملاحسن و حواشی سُلّم العلوم و حاشیہ مراح الارواح و حاشیہ شرح جامی و حاشیۂ کافیہ، و حاشیۂ اخوان الصفا و حاشیۂ تاریخ الخلفاء و حاشیہ کسائی، حاشیۂ مسلم الثبوت، حواشی پنج گنج۔

شمس العلماء مولانا عبدالمجید ابن مولوی عبدالحلیم نے علومِ درسیہ مولانا عبدالحیؒ اور اپنے چچا مولانا نعیم سے حاصل کیے اور فاتحۂ فراغ مولانا عین القضاۃ سے پڑھا۔ مولانا فضل اللہ بن مولوی نعمت اللہ کے انتقال کے بعد کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبۂ علوم شرقیہ) میں مدرس عربی مقرر ہوئے اور وہاں تاعمر درس دیا۔

آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحمید بھی مولانا عبدالحی اور مولانا نعیم کے شاگرد تھے اور تدریس کے سلسلے میں ایک مدرسہ قدیمہ قائم کیا جو آپ کے بیٹے مفتی محمد عتیق کے زمانے تک چلتا رہا۔ اس دور کی سب سے اہم شخصیت مولانا عبدالباری ہیں جنھوں نے اپنی علمیت کے علاوہ اپنی شخصیت سے ہندستان کی سیاست کو بھی ایک اہم رُخ بخشا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس طرح وہ ایک عالم دین ہونے کے علاوہ ایک بین الاقوامی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آئے۔

مولانا عبدالباری نے مولانا عبدالحی، مولانا غلام احمد پنجابی، مولانا عین القضاۃ اور مولانا عبدالباقی جیسے جید علماء سے دولت علم حاصل کی۔

اور زمانۂ تحصیل ہی سے تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ مولانا سے قبل علماء فرنگی محل عموماً اپنے مکانوں پر درس دیا کرتے تھے۔ مولانا نے عامۂ اہل اسلام کی تعلیم کے لئے ۹ر جمادی الاول ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۹۱۴ء) کو ملا نظام الدین کے یوم وفات کے موقع پر ان کی یادگار کے طور پر مدرسۂ نظامیہ قائم کیا جو افسوس ہے کہ آزادی ہند کے بعد ختم ہوگیا۔ مولانا فرنگی محل میں ملا بحرالعلوم اور مولانا عبدالحی کے بعد سب سے زیادہ صاحبِ تصنیف ہیں اور تذکرہ علماء فرنگی محل جس میں مولانا کے حالات شرح و بسط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، میں ان کی تعداد ایک سو دس [۱۱۵] بتائی گئی ہے۔

علماء فرنگی محل جن کا امتیاز علومِ دین، خواہ معقولات ہوں یا منقولات اور خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، کی خدمت تھا اس کا آخری دور مولانا عبدالباری کے انتقال سے لے کر چند سال قبل مفتی رضا انصاری کے انتقال (۵ر فروری ۱۹۹۰ء) تک باقی رہا، اگرچہ اس کے بعد بھی مولوی حیات اللہ انصاری۔ جلال الدین عبدالمتین، ابوالکمال محمد حبیب الحلیم کے ایسے درس نظامی کے فارغ التحصیل لوگ اب بھی موجود ہیں اور نئی نسل میں طارق رشید ابن ابوطیب احمد انصاری اور ابوالحسن نظام الدین ابن عبدالعلی محمد فاخر ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے جد بحرالعلوم کے نام کو روشن کریں گے اس آخری دور میں وہ تمام علماء شامل ہیں جن کی تربیت مدرسۂ نظامیہ کے قیام کے بعد ہوئی اگرچہ ان میں زیادہ نے مدرسۂ نظامیہ ہی میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ علماء کے اس گروہ کا سربراہ مفتی عنایت اللہ صاحب کو سمجھنا چاہیئے اور اس میں مولانا محمد اسلم (متوفی ۱۹۵۲ء) مفتی عبدالقیوم محمد قاسم (متوفی ۱۹۷۷ء)، مفتی عبدالقادر (متوفی ۱۹۵۹ء)، مولوی محمد یونس بن مفتی محمد یوسف (متوفی ۱۹۲۲ء)، مولانا صبغت اللہ (متوفی ۲۴ر دسمبر ۱۹۶۴ء)، مولانا قطب الدین عبدالوالی (متوفی مئی ۱۹۵۴ء)، مولانا ابوالقاسم محمد عتیق، مولانا محمد شفیع حجت اللہ (متوفی ۷ر فروری ۱۹۶۹ء)، مولانا حیات اللہ اور مفتی محمد رضا شامل ہیں۔ اور یہ تمام حضرات درس نظامی کے منتہی اور باقاعدہ صاحب درس ہونے کے علاوہ صاحبانِ تصنیف بھی ہوئے ہیں۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے، ان حضرات کے بعد بھی علوم دین کی ترویج کا سلسلہ فرنگی محل میں باقی ہے۔ لیکن موجودہ نسل کے زیادہ تر حضرات کی توجہ عہد جدید کے معقولات کی طرف ہے۔ علماء اس وقت بھی اس خاندان میں موجود ہیں لیکن ان کے میدان علم دین سے الگ ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انور انصاری ابن مولانا محمد اسلم علم نفسیات میں ڈاکٹر اور اردو ادب کے ایم اے تھے اور انتقال کے وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور ان کی بیگم ڈاکٹر غزالہ انور اس یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم کی پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر مہدی انصاری ابن مفتی محمد ایوب جن کی تعلیم مصر میں ہوئی ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم سعیدہ مہدی لائبریری سائنس کی ڈگری رکھتی ہیں اور مولانا آزاد لائبریری سے حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہیں۔

مفتی محمد رضا انصاری نے کئی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں درس دیا۔

راقم الحروف یعنی ڈاکٹر ولی الحق ابن مولانا وجیہ الحق نے قانون اور اقتصادیات میں ایم اے کی ڈگری کے بعد فارسی ادب کی اعلیٰ ترین ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ حاصل کیے اور بارہ سال لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ کام کرنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم ڈاکٹر ساجدہ ولی الحق ڈبل ایم اے اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر تعلیم نسواں کالج لکھنؤ سے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

ڈاکٹر غوث ابن مولانا اسلم اینتھروپالوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد بغداد یونیورسٹی میں استاد ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی جنید انصاری مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاد تھے۔

ڈاکٹر نسیم انصاری ابن مولانا محمد شفیع نے کلکتہ نیشنل میڈیکل کالج سے ایم، بی، بی، ایس کرنے کے بعد انگلینڈ سے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کیا اور سال گزشتہ علی گڑھ میڈیکل کالج سے ریٹائر ہوئے اور ان کی بیگم ڈاکٹر زینت انصاری بھی اسی میڈیکل کالج سے اسی سال ریٹائر ہوگئیں۔

عصمت اللہ ابن مولوی عزت اللہ فلسفہ کے منتہی ہیں اور دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں استاد ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ جو اعلیٰ درس گاہوں میں پروفیسر رہے ہیں دیگر حضرات فرنگی محل بھی علم کے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کے بعد

اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ چنانچہ انجینئر عبدالوہاب ابن مولانا منظور الحق انصاری محکمۂ برقیات میں چیف انجینئر ہیں۔

ڈاکٹر محمد زبیر رشید الحق ابن مولانا وحید الحق ایف. آر. سی. ایس کرنے کے بعد انگلینڈ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی محمد شعیب فرید الحق اور چھوٹے بھائی محمد طلحہ حفیظ الحق بھی انجینئر ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ مولانا صبغت اللہ کے پوتے ممتاز ہاشم ابن مولانا محمد ہاشم ایگزیکیٹو انجینئر ہیں اور ان کے بڑے بھائی اقبال ہاشم ایک ڈگری کالج میں استاد ہیں۔ محمد وسیم ابن مولوی محمد شفیع پاکستان میں انجینئر ہیں۔

مولوی محمد سعید ابن حکیم امتیاز الحق کے بیٹے معین الحق انجینئر تھے اور ان کا امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے بیٹے حبیب الحق سائنٹسٹ ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کر رہے ہیں اور ان کی بڑی بہن ڈاکٹر شمیمہ انگلینڈ میں میڈیکل پریکٹس کر رہی ہیں اور ان سے چھوٹی بہن ڈاکٹر سلمیٰ جلیل سرکار ہند کے حیدر آباد کے تحقیقی سنٹر میں اعلیٰ عہدے پر سائنٹسٹ تھیں اور اب ریٹائر ہوچکیں۔ زبیدہ فاطمہ بنت مولانا جمال میاں ڈاکٹر ہیں اور لیبیا میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہیں۔

فرنگی محل کی آئندہ نسل کے بچے بھی ہونہار ہیں۔ طارق عزیز (پیدائش ۱۹۶۸ء) جو اب امریکہ میں ہیں اور ابوالحسن نظام الدین (پیدائش ۱۹۷۱ء) کا ذکر ہوچکا ہے۔ مولوی عظیم اللہ (جو اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس کے عہدے تک پہونچے تھے) کے بیٹے ندیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۰ء) دوبئی میں ملازم ہیں اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی نعیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۵ء) اور علیم حبیب اللہ (پیدائش ۱۹۵۷ء) دونوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم. بی. اے کیا اور اول الذکر دوبئی میں ہیں اور ثانی الذکر لکھنؤ میں ملازم ہیں۔ محمد سلیم انوار الحق ابن پروفیسر ولی الحق (پیدائش ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۴ء) نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم. بی. اے کیا ہے اور لکھنؤ میں ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور ان کی بہن وریمن۔ (پیدائش ۱۹۶۸ء) نے بھی ایم. بی. اے کیا اور اپنے شوہر شکیل احمد ہاشمی جو خود بھی ایم بی اے ہیں اور ٹاٹا کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں، کے ساتھ کلکتہ میں مقیم ہے۔ محمد شعیب فرید الحق کی بیٹی صبا (پیدائش ۱۹۷۰ء) ایم ایس سی کرچکی ہے اور بیٹا فرخ (پیدائش ۱۹۷۳ء)

علی گڑھ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہے ——— ان کے علاوہ خاندان کے اور تمام بچے بھی تعلیمی مدارج اس طرح طے کر رہے ہیں کہ ان سے آئندہ بہت کچھ توقعات کی جاسکتی ہیں۔ بہرحال علم خاندان فرنگی محل کا طرۂ امتیاز تھا اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

فرنگی محل میں دینی ظاہری تعلیم کے علاوہ روحانی تعلیم اور تزکیۂ نفس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا۔ خاندان کے جد اعلیٰ خواجہ عبداللہ انصاری زبردست صوفی تھے اور صوفیوں کے حالات میں ایک اہم تذکرے کے مصنف بھی اور ان کے پہلے جابر کا مقرب باری کا لقب ان کی روحانیت کی دلیل ہے اور ان کی اولاد میں متعدد حضرات کے ناموں کا جز "پیر" ثابت کرتا ہے کہ ان کے بعد بھی یہ روحانی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی اولاد میں ہندستان آنے والے پہلے بزرگ قطب عالم علاء الدین کا نام بھی ان کے روحانی مرتبے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سہالی سے فرنگی محل آنے کے بعد بھی علماء فرنگی محل میں سے بیشتر کی توجہ علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کی طرف بھی رہی اور اس میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کی تربیت کو خاص دخل ہے۔ ادارہ فرنگی محل کے بانی ملا نظام الدین، ان کے بھائی ملا رضا (جو ابتدا میں بڑے بھائی کی شاہ صاحب سے ارادت کی وجہ سے سخت نالاں تھے) اور بھتیجے ملا احمد عبدالحق شاہ سید عبدالرزاق بانسوی کے خصوصی مرید تھے اور آخر الذکر کے بیٹے مولانا انوار الحق جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عارف کامل بھی تھے اور یہی ان کے بیٹے ملا نور الحق اور نواسے مولانا عبدالولی کا بھی حال تھا۔ ان حضرات کے علاوہ دوسرے حضرات خاندان میں بھی ذوقِ تصوف مزاج کا حصہ بنا ہوا تھا اور اس فن میں ان کی تصانیف موجود ہیں جن میں ملا بحر العلوم کی متعدد جلدوں پر مشتمل شرح مثنوی معنوی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ زمانۂ حال میں مولانا نجیب اللہ ابن مولانا منیع اللہ نے بھی مشغلۂ علمی ترک کر کے طریقۂ تصوف اختیار کیا تھا۔

خاندان فرنگی محل کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ پشتوں لکھنؤ میں رہنے کے بعد بھی اس کے افراد نے کبھی اپنے کو لکھنوی نہیں لکھا اور گھروں میں قصباتی روایات کو برقرار رکھا۔ اس کے باوجود اس کا اردو ادب سے گہرا رشتہ ہے اور اردو کے کچھ عظیم ترین شعراء کو اس خاندان کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ چناں چہ ملا ولی ابن قاضی غلام مصطفےٰ ابن ملا اسعد

کے شاگردوں کی فہرست میں میر انشاء اللہ خاں انشا کا نام بھی ملتا ہے۔

انشا ہی کی طرح مکتبِ لکھنؤ کے بانی شیخ امام بخش ناسخ کو بھی مُلّا نورالحق (اور شاید ملا مبین سے بھی) شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان کے علاوہ حضرات فرنگی محل میں بھی متعدد حضرات کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ ان میں سب سے پہلا نام مولوی غضنفر ابن ملک العلماء ملا حیدر (متوفی ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء) کا ہے جو ضیغم تخلص فرماتے تھے اور عموماً نعت کہتے تھے۔ فرنگی محل کے شعراء میں دوسرا نام مولانا امان الحق ابن مولانا برہان الحق (متوفی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء) کا ہے جن کا تخلص انور تھا۔ انھیں فارسی میں مہارت کامل حاصل تھی، اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

مولوی محمد حسین بن مولوی محمد شاکر (متوفی ۲۰ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) متین تخلص فرماتے تھے اور کچھ زمانہ قبل تک ان کا دیوان موجود تھا اس کے علاوہ مناقب رزاقیہ (مولفہ ملا نظام الدین) کا بھی منظوم ترجمہ کیا جس کا نام گلستانِ طریقت رکھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب کراماتِ غوثیہ نظم کی۔

مولانا انعام اللہ ابن مولانا ولی اللہ (متوفی رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء) کا تخلص انعام تھا۔ ان کا بھی اُردو اشعار کا دیوان کچھ عرصہ قبل تک مولانا روح اللہ صاحب کے پاس موجود تھا۔ وہ وزیر علی صبا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ مولانا حبیب اللہ ابن مولوی مسیح اللہ (متوفی جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء) حبیب تخلص کرتے تھے اور منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ دیوان منتشر صورت میں کچھ زمانہ قبل تک موجود تھا۔ افسوس ہے کہ مذکورہ پانچوں حضرات کا کلام اب بظاہر نایاب ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ کم از کم تین دوسرے شاعر جن کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا ان کا کلام ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا اور اب بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔ ان میں پہلے مولوی فصیح اللہ بن مولوی عظیم اللہ (متوفی ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء) وفا تخلص کرتے تھے اور وزیر علی صبا کے شاگرد تھے۔ ان کے دونوں دیوان مطبوعہ تھے اور تیسرے کی طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔

انھیں خوش قسمتوں میں دوسرے شاعر مولانا عبدالاحد شمشاد بن مولوی عبدالرحیم (ولادت ۲۳ صفر ۱۲۶۶ھ۔ وفات ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء) تھے۔ آپ آفتاب الدولہ قلق، مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری اور سید محمد جعفر حسین کاشف سے مشورہ سخن فرماتے تھے اور تین مطبوعہ دیوان یادگار ہیں۔ مولانا برکت اللہ رضا بن مولوی احمد اللہ کا کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ آپ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام پر خواجہ عزیز الدین عزیز مرحوم اور اُردو کلام پر مولانا انعام اللہ انعام اور منشی امیر احمد امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ مولانا کا ایک اُردو دیوان طبع ہو چکا ہے اور بقیہ کچھ زمانہ قبل تک مرتب موجود تھا۔ مولانا برکت اللہ کے معاصرین میں مولانا نجیب اللہ نجیب ابن مولانا مسیح اللہ خواجہ عزیز الدین عزیز کے شاگرد اور فارسی کے زبردست عالم تھے اور ایک مدت تک مدرسہ عالیہ نظامیہ میں فارسی کا درس دیتے تھے آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا فارسی کلام تھوڑا بہت اب بھی ملتا ہے۔ مولانا انعام اللہ (متوفی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۸۹۹ء) کا نام بھی شعراء فرنگی محل کی فہرست میں داخل ہے۔

عصر جدید میں جناب انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کا فرنگی محل سے بہت گہرا تعلق رہا۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا عبدالرزاق صاحب اور مولانا عبدالوہاب صاحب سے ارادت مندی کی بنیاد پر اکثر فرنگی محل میں قیام پذیر رہتے تھے۔ ان کے اثرات نے حضرات فرنگی محل میں شعر گوئی کے جذبے کو بیدار رکھا اور اس عہد کے متعدد حضرات شعر اور اچھے شعر کہا کرتے تھے۔ ان شعراء میں مولانا روح اللہ ابن مولانا محب اللہ (متوفی ۲۰ جولائی ۱۹۶۳ء)، مولانا صبغت اللہ شہید بن مولانا ہدایت اللہ (متوفی ۱۳ اگست ۱۹۷۲ء)، ان کے بھائی حکیم ارادت اللہ حکیم (متوفی ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء)، مولانا ظہور الحق ظہور ابن مولانا فضل حق (متوفی ۱۹۴۲ء) اور مولانا اسد حسین اسد (متوفی؟) شامل ہیں۔

دورِ جدید میں راقم الحروف یعنی ڈاکٹر ولی الحق ابن مولانا وجیہ الحق فرنگی محل کی شاعرانہ روایات کو سنبھالے ہوئے ہے اور اپنے پردادا مولانا امان الحق انور کی پیروی کرتے ہوئے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا ہے اور تاحال دو فارسی کے مجموعہ کلام "شعلہ ادراک" اور "خرمنِ گل" شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر میں فارسی غزلیات اور مختلف نظمیں شامل ہیں اور ثانی الذکر چند غزلوں اور قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے۔ اُردو میں تاحال چار دیوان شائع ہوئے ہیں جن میں پہلا اور تیسرا غزالان خیال اور شاہدان معانی تمام تر غزلیات اور فارسی اشعار کے اُردو تراجم پر مشتمل ہیں۔

ان کے علاوہ تین دوسرے مجموعے طباعت کے لئے تیار ہیں۔ یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ دورِ جدید میں فرنگی محل میں ذوقِ شعرگوئی مردوں تک محدود نہ تھا مستوراتِ فرنگی محل بھی شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور ان میں صغریٰ فاطمہ بنتِ مولانا عبدالباری ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ ان کا کچھ کلام جو زیادہ تر نعتوں پر مشتمل ہے ان کے بھائی مولانا جمال میاں نے شائع بھی کروا دیا تھا۔

اردو نثر، صحافت اور طباعت کے میدانوں میں بھی علماء فرنگی محل نے حصہ لیا اور متاخرین فرنگی محل میں اکثر کی تالیفات اسی زبان میں ہیں۔ مولانا برکت اللہ رضا نے متعدد عربی کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ مولانا عبدالرزاق صاحب نے اپنے میلاد کے رسائل اسی زبان میں لکھے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے فن رجال میں تذکرہ علماء فرنگی محل اُردو میں لکھا۔ مولانا صبغت اللہ شہید نے اپنے چچا اور استاد مولانا عنایت اللہ صاحب کی سوانح عمری "صدر المدرسین" کے نام سے اردو ہی میں لکھی اور مولانا حیات اللہ صاحب کی تمام نگارشات اُردو ہی میں ہیں۔ موصوف اُردو زبان کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں اور ان کے ضخیم ناول "لہو کے پھول" کا شمار اُردو کے بہترین نثری ادب میں کیا جاتا ہے۔

مفتی محمد رضا انصاری کی تمام تالیفات بشمول "بانیِ درسِ نظامی" اور شاہ عبدالرزاق صاحب کی سوانح عمری اردو زبان ہی میں ہیں اور مولانا مفتی عبدالقادر صاحب کے فتوے جنھیں مفتی رضا صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اسی زبان میں ہیں اور راقم الحروف (ولی الحق انصاری) کے بہتیرے تحقیقی مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، یا مختلف کانفرنسوں میں ہندوستان میں پڑھے گئے ہیں اُردو زبان ہی میں ہیں۔

اس عہد میں فرنگی محل کی خواتین بھی اُردو کی خدمت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق کا مطبوعہ تحقیقی مقالہ اُردو سے متعلق اور اُردو زبان میں ہے۔ مولانا نور میاں مرحوم کی صاحبزادی نزہت فاطمہ نے آتش لکھنوی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور مولانا ولی اللہ صاحب کی تالیف الطفان اربعہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مفتی رضا صاحب کی صاحبزادی فرزانہ رضا کی اُردو نگارشات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اور خواتین بھی اُردو میں اعلیٰ ڈگریاں رکھتی ہیں۔ ان میں مولانا فضل حق صاحب کی نواسی صبوحی اور بیگم مولوی محمد فاخر قابلِ ذکر ہیں۔

صحافت کے میدان میں بھی فرنگی محل پیچھے نہیں رہا۔ یہاں سب سے پہلے مولوی محمد یعقوب بن مولوی محمد عیسیٰ بن مولوی محمد یوسف (متوفی ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء) نے اپنا اخبار "کارنامہ" نکالا جو مدت دراز تک ادبی خدمت کرتا رہا۔ تحریکِ خلافت سے قبل یہاں سے مولوی صبغت اللہ صاحب کی ادارت میں "النظامیہ" جاری ہوا۔ لیکن چار سال کے بعد سرکاری حکم سے اسے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھیں کی ادارت میں اخبار "خادم الحرمین" نکالا گیا جو انجمن خدام الحرمین کا آرگن تھا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کا بھی فرنگی محل سے گہرا تعلق رہا ہے اور مفتی رضا صاحب ایک زمانے میں اس کے روحِ رواں تھے اور پارٹی آرگن "نیا ادب" سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ مفتی رضا صاحب نے "قومی آواز" میں بحیثیت سب ایڈیٹر مدتوں کام کیا۔ مولانا حیات اللہ صاحب آزادیٔ ہند سے پہلے کانگریس پارٹی کے نقیب ہفتہ وار "ہندوستان" کے ایڈیٹر تھے اور آزادی ہند سے کچھ پہلے کانگریس کا روزنامہ "قومی آواز" انھیں کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور انھوں نے اُردو صحافت کو ایک نیا تصور بخشا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۶ء میں مولانا جمال الدین عبدالوہاب نے "ہمدم" اخبار خرید لیا تھا اور وہ تقریباً ایک سال تک ان کی ادارت میں چلتا رہا۔ اسی زمانے میں (یعنی آزادی سے قبل) اسد حسن اسد انصاری نے ایک رسالہ موسوم بہ قیام الدین نکالا اور اس کے بند ہونے کے بعد ایک دوسرا رسالہ "میخانہ" نکالتے رہے۔

علم کی ترویج کے سلسلے میں فرنگی محل میں مختلف زمانوں میں مختلف پریس بھی قائم کیے گئے۔ مولوی یعقوب حسن صاحب نے "کارنامہ" کے سلسلے میں اس کا پریس بھی قائم کیا تھا اور علماء فرنگی محل کی بہت کافی کتابیں اس پریس میں طبع ہوئیں۔ مولانا عبدالحی صاحب کے داماد مولوی محمد یوسف (متوفی ۶ صفر ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء) نے مطبع یوسفی قائم کیا جس میں ابتدا میں مولانا عبدالحی صاحب کی تالیفات چھپی تھیں لیکن بعد کو عام طباعت کا

انتظام ہوگیا تھا۔ یہ پریس ان کے بیٹے مولوی محمد ادریس کے زمانے میں بند ہوگیا تھا۔ مفتی محمد عتیق صاحب نے بھی اپنی کتابوں کی طباعت کے لیے ایک پریس قائم کیا تھا اور ۱۹۴۶ء میں مولانا جمال میاں نے ہمدم پریس خرید لیا تھا لیکن یہ دونوں پریس زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکے۔

علماء فرنگی محل نے ابتدا میں اپنے کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن اکثر ایسے مواقع آگئے جب ان کو درباری سیاست کا نشانہ بنانا پڑا۔ انھیں حالات کے تحت ملا بحر العلوم، ملا حسن اور ملک العلماء ملا حیدر کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی کچھ حضرات ایسے بھی تھے جنھیں دربار سے منسلک رہنے پر مجبور بھی کیا جاتا تھا۔ جہاد مولوی امیر علی کے سلسلے میں مولانا برہان الحق صاحب اور مولانا عبد الرزاق صاحب نے عملی حصہ لیا اور مولوی امیر علی صاحب کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دیئے۔ موجودہ معنی میں عملی سیاست میں علماء فرنگی محل نے پہلی عالمی جنگ کے بعد حصہ لینا شروع کیا جب اتحادیوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر دیے اور اس سلسلے میں فرنگی محل سے مولانا عبد الباری صاحب کی سربراہی میں تحریکِ خلافت شروع کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی سربراہی گاندھی جی نے سنبھال لی تھی۔ خلافت کے خاتمے کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں جو منافرت پیدا ہوئی ویسا ہی جذبہ برادرانِ وطن کے دلوں میں بھی موجود تھا اور اسی جذبے نے دونوں مذہبی گروہوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کر دیا۔ اس اتحاد کی بنیاد رکھنے والے مولانا عبد الباری صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔

اس عہد میں فرنگی محل ہندستانی سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی کے سیاسی حالات میں مشورے فرنگی محل ہی میں ہوا کرتے تھے اور آج تک فرنگی محل میں وہ کمرہ محفوظ ہے جہاں گاندھی جی قیام پذیر ہوتے تھے۔ تحریکِ ترکِ موالات شروع ہونے پر دیگر زعمائے قوم کے ساتھ علمائے فرنگی محل نے بھی اس میں عملی حصہ لیا اور ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو پنڈت نہرو اور چودھری خلیق الزماں کے ساتھ مولانا شرافت اللہ صاحب نے بھی قید و بند کے مصائب برداشت کیے اور مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد شفیع حجت اللہ جو کلکتہ میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے نومبر ۱۹۲۲ء میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک سال تک بہرام پور جیل مرشد آباد میں قید رہے۔ ان کے علاوہ بہت سے حضرات نے انگریزوں کے تحت ملازمت کرنا یا انگریزی تعلیم حاصل کرنا ترک کر دیا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے سے حضرات فرنگی محل کی سیاست میں دل چسپی بڑھ گئی۔ یہاں ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے کانگرس سے اپنی وابستگی باقی رکھی، اس گروہ کے سربراہ حیات اللہ انصاری صاحب تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے کانگریس کی پالیسیوں سے غیر مطمئن ہو کر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ کے ساتھ اس جماعت کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس گروہ کے سربراہ مولانا عنایت اللہ صاحب اور مولانا جمال میاں تھے۔

۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ایک ایسا گروہ اور ظہور پذیر ہوا جس کے خیالات اشتراکی تھے۔ اس گروہ میں عموماً نوجوانانِ فرنگی محل شامل تھے جن میں مفتی رضا فرنگی محلی اور انور انصاری قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو بظاہر عملی سیاست میں دل چسپی نہیں لے رہے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد مسلم لیگی اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے جنھوں نے پاکستان کی حمایت کی تھی، پاکستان چلے گئے یا اپنی غلطی کا احساس کر لیا۔

اور اب حضراتِ فرنگی محل سچے ہندستانیوں کی طرح سیاست میں صحیح سمت جا رہے ہیں۔

□□

حواشی:

۱؎ "تذکرۃ الحفاظ" میں امام ذہبی نے "بن منصور بن مت انصاری الہروی ذریۃ ابی ایوب انصاری" اور "طبقات حنابلہ" میں "بن منصور بن مت الانصاری الہروی ولد ابی ایوب زید بن خالد الانصاری" لکھا ہے اور مولانا حاجی "ابو منصور مت پسر ابو ایوب انصاری" لکھتے ہیں۔ اس لیے "مت" (یا "مات") حضرت ابو ایوب کے بیٹے یا پوتے ہو سکتے ہیں۔ ذہبی اور ابن رجب دونوں نے "منصور بن مت" لکھا ہے جو غالباً درست نہیں ہے۔

۲؎ رجال کی مختلف عربی و فارسی کتابوں کے علاوہ شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری کے حالات زندگی فرانسیسی عالم بارکوئی کی "شیخ الاسلام کی زندگی" پر فرانسیسی

زبان کی تالیف یا اس کے فارسی ترجمے "سرگذشت پیر ہرات" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

[3] یہ شجرہ وہی ہے جو تذکرۂ علمائے فرنگی محل میں دیا ہے (دیکھئے علمائے فرنگی محل ص۳۵) اس کے مطابق "عبداللہ ابن منصور محمد ابن جعفر ابن ابی معاذ ابن محمد" ہے۔ "تذکرہ الحفاظ" میں "عبداللہ بن محمد بن علی بن محمد" ہے اور طبقات حنابلہ میں "عبداللہ بن محمد بن علی بن محمد" ہے۔

[4] چشتیہ بہشتیہ، تالیف شیخ علاء الدین چشتی برناوی (بعد الشوال ۱۰۰۰ھ)، قلمی نسخہ ملک شیخ محمد احمد انصاری رئیس شیخ پورہ برناوا۔ اس سلسلے میں مزید اطلاعات کے لیے مفتی عنایت اللہ صاحب کے تذکرۂ علمائے فرنگی محل کے مولوی محمد حامد انصاری کے ترتیب دیئے ہوئے نئے ایڈیشن بنام "علمائے فرنگی محل" کے لفظ اور راقم الحروف کے "اختتامیہ" کو پڑھنے کی زحمت کی جائے۔

[5] یہ شجرہ وہی ہے جسے مولانا انعام اللہ نے اغصان اربعہ کے مطبوعہ ضمیمہ میں پیش کیا ہے اور جس پر اکابرین فرنگی محل متفق ہیں (دیکھئے علمائے فرنگی محل ص۳)۔ بارکوئی کی تالیف کے فارسی ترجمے "سرگذشت پیر ہرات" کے آخر میں اخلاف پیر ہرات کے عنوان کے تحت ایک موجودہ ہراتی خاندان کا شجرہ پیش کیا گیا ہے جس کے مورث اعلیٰ بھی جابر مقرب باری ہیں۔ یہ شجرہ خواجہ پیر حبیب اللہ کے بعد دونوں شاخیں جدا ہوتی ہیں۔

[6] علمائے فرنگی محل ص۴۱، پیش لفظ و اختتامیہ۔

[7] علمائے فرنگی محل ص۴۱، پیش لفظ، اختتامیہ۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں مخدوم علاء الدین برناوی اور قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی کو ایک دوسرے سے غلط ملط کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطب عالم خواجہ علاء الدین ہرات سے آکر اپنے عزیزوں کے ساتھ برناوا میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہ برناوا ہی میں دفن ہوئے ان کے ہمنام مخدوم علاء الدین کا وطن اگرچہ برناوا تھا لیکن ان کا انتقال راپڑی ضلع میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہیں (دیکھئے چشتیہ بہشتیہ)

[8] علمائے فرنگی محل ص۴۱ روضہ میں حقیقتاً شیخ نظام الدین ابن قطب عالم خواجہ علاء الدین الانصاری الہروی کا مزار ہے نہ کہ مخدوم علاء الدین کے بیٹے مخدوم نظام الدین کا (جیسا کہ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں ص۹۸ پر درج ہے)

جو اپنے والد اور دادا کی طرح راپڑی ضلع مین پوری میں دفن ہیں، اور بقول مؤلف چشتیہ بہشتیہ ان کے زمانے تک مخدوم نظام الدین کی اولاد وہیں مقیم تھی۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں جس طرح مخدوم علاء الدین برناوی اور خواجہ علاء الدین ہروی کو غلط ملط کیا گیا ہے اسی طرح ان کے ہمنام بیٹوں کو بھی ایک ہی سمجھ کر غلط ملط کیا گیا۔

[9] شجرہ یہ ہے: ملا قطب الدین شہید بن ملا عبدالحلیم بن ملا عبدالکریم بن شیخ الاسلام ملا احمد بن ملا حافظ بن شیخ فضل اللہ بن شیخ محی الدین بن شیخ شرف الدین (عرف بڈھ) بن شیخ نظام الدین۔

[10] مآثر الکرام، دفتر اول (مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ ص۲۰۹

[11] حالات شہادت کے لیے دیکھئے مآثر الکرام ص۲۰۹ رسالہ قطبیہ (قلمی)، علمائے فرنگی محل ص۳۶-۴۰

[12] مآثر الکرام نیز علمائے فرنگی محل ص۲۹۸ تا ص۲۶۲ دیکھئے۔ 'بانی درس نظامی'، مفتی رضا انصاری کا ملا نظام الدین پر ایک تحقیقی مقالہ۔

[13] مولانا انوار الحق صاحب کے مکمل حالات کے لیے مولانا ولی اللہ صاحب کی اغصان اربعہ سے رجوع کیا جائے۔

[14] کتابوں کے نام، علمائے فرنگی محل (یعنی تذکرۂ علمائے فرنگی محل کے جدید اڈیشن) میں ص۱۹۸ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

[15] مولانا کی تصانیف کی فہرست اور نام تذکرہ علمائے فرنگی محل یا اس کے جدید ایڈیشن میں صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳ دیکھے جا سکتے ہیں۔

[16] پوری فہرست علمائے فرنگی محل میں ص۸۹ پر دیکھی جا سکتی ہے نیز تذکرہ علمائے فرنگی محل (از مفتی عنایت اللہ) میں ص۴۳ پر دیکھئے۔

[17] مولانا عبدالباری صاحب کی تصانیف کے نام تذکرۂ علمائے فرنگی محل یا اس کے جدید ایڈیشن "علمائے فرنگی محل" میں صفحات ۸۱-۸۲ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

[18] مولانا حسرت موہانی کا انتقال بھی فرنگی محل ہی میں ہوا اور فرنگی محل کے خاندانی قبرستان باغ مولوی انوار صاحب میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

[19] مفتی رضا انصاری صاحب بعد کو اس تحریک سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔

□□

ڈاکٹر نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

لکھنؤ کی یادگار مجلسیں

پُرانے دنوں کی جو مجلسیں مجھے آج بھی یاد ہیں ان کا سلسلہ تقسیم ہند کے کچھ قبل سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اودھ میں زمین داریوں، جاگیرداریوں اور رجواڑوں کی کمی نہیں تھی۔ لکھنؤ کے پُرانے رئیسوں اور وثیقہ داروں کے پاس دولت گھٹ جانے کے بعد بھی بہت تھی اس لیے مجالسِ عزا میں بڑے اہتمام ہوتے تھے جن کا اظہار امام باڑوں کی آرائش اور اس سے بھی زیادہ تبرک کی تقسیم میں ہوتا تھا۔ پُرانے گھروں کے بہترین نوادر، خواہ وہ جھاڑ فانوس ہوں یا انوکھی دیوارگھڑیاں، یا قیمتی آئینے یا تاریخی اسلحہ یا خطاطی کے اعلیٰ نمونے۔ دیوان خانوں اور ملاقاتی کمروں سے زیادہ امامباڑوں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ تبرک بھی حسبِ توفیق بہتر سے بہتر ہوتا تھا۔ میرے یہاں تانبے کی ایک بڑی قلعی دار لگن تھی جس میں تین چار کلو آٹا گوندھا جا سکتا تھا۔ اس لگن میں کسی تعلقے سے کھیر کا تبرک آیا تھا۔ شاہی اوقاف اور بڑے رئیسوں کے یہاں کی مجلسوں کا تبرک اصل مجلس سے بہت پہلے دعوتی رقعوں کے ساتھ تقسیم ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر خاصگی کھانوں کے پورے پورے خوان ہوتے تھے اور یہ شہر کے خاص خاص لوگوں کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ اصل مجلس میں الگ سے تبرک کی عام تقسیم ہوتی تھی۔

عشرۂ محرم کی مجلسوں میں حسینیۂ غفران مآب، مدرسۂ ناظمیہ، قصرِ حسینی، حسینیۂ سید تقی صاحب وغیرہ کی مجلسیں بہت مقبول تھیں۔ حسینیۂ غفران مآب میں عمدۃ العلما، مولانا سید کلب حسین عرف کبن صاحب مرحوم پڑھتے تھے لکھنؤ کی فصیح زبان کے ساتھ ان کی پختہ آواز، جو کبھی گرفتہ نہیں ہوتی تھی، مجلس میں ایک شان پیدا کرتی تھی۔ عاشورے کا دن گزر کر اسی امامباڑے میں وہ شام غریباں کی مجلس کو خطاب کرتے تھے جو ننگی زمین پر اندھیرے میں ہوتی تھی۔ یہ مجلسیں آج بھی ہوتی ہیں اور آج بھی ان میں بڑا مجمع ہوتا ہے۔

مدرسہ ناظمیہ میں مولانا ابرار حسین صاحب پاروی مرحوم پڑھتے تھے مجلس سے پہلے سامعین میں تازہ بھرے ہوئے حقّے گردش کرتے رہتے تھے اور عمدہ لکھنوی تمباکو کی خوشبو سے عمارت کے دالان بھر جاتے تھے۔ مجلس شروع ہونے کے وقت حقّے ہٹا دیے جاتے تھے اور پاروی صاحب منبر پر بیٹھتے۔ سفید ململ کے انگرکھے میں ان کا بدن خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ذاکری میں بھی ایک کیفیت تھی۔ مصائب پڑھنے میں کبھی کبھی ان کی آواز تقریباً غائب ہو جاتی تھی لیکن ان کے چہرے کے تاثرات اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

قصرِ حسینی کی مجلس سہ پہر کو ہوتی تھی۔ اس کے بانی مرحوم اکبر حسین زری والے تھے۔ یہاں مجلس سے قبل نفیس کشمیری چائے تقسیم ہوتی تھی۔ یہاں سید نجم الحسن نثار مرحوم پڑھتے تھے جو نثر خوانی کے آخری کامل استاد تھے۔ نثر خوانی کی مجلس میں نثر کے جملوں کے ساتھ، مگر ان سے کچھ زیادہ اشعار، خصوصاً مرثیوں کے بند پڑھے جاتے تھے۔ نجم الحسن مرحوم کی آواز ہمیشہ گرفتہ رہتی لیکن پوری مجلس کو بخوبی سنائی دیتی تھی۔ وہ نثر کے جملے آہستہ آہستہ ہموار لہجے میں ادا کرتے، پھر اچانک ان کے تیور بدل جاتے، آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور وہ پوری قوت اور عجب کیفیت کے ساتھ مرثیوں کے بند پڑھتے۔ میں نے مرثیوں کی بہترین خوانندگی انھیں سے سُنی۔ (ایک بار میں نے اپنے ایک بزرگ مرثیہ خوان سے دریافت کیا کہ آپ لوگ نجم الحسن صاحب کے سے زور شور کے ساتھ مرثیہ کیوں نہیں پڑھتے۔ انھوں نے

کہاکہ ایک تو نثر خوانی کی مجلس مقابلۃً مختصر ہوتی ہے، دوسرے نثّاروں کو نثر کے فقروں کی وجہ سے سستانے کا موقع مل جاتا ہے اور لگاتار پانچ چھ بند سے زیادہ نہیں پڑھنا پڑتے، اس لیے وہ پوری قوت سے پڑھتے نثر کے فقروں میں آرام کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ اگر سوڈیڑھ سو بند کا مرثیہ مسلسل اسی زور اور قوت کے ساتھ پڑھیں تو کلیجہ پھٹ جائے")۔

قصرِ حسینی کی ان مجلسوں میں عزادار بڑے شوق سے آتے اور ہر مجلس سے پہلے انھیں تجسس رہتا تھا کہ آج نجم الحسن صاحب کیا پڑھیں گے۔ کسی کسی دن وہ پوری مجلس دیہاتی بولی میں پڑھتے۔ مرثیوں کے بند اور دوسرے اشعار بھی اسی بولی میں اور اسی فراوانی کے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی مجلس میں وہ حسینی جماعت کے مجاہدوں اور یزیدی لشکر کے سپاہیوں اور سرداروں کے نام گنانے پر آتے تو قریب قریب پوری مجلس اسی میں ختم ہو جاتی تھی۔ صرف شروع اور آخر میں فضائل، مصائب اور اشعار ہوتے۔ یہ اسرار سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی تعارف کے بغیر محض ناموں کی فہرست سناتے چلے جاتے اور مجلس پر ایک جوش کا عالم طاری ہو جاتا۔ کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ منبر پر ان کے بیٹھنے کے ذرا ہی دیر بعد عزاخانے کے باہر تک خبر پھیل جاتی کہ آج کی مجلس میں وہ زعفر جن کا حال پڑھ رہے ہیں، اور دور دور سے لوگ قصرِ حسینی کی طرف لپکتے دکھائی دیتے۔ یہ نثّار مرحوم کی بہترین اور مقبول ترین مجلس تھی اور لوگ بے چینی سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ زعفر جن کے حال میں میر عشق کا شاہکار مرثیہ "عروج لے مرے پروردگار دے مجھ کو" اس کی بنیاد بنتا تھا۔ مرثیہ کا ڈرامائی بیانیہ اور نثّار مرحوم کے چہرے کے تاثرات ابتدا ہی میں ایک حزن اور ہراس کی فضا قائم کر دیتے تھے۔ ایک مسافر سمندری سفر میں طوفان کا شکار ہو کر تختے کے سہارے بہتا ہوا ایک ویران جزیرے میں پہونچتا ہے :

کوئی درخت نہ آدم نہ جانور دیکھا — عجیب عالمِ عبرت اِدھر اُدھر دیکھا
بڑھا جب آگے عجب شخص پر خطر دیکھا — خموش بیٹھے ہوئے اس کو خاک پر دیکھا
رواں تھے اشک برابر زمین پر اُس کے
پڑے تھے بال سراسر زمین پر اُس کے

یہ زعفر جن ہے جو کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی نصرت کو پہونچا تھا لیکن امامؑ نے اسے واپس کر دیا تھا۔ اب وہ سیکڑوں برس سے اس غیر آباد جزیرے میں سوگ نشین ہے۔ وہ مسافر سے کہتا ہے ؎

خبر کسی کو نہیں ہے وہ عالم دانا — کہاں تھی راہ، ہُوا کس طریق سے آنا
بدن میں روح کو بس شاق ہے ٹھہر جانا — مگر ہے سرحدِ ملکِ عدم یہ ویرانا
اُداس دھوپ، اُندھی چاندنی نکلتی ہے
ہوا ہمیشہ یہاں ڈر سے تیز چلتی ہے

میدان کربلا کا منظر بیان کرتا ہے ؎

عجب طرح کا مرقع، عجیب عالم نور — اُدھر ستم تو اِدھر صبر، شانِ حق کا ظہور
کھلے ہوئے درِ افلاک دشتِ کیں معمور — ہر ایک سمت کو فوجیں مگر حسینؑ سے دُور
سپاہِ شام نے مہرِ علیؑ کو گھیرا تھا
چراغ بیچ میں چاروں طرف اندھیرا تھا

اور اس بند سے مجلس میں گریے کا سلسلہ شروع ہوتا جو آخر تک نہ رُکتا تھا

پیمبرانِ اولوالعزم تھے حسینؑ کے پاس — جنابِ آدمؑ و نوحؑ و خلیلؑ رتبہ شناس
کلیمؑ و حضرتِ عیسیٰؑ میانِ عالم یاس — محمدؐ عربی پیشِ ذوالجناح اداس
لپٹ لپٹ کے رسولِ جلیلؐ روتے تھے
رکاب تھامے ہوئے جبرئیلؑ روتے تھے

نثر خوانی کی جس مجلس میں لٹے ہوئے حسینی قافلے کی مدینے میں آمد کا حال بیان ہوتا تھا وہ بھی سننے والوں کے کانوں میں کئی دن تک گونجتی رہتی تھی۔ میر مونس کے مرثیے "وطن میں قافلۂ کربلا کی آمد ہے" کے بند اس مرثیے کی جان ہوتے تھے۔ اہلِ مدینہ کو شہادتِ حسینؑ کی خبر نہیں، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ امام اپنے انصار و اعزا اور اہلِ حرم کے ساتھ وطن واپس آرہے ہیں۔ مدینے میں استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اس وقت اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ ؎

نہ وہ رفیق، نہ وہ بھائی بند آتے ہیں
جھکائے گردنیں کوتل سمند آتے ہیں

پھر شہیدوں کے بے سوار گھوڑے نظر آتے ہیں۔ سب سے آگے عباسؑ علمدار کا گھوڑا ہے جس کے ساتھ سپاہِ حسینی کا علم بھی ہے ؎

لہو کے چھینٹوں سے دامن علم کا افشاں تھا
علم وہ کیا تھا کہ درد و الم کا ساماں تھا
فرس بھی راکبِ بے کس کے غم میں گریاں تھا

ہر ایک زخم بدن مثلِ گُل نمایاں تھا
سلامت اس کا جوڑ اک بہ تھا زمانے میں
چباتا آتا تھا سُوکھی زباں دہانے میں

اور آخر میں ذوالجناح، امام حسینؑ کا مرکب ؎

یہ نوحہ پڑھتا تھا گھوڑے کے آگے آگے بشیر
مدینہ لُٹ گیا، جنگل میں مر گئے شبیرؑ
گلے پہ دلبرِ زہراؑ کے چل گئی شمشیر
کیا شہید غریب الوطن کو بے تقصیر
یہ ذوالجناح شہنشاہِ خوش خصال کا ہے
یہ قاشِ زیں پہ لہو فاطمہؑ کے لال کا ہے

حسینیہ سید تقی صاحب کی مجلسوں میں مختلف ذاکر پڑھتے تھے اور آٹھویں محرم تک ان میں مجمع بھی کم ہوتا تھا، لیکن نویں محرم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر اس امامباڑے میں اُمڈ آیا ہے۔ یہ وہاں مولانا سید احمد صاحب مرحوم کی اشاروں والی ذاکری اور شبیہیں اٹھنے کا دن ہوتا تھا لوگ سویرے سے امامباڑے میں جمع ہونا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیتے تھے جہاں سے ذاکر کو دیکھ سکیں۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے پہلے امامباڑے کے کشادہ دالانوں اور وسیع میدان میں سر ہی سر نظر آنے لگتے۔ پھر بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس مجلس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں شہر کے تقریباً سب ذاکر اور مجتہد شرکت کرتے تھے۔ یہ مجلس کے معزز ترین حاضرین تھے جن میں سے ہر ایک کی آمد پر نعرۂ صلوات سے امامباڑا گونج اٹھتا تھا۔ مجلس کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کچھ پیش خوانیوں کے بعد اچانک پورے مجمع میں سناٹا پھیل جاتا اور اصل ذاکر منبر پر بیٹھتے۔ وہ کچھ دیر خاموشی کے ساتھ مجمع پر نظریں دوڑاتے رہتے اور جدھر نگاہ کرتے ادھر سے رونے کی صدائیں بلند ہوتیں، یہاں تک کہ مجلس شروع ہونے سے پہلے ہی ہر طرف ایسا گریہ ہونے لگتا جیسا دوسری مجلسوں میں مصائب خوانی کے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے۔ اب مجلس شروع ہوتی۔ مولانا کمزور آواز میں کچھ فقرے ادا کرتے جو رونے کے شور میں ٹھیک سے سنائی بھی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ آواز کے بجائے صرف اشاروں سے مجلس شروع کرتے۔ مجاہدوں کا میدان میں جانا، جنگ کرنا اور شہید ہونا۔ امام حسینؑ کا علی اصغر کے لئے پانی طلب کرنا، حرملہ کا چلّہ کمان میں تیر جوڑنا، تیر چلنا اور گردنِ اصغر پر تیر لگنا، بچے کا امام کے ہاتھوں پر منقلب ہو جانا۔ امام حسینؑ کا جہادِ آخر کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا، میدانِ جنگ میں آکر جہاد کرنا، تیروں، تلواروں نیزوں کے زخم کھانا، گھوڑے سے زمین پر آنا۔ یزیدی سپاہیوں کا حسینی خیموں میں داخل ہونا، عورتوں کی ردائیں اور ننھی سکینہ کے گوشوارے چھیننا۔ یہ سب منظر زندہ ہو ہو کر نگاہوں کے سامنے آتے اور امامباڑے میں صرف رونے کا شور سنائی دیتا رہتا۔ آخر لوگ دیکھتے کہ ذاکر نے اپنا گریبان چاک کر لیا ہے۔ اسی کے ساتھ امامباڑے کے کسی دُور افتادہ حصے سے نقارے اور جلاجل کی ڈراونی آواز آنا شروع ہوتی اور سارے عزادار شبیہوں کی زیارت کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اچانک بھرے مجمع میں تیرتے ہوئے تابوت نظر آتے جن کے اندر تیروں سے چھدے ہوئے خون آلود بدن دکھائی دیتے۔ لوگ ہر تابوت کو چومنے کے لئے ٹوٹ پڑتے۔ ذرا دیر بعد اندازہ کرنا ممکن نہ رہتا کہ کب کدھر سے کون سی شبیہ برآمد ہو گی۔ مجمع جا بجا سے پھٹتا، پھر اکٹھا ہوتا۔ گہوارۂ علی اصغر آتے آتے فضا اتنی ہیجانی ہو جاتی کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہتا۔ اسی رستاخیز کے عالم میں اونٹ اور ذوالجناح مجمع کو چیرتے پھاڑتے دالانوں کے اندر اور صحن میں ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے۔ ان حیوانوں پر بھی ایک جوش سا طاری ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ایک قدم میں کئی کئی عزاداروں کو کچل ڈالیں گے لیکن اس افراتفری کے باوجود کوئی سنگین حادثہ نہیں ہوتا تھا۔

آٹھویں اور نویں محرم کو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے یہاں "ادبستان" میں سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی صاحب مرحوم پڑھتے تھے۔ اس وقت تک سید العلماء مرحوم نے باقاعدہ ذاکری نہیں شروع کی تھی اور لوگوں کو کبھی کبھار ان کے صرف وعظ سننے کا موقع ملتا تھا اس لیے ان دو مجلسوں میں بڑا مجمع ہو جاتا تھا۔ یہ مخلوط مجمع ہوتا تھا جس میں شہر کے دانشوروں کی بڑی تعداد نظر آتی تھی۔ فرنگی محل کے علماء اور کبھی کبھی مولانا عبدالماجد دریابادی اور جوش ملیح آبادی بھی سامعین کی صفوں میں ہوتے تھے

سید العلماء کا بیان کسی مخصوص موضوع پر ہوتا تھا جس کا تعین ادیب مرحوم کرتے تھے۔ بیان ڈھائی تین گھنٹے سے کم کا نہیں ہوتا تھا اور کبھی کبھی چار گھنٹے تک پہونچ جاتا تھا۔ ایک بار رُباعی "شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ" کو موضوع بنایا گیا۔ ایک سال کی مجلسوں میں ابتدائی دو مصرعوں اور دوسرے سال کی مجلسوں میں بقیہ دو مصرعوں کی تفسیر بیان ہوئی۔ آخری مصرعے "حقّا کہ بنائے لاالہٰ است حسینؑ" والی مجلس میں امام حسینؑ کو جس وضاحت اور استدلال کے ساتھ کلمۂ لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی بنیاد ثابت کیا گیا تھا اسے یاد کرکے لوگ برسوں وجد کرتے رہے۔ ان مجلسوں کی فضا روایتی مجالسِ عزا سے مختلف ہوتی تھی۔ مصائب خوانی کا بھی بہت التزام نہیں ہوتا تھا، اس وجہ سے یہ عام عزاداروں کے لیے بہت دل پسند نہیں ہوتی تھیں۔ ایک بار پس پردہ بیٹھی ہوئی ایک خاتون جو بڑے شوق سے مجلس سننے آئی تھیں بیچ ہی میں یہ کہتی ہوئی رخصت ہوگئیں کہ " ہماری سمجھ میں یہ گلستان بوستان نہیں آتی۔"

بڑی مجلسوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی مجلسیں بھی یادگار تھیں جو بعض اماموں میں ایک کے بعد ایک مسلسل ہوتی رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں دن بھر عزاداروں کے آنے جانے کا سلسلہ رہتا تھا۔ ان میں خواندگی اور تبرک کی رنگارنگی دیدنی ہوتی تھی۔ یہ مجلسیں مختلف لوگوں کی طرف سے ہوتی تھیں اور ان میں حاضرین کو تبرک حاصل کرنے کے لئے اماباڑے کے دروازے سے باہر نہیں نکلنا پڑتا تھا بلکہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تبرک مل جاتا تھا۔ ایک مجلس کے تبرک کی تقسیم ختم بھی نہ ہونے پاتی کہ دوسری مجلس کا مہتمم اپنے ذاکر کو منبر پر بٹھوا دیتا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر یہ مجلس ختم ہوتی اور تیسری مجلس نئے ذاکر، نئے تبرک والی شروع ہو جاتی۔ ان مجلسوں میں پڑھنے والے عموماً غیر معروف اور بیشتر بوڑھے لوگ ہوتے تھے۔ اس وقت تک مرثیہ خوانی کا زوال ہو چکا تھا اور موجودہ طرز کی ذاکری نے مجلس کی دوسری قسموں کو قریب قریب ختم کر دیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی مجلسوں کے یہ بوڑھے پڑھنے والے انھیں متروک اقسام کے آخری نمائندے تھے۔ ان میں کوئی کتاب میں سے دیکھ دیکھ کر مجلس پڑھتا، کوئی زبانی نثر میں پڑھتا لیکن باقاعدہ ترنم کے ساتھ، کوئی خوش الحان قاری بیان کے بیچ بیچ میں عمدہ قرأت کے ساتھ آیات قرآن کی تلاوت کرتا۔ کبھی کوئی تحت خوان مرثیے کے چند بند زور و شور کے ساتھ پڑھ کر اتر آتا۔ کبھی کبھی واقعہ خوانی سننے کو مل جاتی جس میں کربلا کا کوئی واقعہ منظوم روایت کی صورت میں بیان ہوتا اور اس کے خاتمے پر کوئی مستزاد نوحہ پڑھا جاتا۔ بیچ بیچ میں سوز خوانی بھی ہوتی رہتی جس کے لیے منبر کے بجائے چوکی استعمال ہوتی تھی۔ شاذ و نادر کوئی چھوٹی سی مجلس فارسی میں بھی ہو جاتی تھی، یہ بھی کتاب دیکھ کر پڑھی جاتی تھی۔ کتاب اغلباً ملا حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء" ہوتی تھی اور پڑھنے والا روضہ خوانوں کی کوئی مٹتی ہوئی یادگار۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں سید نصرت علی دہلوی نے اپنی کتاب "تاج التواریخ" میں مجلس پڑھنے والوں کی مندرجہ ذیل قسمیں بتائی تھیں:

۱. تحت اللفظ خوان

یہ حضرات مجلس میں مرثیہ پڑھتے ہیں اور یہی ذریعۂ معاش ہے ...
اب بھی اس فن کو جاننے والے لکھنؤ میں بہت ہیں۔

۲. حدیث خوان

یہ حضرات علم دینیات سے ماہر ہوتے ہیں، احادیث پر بھی عبور ہوتا ہے ...... محرم میں منبر پر بیٹھ کر حالاتِ آلِ عباؑ بیان کرتے ہیں۔

۳. کتاب خوان

یہ لوگ بھی مثل حدیث خوانوں کے مگر ان سے نیچے درجے کے ہیں ذکرِ مصائب حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کرتے ہیں۔ ان کا لحن حدیث خوانوں سے جدا ہے۔

۴. نثر خوان

یہ حضرات منبر پر بیٹھ کر ذکرِ مصائب حضرت امام حسینؑ بیان کرتے ہیں اور مقاماتِ مناسب پر اشعارِ اردو فارسی بھی شامل کرتے ہیں۔

۵. سوز خوان

اس فن کے لوگ علم موسیقی کے زیادہ ماہر ہوتے ہیں اور مجالس میں مرثیہ نہایت سوز و گداز سے پڑھتے ہیں ... ان کی ذاکری کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص جس کو "صاحب بستہ" کہتے ہیں، بیچ میں بیٹھتا ہے اور دو آدمی دونوں پہلوؤں میں بیٹھتے ہیں۔ داہنی طرف والے کو "بازو" اور بائیں طرف والے کو "جوابی" کہتے ہیں۔ آواز ملا کر پڑھتے ہیں۔

(باقی ص ۱۴۸ پر)

سبط محمد نقوی
حسینیہ غفرانمآب، لکھنؤ

اودھ کے چند ممتاز علماء

— (۱) —

پورب میں علمی سرگرمیاں اتنی نمایاں تھیں کہ شاہجہاں نے اسے اپنا شیراز کہا تھا۔ بعض حضرات اسے جون پور اور اس کے ملحقات و نواح تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اہل دلّی کی زبان جب "پورب" کی لفظ آتی تھی تو اس سے اودھ کا علاقہ بھی مراد ہوتا تھا۔

ہمارے دور کے نامی عالم اور قلم کار ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق قاضی اطہر مبارکپوری نے ایک کتاب "دیار پورب میں علم اور علماء" کے نام سے لکھی ہے جس میں اودھ کے علماء کرام کا ذکر جمیل بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب کا وطن مبارکپور ضلع اعظم گڑھ ایک زمانے میں خطۂ جون پور کا جزو سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی قباحت نہیں کہ اودھ بھی "شاہجہاں کے شیراز" کا ایک حصّہ ہے۔ شاہجہاں کے ملاحظہ کو سرکاری اعتراف سمجھنا چاہیئے۔

مشرقیات کے نئے نصاب درس کی تاسیس اور شاہجہاں کی تخت نشینی تقریباً معاصر واقعے ہیں۔ اس نصاب درس کی تاسیس ملا قطب الدین شہید سہالوی کے ہاتھوں ہوئی مگر اسے ملائے شہید کے نامور فرزند ملا نظام الدین فرنگی محلی کی درس نظامی کہا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ ملا نظام الدین کے ہاتھوں ہی پروان چڑھا۔

اس نصاب کی جہانگیری کی کیفیت یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ۔

> ہندستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جاسکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے۔[۱]

یہ تو مسلّم حقیقت ہے کہ اس درس کی تدوین ملا قطب الدین شہید نے کی۔ مگر اسے ملا نظام الدین سے کب اور کس نے منسوب کیا۔ اس کا کوئی سراغ نظر قاصر سے نہیں گذرا۔ اس درس نظامی کے استاذ الاساتذہ اور معلم اول اکبری رتن میر فتح اللہ شیرازی تھے اور اس نصاب نے ملک میں معقولات کی تعلیم کو نیا رواج دیا تھا۔ ملا قطب الدین تک

امیر شیرازی کا فیضان جن تین واسطوں سے پہونچا ان میں سے دو ملا دانیال چوراسی اور عبدالسلام دیوئی اودھ کے ہی باشندے تھے۔ صرف امیر کے ہی براہ راست شاگرد ملا عبدالسلام لاہوری تھے۔ چوراس اور دیوئی شریف دونوں ہی بارہ بنکی ضلع میں واقع ہیں۔ فرنگی محلی نوجوان کا رجحان سیکولر تعلیم کی طرف مبذول ہو جانے سے اب علوم دین سے ربط میں یہ خانوادہ آگے ہے۔ یہ گھرانہ خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے اور اس کے علماء و ذاکرین ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

شدید دقت اس بات کی ہے کہ اودھ ایک ایسا عالم خیز خطہ رہا ہے اور بحمداللہ اب بھی ہے کہ اس کے ممتاز تر علماء کو بھی لیا جائے تو ان کے ذکر خیر کی گنجائش کسی رسالے کے مخصوص نمبر میں تو کیا، ایک دو مجلدات میں بھی نہیں نکل سکتی۔ اس لئے ہم بس چند علماء کو لیں گے جن کی خدمات توسیع تعلیم یا تدریس میں بے مثال ہیں یا ملت و ملک کی ایسی یادگار خدمت کی ہے جو تاریخی عظمت کی حامل ہے۔

ابھی جس خاندان اجتہاد کی نشان دہی کی گئی ہے اور اب جس کی قدرے تفصیل نہایت موزوں انتخاب کی بنا پر تفصیل پیش کرنا ہے اور اس کے مورث سید دلدار علی نقوی نصیرآبادی تھے جو برصغیر خصوصاً شمالی ہند میں ایک انفرادی اعزاز و امتیاز کے مالک ہوئے۔ آپ سے قبل کسی ہندوستانی کو عراق کا سفر کرکے حوزۂ علمیہ سے تحصیل فقہ و اصول کے بعد، سند اجتہاد، لانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ اختصاص تمام ازل نے آپ کے لئے مخصوص فرما رکھا تھا۔

مولانا دلدار علی نقوی غفرانمآب

کی ولادت ۱۱۶۶ھ/۵۳۔۱۷۵۲ء کی کسی شب جمعہ نصیرآباد ضلع رائے بریلی کے ایک زراعت پیشہ سید گھر میں ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق مکتبی تعلیم وطن میں حاصل کرکے گھر گرہستی میں مشغول ہو گئے۔

آپ کی ولادت کے وقت جس طرح آپ کے مکان میں نور سا چمکتا دیکھا گیا

اسی طرح کا محیرالعقول واقعہ تعلیم کے سلسلے میں بھی پیش آیا۔ ایک روز ہل بیل لے کے اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے کہ ایک غیبی صدا سنائی دی: "دلدار علی! اپنی تعلیم جاری رکھو": مولانا مرتضیٰ حسین فاضل تفصیل بتاتے ہیں۔

• دل کی آواز یا غیب کا اشارہ سنتے ہی طبیعت نے شوق اور دل نے عزیمت کی انگڑائی لی اور متوسطات پڑھنے رائے بریلی اور الہ آباد گئے۔ رائے بریلی میں مولوی باب اللہ سے اور الہ آباد میں فاضل کامل سید غلام حسین دکنی سے اور لکھنؤ کے قریب سندیلہ میں مولانا حیدر علی ابن ملا حمداللہ سے منقولات اور معقولات کا درس مکمل کیا۔

شاید یہی وہ زمانہ تھا کہ ایک غیر مسلم دوکاندار سے رات کو حفاظت دوکان کی شرط پر اس کے چراغ کی روشنی میں پڑھنے اور اس کی دوکان کے باہر سونے کی اجازت لی اور یہ دور عسرو محنت سے گذار کر علم سے بہرہ ور ہوئے۔

مولوی محمد باقر شمس فرماتے ہیں کہ مولانا دلدار علی اس نوعمری میں ذہانت و ذکاوت میں اس درجہ پر تھے کہ بسا اوقات استاد کے اُلجھے ہوئے مطلب کو اس طرح سلجھا دیتے تھے کہ طلبہ کے ذہن میں اتر جاتا تھا۔

شاہجہاں پور میں ملا عبدالعلی سے ایک مسجد میں ملاقات ہوئی۔ موصوف نے شرح سلم ملا حمداللہ پر کچھ بڑے بڑے اعتراضات کئے تھے۔ مباحثہ میں مولانا نے ان اعتراضات کو رد کر کے ملا کو حیران کر دیا۔

ملا حسن سے دہلی کی جامع مسجد میں ملاقات ہوئی اور مسئلہ انجرار وزیر پر تفصیلی بحث میں ملا صاحب کو اعتراف فضل کرنا پڑا،، گہ

اودھ میں دو ماں سعادت وزارت نے صوبہ داری کے نام پر در اصل بادشاہت کر رہا تھا۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کے اقتدار کا تھا۔ نواب حسن رضا خاں سرفراز الدولہ نائب تھے۔ سرفراز الدولہ خود ذی علم آدمی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں علم دوست و دیندار بہت تھے۔ سید دلدار علی ان کے دربار تک پہونچے۔

عراق و ایران میں تحصیل علم کی تفصیل مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

ہندوستان میں تکمیل تحصیل کے بعد عراق و ایران کے لئے کمر باندھی اور عہد کے عالم جلیل مجدد فقہ و اصول، زعیم اکبر ملا سید محمد باقر بہبہانی (متوفی ۱۲۰۸ھ) سید علی مہدی طباطبائی (م ۱۲۱۲ھ) سید مہدی موسوی شہرستانی متوفی (۱۲۱۶ھ) سید علی صاحب ریاض المسائل متوفی (۱۲۳۱ھ)

تاریخ تشیع کے رہنما اور حوزہ علمیہ نجف و کربلا کے سربراہ تھے۔ ان حضرات کے تلامذہ نے شام، حجاز، ایران ہندوستان اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں اور ترکی میں فقہ شیعہ پر بہت کام کیا۔ آقائے بہبہانی تمام شیعی دنیا کے مرجع تھے۔ ان کا حلقۂ درس نجف و کربلا کی تاریخ کا ممتاز حلقہ مانا گیا ہے۔

مولانا دلدار علی نجف و کربلا و سامرا کے ان اساتذہ سے اجازت لیکر ایران پہونچے اور یہاں کے شیخ الفقہ والاصول سید مہدی ابن ہدایت اللہ اصفہانی کے درس میں حاضری دی۔ کچھ عرصہ تک قم و مشہد میں قیام کر کے اکابر علماء سے سند حدیث و اجازت لیکر ایران سے وطن کا رخ کیا،، شہ

سفر عراق کے لئے ہندوستان سے روانگی کا زمانہ تو تعین کے ساتھ نہیں معلوم لیکن مولانا فاضل کا فرمانا ہے کہ مولانا کی لکھنؤ آمد کا سن ۱۱۹۴ھ بتایا جاتا ہے ظاہر ہے کہ یہاں فاضل مصنف کی مراد لکھنؤ آمد سے مراجعت ایران و عراق سے لکھنؤ پہنچنے سے ہے کیونکہ مستقل اقامت کے لئے وطن معروف نصیرآباد ضلع رائے بریلی سے تشریف آوری سنہ ۱۲۰۰ھ کا واقعہ ہے جیسا کہ مولانا آغا مہدی صاحب نے لکھا ہے کامل پینتیس [۳۵] برس تک اس سحاب علم کے ترشحات سے قوم سیراب ہوتی رہی چونکہ غفرانمآب کی وفات ۱۲۳۵ھ میں واقع ہوئی اس لئے ماننا چاہئے کہ فاضل مصنف کی مراد سنہ ۱۲۰۰ھ سے شروع ہونے والے عہد سے ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے دلی کے اضمحلال اور لکھنؤ کے عروج سے اثنا عشری فرقہ میں اپنا تشخص ایک بار پھر نمایاں کرنے کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایسے میں مشترکہ جمعہ و جماعت میں اس فرقہ کی شرکت میں بھی سستی در آئی یہ صورتحال دیکھ کر ایک صوفی عالم شیخ علی اکبر مودودی نے جو نواب بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے کسی طرح متعلق تھے یہ صلاح دی کہ شیعوں کو اپنا جمعہ و جماعت الگ کر لینا چاہیئے چنانچہ ملا محمد علی بادشاہ نے نماز جماعت کی فضیلت پر ایک رسالہ لکھ کے آصف الدولہ کے حضور میں پیش کیا۔ نواب وزیر کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں تو مولانا کے دلدادہ اور قدرداں تھے ہی۔ انھوں نے مولانا دلدار علی کو لکھنؤ کی اقامت کے لئے مدعو کیا اور سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے مکان پر ہی ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ ۱۲ مئی ۱۷۸۶ء کو شیعوں کی پہلی نماز جماعت ہوئی اسی تاریخ کو فیض آباد میں مولانا عبدالعلی دیوکھٹوی کی امامت میں نماز جماعت قائم ہوئی اس لئے عبادت الٰہی کے وسیلہ سے شیعہ سماج کا کھویا ہوا جماعتی تشخص اُجاگر ہوا۔

اس اقدام کی تنقید کی گئی ہے اور اسے حکومت کی سرپرستی کا ثمرہ بتایا گیا ہے لیکن بر اندک تامل یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تبدیلی مذہب کی کارروائی نہ تھی بلکہ یہ حجاب تقیہ کا چاک ہونا تھا مگر شکر کا مقام ہے کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق جیسے حضرات نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام نہیں لیا۔ؔ

حکومت کی ناجانبداری کی بدولت بالواسطہ تحفظ ملا تو مولانا دلدار علی نے پھر تعلیمات اہل بیت کی روشنی میں شیعہ سماج کو استحکام عطا کرنے کا تبلیغی جہاد چھیڑ دیا۔ اب اس کی زد میں اخبارات، تصوف، عرس، قوالی، قبروں پر چادریں، بھنگ کے چبوترے، شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کا میٹھا وغیرہ وغیرہ سبھی آ گئے۔

اس جہاد میں شیخ زماں اور ذوالفقار قلم دونوں تیز تیز چلی اثر یہ ہوا کہ خود نواب آصف الدولہ کو بھنگ سے تائب ہونا پڑا۔

اب دور آیا مسجدوں اور امام باڑوں کی تعمیر کا، کتب خانوں کی تاسیس کا اور مجالس درس کے قیام کا۔ آصف الدولہ نے جو مسجد اور امام باڑہ بنوایا اسے تو مرحوم کے حسن نیت نے تاریخی تعمیر کا رتبہ بخشا اور وہ آج تک زیارت گاہ خلائق ہے جو امام باڑہ خود مولانا دلدار علی نے لکھنؤ میں تعمیر کیا جو ان کے دعائی لقب غفرانمآبؒ کے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے جو گذشتہ دس برس میں از سر نو تعمیر ہوا ہے اور ہنوز کچھ کام باقی ہے۔ البتہ جو عزا خانہ مولانا دلدار علی نے اپنے وطن نصیر آباد میں بنوایا وہ البتہ ابھی شکستہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔

یہاں یہ یاد دہانی طلبا و محققین کے لئے مفید ہوگی کہ عزا خانۂ لکھنؤ کی تعمیر ۱۲۳۴ھ میں ہوئی تھی اور اس کی تاریخ ہوئی۔

مزار و مدرسہ ہم جائے ماتم سبطین

جناب غفرانمآب نے اپنے وصیت نامہ میں امام باڑہ میں طلبا کو قیام کی سہولت دینے کی نہایت تاکید کی ہے۔

مولانا دلدار علی غفرانمآب کے جس اختصاص و امتیاز کو سب سے زبردست خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہئے وہ ہے اتحاد بین المسلمین کی پاسداری۔ خود اپنی قیام گاہ کے لئے فرنگی محل کے متصل محلہ کو منتخب فرمایا اگر قضا و افتا کے لئے اثنا عشری افراد معین ہوئے تو ساتھ ہی ساتھ سنی قاضیوں اور مفتیوں کی تقرریاں بھی ہوئیں، کسی فرقہ نے دوسرے کے معاملت میں مداخلت نہ کی اگر ربنائے غلط فہمی و بے احتیاطی کچھ ہوا تو اس کی حیثیت شاذ و نادر کی ہے۔ دونوں طبقے متحد رہیں نہ شیعہ علما سے استفادے میں سنی طلاب کو کراہت ہوئی اور اسی طرح شیعہ طلاب نے اور سنی حضرات علما سے استفادے میں تکلف و احتیاط کو راہ نہ دی اس خدا رسیدہ عالم جلیل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کی نسل میں علم دین آج بھی باقی ہے۔ اس دودمان عالی شان کے علما ہندوستان و پاکستان میں اب بھی مشغول فیض رسانی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اپنے دوران قیام عراق میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ پر آپ نے دعا کی تھی کہ میری نسل میں علم دین ہمیشہ رہے۔ اس سلسلے میں اس شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ دوسرے علما و مجتہدین روضے کی مجاورت میں یہ سعادت کیوں نہ حاصل کر سکے صرف دلدار علی (غفرانمآب) کو یہ امتیاز کیسے حاصل ہوا۔

اس سوال پر متعدد حضرات نے گفتگو کی ہے۔ مولانا آغا مہدی مرحوم نے جو توجیہہ فرمائی ہے وہ اس طرح ہے کہ یہ دعا ایسی شب جمعہ میں کی گئی تھی جو شب قدر بھی تھی اور ایسی ساعت تھی جس میں مشتری کا اقتران راس ذنب سے تھا جو عموماً چودھویں برس ہوتا ہے اور اس ساعت کو قبولیت دعا کا وقت بتایا جاتا ہے۔ؔ

خداوند عالم نے جناب غفرانمآب کو پانچ بیٹے عطا کئے۔ صاحبزادی بھی ایک تو ضرور ہی تھیں اور زیادہ کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا سید سلطان العلما اور سب سے چھوٹے مولانا سید حسین سید العلماء تاریخی اہمیت کے حامل ہوئے۔ دوسرے صاحبزادگان مولانا سید علی، مولانا سید حسن اور مولانا سید مہدی تھے۔

تصنیفات کی تعداد بہت ہے لیکن آپ کا کارنامہ کمال عماد الاسلام کہی جاتی ہے یہ اصول دین پر پانچ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی دو جلدیں جو امامت اور معاد کی بحث میں ہیں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

وفات

۱۲۳۵ھ کی انیسویں رجب اور از روئے تقویم ۲ رمئی ۱۸۲۰ء کو اس عہد ساز شخصیت کا دور حیات پورا ہوا۔ اپنے ہی نو تعمیر عزا خانے واقع لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ آپ کے ممتاز شاگرد علامۃ العلما مولانا سید احمد علی محمد آبادی نے تاریخ وفات کہی۔ دو ابیات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

رسید چوں شب تاسع عشر ز ماہ رجب　　　سفر بروضۂ رضواں عفو از دنیا

سروش غیب ہاں وقت ناگہاں فرمود　　　ستون دیں بزمیں اوفتاد وا ویلا

سید محمد سلطان العلماء :- جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ شمالی ہند میں شیعہ سماج

کا استقلال جناب غفراں مآب مولوی دلدار علی صاحب کا کارنامہ ہے لیکن آپ کے فرزند اکبر مولوی سید محمد کو حالات نے زیادہ عہد آفریں شخصیت ثابت کیا۔ آپ علمی دنیا میں سلطان العلماء کے شاہی خطاب سے مشہور ہوگئے۔ دربار میں باتباع شاہی قبلہ وکعبہ اور گھر میں "بڑے آپ" کہے جاتے تھے۔ عہد امجد علی شاہ اور بعد کی تاریخ میں مجتہد العصر اور وفات رضوان مآب کے لقب سے یاد کئے گئے۔

اس عالم اجل کی ولادت ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۸۴ء) کو لکھنؤ میں ہوئی تمام تر تعلیم اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاصل کی۔ کچھ مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھنے کی روایت کی گئی۔ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹ برس کی عمر میں تحصیل کامل ہوگئی اور صاحب نظر مجسمہ علم وکمال باپ نے اجازۂ اجتہاد کا مستحق سمجھا اور عطا فرمایا۔ اجازۂ اجتہاد سے مزین ہوکے اپنے والد ماجد کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا اور اس سلسلے میں اولیں مرحلہ اپنے چاروں چھوٹے بھائیوں کے درس کا تھا اور اپنے والد کے دوران علالت یہ خدمت انجام دی۔

مملکت اودھ کی وہ انقلابی کروٹ جس میں مسند وزارت وصوبہ داری بساط شاہی بن گئی جناب غفراں مآب کی حیات کے آخری دنوں کا واقعہ ہے اس لئے صورتحال کی سنگینی سے الجھنے کی ذمہ داری جناب سلطان العلماء کے سر آئی۔

ہوا یہ کہ نواب غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر مرکزی شہنشاہیت سے رابطہ توڑ لیا اور خود مختار بادشاہی کا اعلان کردیا۔ اس اقدام کے جواز کے سامنے سوالیہ نشان لگ گیا۔ اس لئے بادشاہ سلامت سے مولانا سید محمد کا ربط بس واجبی سا ہی رہا لیکن نصیر الدین شاہ سے تو کشمکش کی نوبت آگئی اور رشتے اتنے تلخ ہوئے کہ مولانا نے دربار میں آنے کا بلاوا ہی رد کردیا لیکن محمد علی شاہ کے عہد میں حالات سدھرے لیکن جواز کا سوالیہ بدستور قائم رہا لیکن جب ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ / مئی ۱۸۴۲ء میں محمد علی شاہ کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سنجیدگی سے یہ مسئلہ حل کرنے کی سعی کی اور تخت وتاج "نائب امام" کی حیثیت سے سلطان العلماء کی خدمت میں پیش کرنا چاہا۔

مگر آپ نے یہ عہد لے کر کہ حکومت فقہ جعفری کے الہی نظام پر چلے گی تاج امجد علی شاہ کے سر پر رکھ کر زمام سلطنت انھیں کو سونپ دی۔ بادشاہ نے مخلصانہ نیاز مندی کے ساتھ خطاب پیش کیا۔

" مجھے علوم دین مرجع سادات ومومنین، حافظ احکام اللہ مورد اعتقادات امجد علی شاہ، سلطان العلماء، مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب "

لیکن خود سلطان العلماء نے "اعتقادات" کی لفظ "عنایات" سے بدلوادی [۹] خطاب کے کلمے کھوکھلے نہ تھے یہ عمل و نفوذ کی روح سے معمور تھے جو شعبے برطانوی اقتدار کے زیر اثر تھے ان کے علاوہ تمام شعبوں میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا اور کاروبار سلطنت کا اچھا خاصا حصہ جناب سلطان العلماء اور ان کے چھوٹے بھائی جناب سید العلماء سید حسین علیین مکاں کی نگرانی میں آگیا۔ اس صورتحال کی حکایت میں کچھ جانبدار قسم کے کم فکر نوجوانوں نے یہاں تک مبالغہ آرائی کردی کہ ملک کے انتظامی امور سے لیکر بادشاہ کی نجی زندگی تک ہر کام میں مجتہدین کا دخل تھا۔ مجتہدین سے مراد یہی دونوں بھائی سلطان العلماء وسید العلماء ہیں۔ جناب سلطان العلماء کی حیثیت سلطنت کے سب سے بڑے حاکم کی تھی اور دوسرے عہدوں میں بھی آپ کے بھائی صاحبزادوں اور شاگردوں وغیرہ کی اچھی حصہ داری رہی۔

اگرچہ جناب سلطان العلماء اور جناب سید العلماء کے درمیان کوئی کسی طرح کی تقسیم کار نہ تھی پھر بھی تعلیمی اور تدریسی میدان میں جناب سید العلماء اپنے نفیض جاوداں کی ایک نہایت فیض رساں یادگار چھوڑ گئے آپ کے فخر استاد شاگرد مفتی علامہ میر محمد عباس شوستری نے آپ کے حسب ارشاد علم دین کی تحصیل کے ثواب وفوائد پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جسے بادشاہ وقت کی خدمت میں پیش کیا گیا اور امجد علی شاہ نے نائب وزیر اعظم نواب امین الدولہ امداد حسین خاں کو مدرسہ کی تاسیس کی ہدایت فرمائی اس طرح اس مدرسہ کا قیام ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں وجود میں آگیا پہلے یہ درسگاہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے کی دالانوں میں رہی لیکن جب قیصر باغ کی تعمیر ہوئی اور وہاں سلطان عالم واجد علی شاہ کا قیام فنون لطیفہ سے علمی دلچسپیوں کے ساتھ ہوا تو پھر مدرسہ سلطانیہ آصفی امام باڑہ میں منتقل ہوگیا اور غصب اودھ کے بعد غاصب حکومت کے عتاب کی زد میں آگیا۔ [۱۰]

اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تو جناب سید العلماء کے صاحبزادے جناب مولانا سید تقی صاحب ممتاز العلماء فخر المدرسین کے خطاب کے ساتھ مقرر ہوئے تھے اور تین اساتذہ حضرات کی حیثیت سینیر پروفیسر کی تھی جن میں ایک جناب مفتی علامہ میر عباس صاحب تھے۔ یہاں کے اودھی اساتذہ کا ذکر اس تحریر میں کسی قدر تفصیل سے آنا چاہئے تھا لیکن افسوس ہے کہ مضمون کو بجا طور پر بھی طوالت نہیں دی جاسکتی۔

سلطنت اودھ کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی جناب سلطان العلماء کی زندگی نہایت سرگرم گذری۔ صرف انتظامی امور یا سماجی خدمات میں محصور ومحدود ہوکے نہیں رہ گئے بلکہ تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس میں بھی برابر کی دلچسپی لی۔ جناب

سلطان العلماء کے قلم سے چالیس اہم تصنیفیں یادگار ہیں اور یہ فقہ و اصول، معقولات، علم کلام اور مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ چند یہ ہیں۔

(۱) احیاء الاجتہاد۔ اصول فقہ	(۶) حاشیہ حمداللہ
(۲) اصل الاصول	(۷) رسالہ حل مسئلہ جذر اصم
(۳) بشارت محمدیہ	(۸) حاشیہ شرح صغیر
(۴) برق خاطف	(۹) ضربت حیدری (دو ضخیم مجلدات)
(۵) ثمرۃ الخلافتہ	(۱۰) منہاج التدقیق

یہ بہت مشہور و اہمیت کی حامل ہیں۔

سلطان العلماء نے اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کے علاوہ باکمال شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کو فیض پہونچایا اس میں مولانا حامد حسین فردوس مآب صاحب عبقات الانوار ایک عظیم الشان اور نادر الوجود کتب خانہ کے بانی اور ایک علمی و دینی خانوادہ کے مؤسس ہوئے۔ آپکے صاحبزادے ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین بھی اپنے دور کے عظیم عالم تھے۔ خدا کے فضل سے اس نسل میں بھی علم کا ہنوز سلسلہ جاری ہے جو عبقاتی کی نسبت کے ساتھ آج بھی وسیع شہرت کی مالک ہے۔

مفتی علامہ میر محمد عباس صاحب کی دختری نسل میں بھی علم دین کا سلسلہ بھی بحمد اللہ جاری ہے اور مرحوم کے صاحب صلاحیت احفاد علم دین کے بڑے اداروں سے وابستہ رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ جناب سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب نے ۲۲ر ربیع الاول ۱۲۸۴ھ ۲۵ر جولائی ۱۸۶۷ء کو شب میں ۱۰ بجے اس سرائے فانی کو خیرباد کہا۔

سلطان العلماء کو خلاق عالم نے گیارہ فرزندوں سے نوازا ان میں کئی حضرات علم و عمل کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کے مالک ہوئے لیکن حالات نہایت مختصر طریقے سے بھی قلم بند کرنے کی گنجائش نہیں۔ محض اسم شماری سے کیا فائدہ ہوگا لہٰذا ہم اب جناب کے برادر زادے ممتاز العلماء فخر المدرسین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جناب سید تقی صاحب

جناب سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکاں کے منجھلے صاحبزادے سید محمد تقی اپنے جد امجد جناب مولوی دلدار علی غفرانمآب کی حیات میں پیدا ہوئے اور تقریباً چودہ مہینے آپکے زیر سایہ رہے اور اپنے والد اور تایا کی تربیت میں پروان چڑھے۔

جن اساتذہ سے آپ نے درس لیا ان میں جناب غفرانمآب کے شاگرد رشید جناب علامۃ العلماء مولانا احمد علی محمد آبادی اور آپکے دادا کے نامور شاگرد جناب مفتی علامہ میر محمد عباس صاحب کے اسمائے گرامی ہیں۔ والد اور تایا نے خود بھی توجہ فرمائی اور انتہائی کتابیں پڑھائیں اور اٹھائیس ۲۸ سال کے سن میں آپ کو سند اجتہاد مرحمت کی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اجتہاد کے حصول کے بعد سند دی گئی کیونکہ مدرسہ سلطانیہ میں صدر مدرس کی سند آپ کو پہلے ہی عطا ہو چکی تھی اور آپ کی ماتحتی میں جو تین مدرس اعلیٰ یعنی سینئر پروفیسر تھے۔ ان میں آپ کے سابق الذکر دو اساتذہ بھی تھے۔

جناب ممتاز العلماء فخر المدرسین کے رنگا رنگ خدمات کی داستان عظیم بھی ہے طویل بھی لیکن ان کے بیان کا محل نہیں۔ آپ نے تدریس و توسیع علم میں گراں بہا خدمات انجام دیں جہاں ایک شاندار امام باڑے اور مسجد کی تعمیر فرمائی وہیں طلبہ کے لئے اقامت گاہ بھی بنوائی۔ یہ صاف اپنے جد بزرگوار غفرانمآب کی تاسی تھی جنھوں نے لکھنؤ میں اپنے امام باڑے میں طلبہ کے قیام کا خاص اہتمام فرمایا تھا اور وصیت نامہ میں اس کے لئے شدید تاکید کی تھی مجتہد عصر کی حیثیت سے بھی آپ کو غیر معمولی مرجعیت میسر ہوئی۔ آپ اپنے خانوادے کی پہلی ہستی تھے جن کے فتاوی اخبار الاخیار میں چھپا کرتے تھے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے لکھا ہے ۔ "ایک دنیا آپ کی تقلید میں تھی"۔

تدریس کے ساتھ تصنیف میں بھی آپ کی گہری دلچسپی تھی ۲۲ر رمضان ۱۲۸۹ھ کو جس وقت مرض الموت میں مبتلا ہوئے ہیں اس وقت بھی اپنی مشہور تصنیف ینابیع الانوار کی تصنیف میں مشغول تھے۔ دن گذرا رات آئی صبح ہوتے ہوتے شب قدر کی سعید ساعتوں میں رحلت فرمائی۔ آپ کی نسل میں اب بھی علم بدرجۂ کمال ہے۔ آپ کا عزا خانہ عقب مسجد تحسین چوک لکھنؤ مقبول و معروف عزا خانوں میں ہے۔ آپکے تصانیف کی بھی بڑی تعداد یادگار چھوڑی۔ آپکے صاحبزادے جناب سید محمد ابراہیم صاحب آپ کے جانشین ہوئے ہر چند کہ آپ کا زیادہ وقت غصب اودھ کے عواقب سے عہدہ برآ ہونے میں گذرا۔ عواقب میں علی گڑھ تحریک بھی تھی انگریزی تعلیم کا شرعی جواز ایک ہنگامہ خیز مسئلہ بنا ہوا تھا۔ آپنے اس شرط پر کہ جو اپنے بچے کی مذہبی نگرانی کر سکے وہ انگریزی تعلیم دلوا سکتا ہے مشروط اجازت دی۔ عمر صرف اڑتالیس ۴۸ سال کی ملی پھر بھی نامور تلامذہ اور معتبر تصانیف بھی آپکے یادگار ہیں جن میں آیۃ اللہ سید محمد جواد بنارسی اور مرزا محمد ہادی رسوا مشاہیر زمانہ میں ہوئے۔

مولانا ابوالحسن صاحب رضوی

عرف جناب ابو صاحب جناب ممتاز العلماء کے داماد اور آپ کے

برادرِ نسبتی تھے بعد میں صاحبزادوں کے کم عمر ہونے کے باعث آپ کے وصی بھی ہوئے جناب ابوصاحب نے جناب سید ابراہیم کے تعاون سے توسیع تعلیم میں بڑی جدوجہد کی. جناب کا ذکر خیر ہم کسی قدر تفصیل سے کریں گے لیکن جناب ابوصاحب کی طرف رجوع سے قبل سلسلۂ بیان کو الجھاؤ سے بچانے کے لئے یہ عرض کر دیا جائے کہ جناب ممتاز العلماء صدر الدرسین کے ایک داماد اور جناب سید ابراہیم کے نسبتی بھائی جناب سید مصطفےٰ صاحب عرف جناب میر آغا صاحب بھی تھے جن کی فقہی حیثیت اس پائے کی تھی کہ ایک وقت میں مرحوم کے اعلم ہونے کی روایت بھی سنی ہے. لکھنؤ کی آصفی مسجد کی نماز جماعت جناب کی ہی نسل کے لئے مخصوص ہے آپ کے خویش قدوۃ العلماء مولانا آغا حسن صاحب اور نواسے عمدۃ العلماء مولانا کلب حسین صاحب کی بڑی دینی اور سماجی خدمات ہیں مگر یہاں تفصیل میں جانے کا محل نہیں اس لئے اب ہم جناب ابوصاحب کی طرف رجوع کرتے ہیں.

جناب مولانا سید ابوالحسن صاحب بن جناب مولانا سید محمد صاحب کی ولادت ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۲۶۰ھ کو ہوئی اور کسی بزرگ نے سن ولادت کا مادہ تاریخ خورشید علم برآمد کیا ہے اور یہ بہت بابرکت اور مطابق حال ثابت ہوا. جناب مرحوم نے نہ صرف فقیہ استاذ بلکہ تعلیمی تحریک کے ایک عظیم رہنما و مدارس کے برگزیدہ موسس کی حیثیت سے اپنی حیثیت منوالی.

مکتبی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی جنھوں نے نہ صرف تعلیم بلکہ عبادتوں اور ریاضت کی تربیت بھی دی جب خود نماز شب کے لئے بیدار ہوتے تو فرزند کو مطالعہ کے لئے جگا دیتے اور خود نماز تہجد ادا فرما کے بیٹے کو ایک سبق پڑھاتے افسوس ہے کہ پدر شفیق کی حیات مستعار بہت مختصر ثابت ہوئی جناب ابوصاحب ابھی عمر کے نویں سال میں تھے کہ پدر نامدار کے سایۂ شفقت و تربیت سے محروم ہو گئے آپکی تعلیم کا مرحلہ دوسرے حضرات اساتذہ کے حضور میں طے ہوا. فقہ داصول جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب سے پڑھا. جناب غفرانمآب کی معرکہ آرا تصنیف عماد الاسلام کا درس جناب سلطان العلماء مولانا سید محمد سے لیا.

آپنے اپنے وقت کے علامۂ روزگار فقیہ ادیب اور نہایت جامع کمال بزرگ جناب مفتی سید محمد عباس صاحب سے بہت استفادہ کیا جناب پر جناب ممتاز العلماء کی شفقت کا یہ حال تھا کہ صاحبزادی سے عقد کر کے آپ کو اپنی فرزندی میں لے لیا جناب مفتی صاحب بھی نہایت شفقت فرماتے تھے مفتی صاحب اپنے مصنفات میں بھی جناب ابو کی رائے کا بہت لحاظ فرماتے تھے.

آپنے جناب سید ابراہیم صاحب کی حمایت اور علامہ کنتوری مولانا حکیم مولانا سید غلام حسنین صاحب کے سرگرم تعاون سے ملک میں ایمانیہ مدرسوں کی تاسیس کی مہم چلائی. جو وقتی طور پر بہت کامیاب رہی لیکن ان مدرسوں کو استحکام و استقامت میسّر نہیں ہوئی. اس تحریک کی یادگار مدرسہ ایمانیہ بنارس میں ابتک کامیابی سے چل رہا ہے. اس دور کی یادگار میرٹھ کا منصبیہ بھی ہے جسے اسکے بانی منصب علی خاں مرحوم نے اپنے نام نامی سے جاری فرمایا تھا. یہ دینی درسگاہ بڑے نشیب و فراز سے گذرا اس وقت اس کا پھر احیا ہوا ہے خداوند علیم استقلال بخشے.

سب سے پہلے لکھنؤ میں مدرسہ ایمانیہ کی بنیاد ڈالی لیکن وہ جب بند ہو گیا تو آپ اس درجہ آزردہ خاطر ہوئے کہ وطن سے ہجرت کر جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن سید ابراہیم اور علامہ کنتوری کی وجہ سے باز رہے اور مرزا مبادر مرزا محمد عباس خاں صاحب کو آمادہ کر کے مدرسہ قائم کیا. مرزا صاحب کے والد ماجد آغا علی خاں عرف آغائی صاحب ناظم کے خطاب سے منسوب ہو کے یہ درسگاہ مدرسہ ناظمیہ کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئی ہر چند کہ اصل نام مدرسہ مشارع الشرائع ہے.

جب حالات سازگار ہو گئے اور اودھ کے غاصب حاکموں سے حسین آباد وقف کے متولیوں سے رشتے ہموار ہو گئے تو جناب آغا ابوصاحب مرحوم متوفی اور ڈپٹی راحت علی خاں مرحوم سکریٹری کو آمادہ کر کے مدرسہ سلطانیہ کی تجدید کرائی اور مدرسہ ناظمیہ جناب نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب کے حوالے کر کے آپ نے مدرسہ سلطانیہ کی باگ ڈور سنبھالی. یہ جناب مرحوم کی روحانیت کا ہی اثر ہے کہ اس دینی درسگاہ کی افسری آپ ہی کی اولاد میں اب تک ہے. آپ فقہ و اصول کا درس اس طرح سے دیتے تھے کہ واقف کار بتاتے ہیں کہ کربلا اور نجف کے درس کی شان ہوتی تھی.

۱۴ رمضان ۱۳۱۲ھ (غالباً ۱۲ مارچ بدھ ۱۸۹۵ء) کو دفعتاً کربلائے معلّی کے چھٹے اور آخری سفر کے لئے کمربستہ ہو گئے ۱۴ محرم ۱۳۱۳ھ (غالباً ۱۴ جون ۱۸۹۵ء) انتقال فرمایا. آپکے فخرِ پدر فرزند جناب سید باقر صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی جناب کے چار صاحبزادے تھے. بڑے سید زین العابدین کا انتقال بھی ۱۳۱۳ھ میں ہوا. دوسرے سید محمد جعفر ۱۳۱۰ھ میں انتقال فرما چکے تھے جناب

سید باقر اور جناب سید ہادی سے آپ کی نسل اور علمی روایت دونوں چلی جس کا سلسلہ ہندوستان، پاکستان اور ایران میں اب بھی جاری ہے۔

درس و تدریس میں شدید مشغولیت کے باوجود جناب نے معتد بہ مصنفات چھوڑے ہیں جن کی تعداد صاحب مطلع انوار نے ستائیس درج کی ہے اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

علامہ غلام حسنین کنتوری

نہایت جامع العلوم بزرگوار تھے اور "علامہ" کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے اور اس کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ جتنے علوم و فنون پر مرحوم کو ماہرانہ دسترس تھی اور جتنی زبانوں میں مہارت کامل تھی اس کی نظیر تب بھی نایاب تھی۔ اب تو خیر! توسیع تعلیم میں علامہ کنتوری کی زبردست خدمات ہیں۔ انھوں نے تعلیم کو دست کاری سے جوڑ کے عنصر شناسی کا جو ثبوت دیا اس کی بدولت انھیں علوم مشرقیہ کے مجدد کی حیثیت حاصل ہوئی۔

آپ کا تعلق اس خانوادے سے ہے جو ورود ہند کے بعد کنتور (ضلع بارہ بنکی) میں آباد ہوا۔ اور اب علمی دنیا میں "خانوادہ عبقات" کے نام سے مشہور ہے اس دودمان نے کئی مشاہیر روزگار دیے۔ دلوں میں جن کی یاد ہی نہیں زبانوں پر جن کا ذکر بھی رہتا ہے آپ کی ولادت اس عالم خیز خاندان میں ۱۷ ربیع الاول ۱۲۴۷ھ ۲۷ راگست ۱۸۳۱ء کو ہوئی۔ مکتبی تعلیم کا سلسلہ بہت صغر سنی میں طے کیا ۱۲۵۴ھ میں لکھنؤ آکر شاہی مدرسہ میں داخل ہوئے ۱۵ سال کی عمر میں جناب مفتی محمد قلی صاحب کی دختر نیک اختر سے عقد ہوا اور بہتر سے بہتر علمی استفادے کا وسیلہ ہاتھ آگیا۔ پھر جناب سید العلماء، و سید حسین علیین مکاں علامۃ العلماء مولانا سید علی محمد آبادی اور جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب سے بھی کسب فیض کیا۔ اجازے بھی حاصل کیے۔

مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ قائم ہوا تو اس میں صنعتی تربیت بھی داخل کی۔ گھڑی سازی کی تربیت بنفس نفیس دیتے تھے۔ اس ہنر کو آپ نے خود اپنے طور پر حاصل کیا تھا کسی سے سیکھا نہیں تھا۔

دینیات کے ساتھ طب میں بھی پائگاہ بہم پہونچائی صحافت کا کوچہ بھی چھانا اخبار الاخیار نامی اخبار اور تہافت الفلاسفہ نامی رسالہ جاری کیا اپنا پریس لگایا۔ اور جناب ممتاز العلماء کی تفسیر ینابیع الانوار کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا۔ محض اپنے کنج عافیت میں محفوظ رہا "فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" کے دلدادہ نہ تھے۔

ایک نہایت فعال اور سرگرم شخصیت کے مالک تھے۔ تدریس، طب اور اخبار نویسی کے علاوہ کیمیائی عمل و صنعت کاری کے شائق و مبلغ تھے۔ صابن سازی و مکھن نکالنے کے کارخانے قائم کیے مگر اتفاقات کی نامساعدت سے استحکام کسی کام کو نہ ملا۔ محض برائے معاش نہیں، سماجی خدمات کے بطور بہت سے کام کیے۔ اتحاد اسلامی کے نہایت پرزور اور وسیع النظر حامی تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تاسیسی دور میں علامہ شبلی نعمانی کی بہت رفاقت کی۔ مختلف علوم میں تصنیف و تراجم یادگار چھوڑے۔ بعض آثار قلم تو معرکے کے ہیں۔ قانون شیخ کا جو ترجمہ مختلف جہات سے خاصے کی چیز شمار ہوتا ہے حد یہ ہے کہ موسیقی اس لیے سیکھی غنا کی حلت و حرمت کی حدود شناخت کر سکیں بایں ہمہ وضع ظاہر عالمانہ اختیار نہ کی۔ اپنے دور کے ثقہ اشراف کے حلقے میں رہتے تھے۔ طب یونانی کے بڑے حاذق معالج تھے میرے بزرگ مرحوم کے بعض معرکہ آرا معالجات کا اکثر آپس میں ذکر فرماتے تھے۔

اس پہلودار شخصیت کے مالک علامہ روزگار جامع کمالات بزرگ نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ / ۱۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کو فیض آباد میں آخری سانس لی۔ لاش وطن مالوف کنتور لائی گئی اور خاندانی گورستان میں مٹی پائی۔ جناب فاضل لکھنوی نے مطلع انوار میں سن وفات ۱۹۱۹ء درج کیا ہے لہ۔ اس میں ماتن یا کاتب کسی کی لغزش قلم ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے علامہ کے مصنفات کی تعداد کافی ہے جو مجلات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے وہ الگ ہیں لیکن ان کے قلم کے یادگار نقش جیسا کہ عرض کیا گیا قانون شیخ کا ترجمہ علم کلام میں انتصار الاسلام، اعجاز خسروی کی شرح مائین نامی مقتل، معراج نامہ قرآئینہ ہیں۔ خود گذشت لائف بھی بہت سبق آموز ہے۔

اب ہم اس سلسلے کے آخری فرد کا ذکر کرتے ہیں پھر حضرات علماء اہل سنت میں سے منتخب حضرات کی یاد تازہ کریں گے۔

مفتی علامہ میر عباس شوستری

میر تقی میر کا شہرۂ آفاق شعر ہے ؎

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آپ دوسرے مصرعے میں انسان کو "عالم" سے بدل دیں، تب شاید اس نابغۂ روزگار کی جامعیت کا تصور ہو سکے۔ ان کا علم، ان کی فکر، ان کا مطالعہ، ان کے ذوق کا تنوع بے مثل مثال، بے مثالی تھا۔ علم تھوڑا اور سادہ علم نہیں عمل بھی،

عبادت بھی، کھیل کود سے یکسر بیگانگی. نو سال کی عمر تھی کہ شعری تصنیفات شروع ہو گئی تھی. کھیلتے کب!

مفتی صاحب کی ولادت سید علی اکبر جزائری، شوستری کے گھر میں شب شنبہ آخر ربیع الاول ۱۲۲۴ھ (۱۳ مئی ۱۸۰۹ء) کو لکھنؤ میں ہوئی. جزائری کا لاحقہ اس لئے نام کے ساتھ شامل ہوا کہ آپ مشہور عالم و درویش سید نعمت اللہ جزائری کی نسل میں تھے. اس دودمانِ عالی شان کے افراد لکھنؤ اور حیدر آباد میں تھے.

مکتبی تعلیم جن اساتذہ سے پائی ان میں والد ماجد کے علاوہ مولوی عبد القدوس صاحب، مولوی عبد القوی صاحب ہیں. لیکن جس حریم درس نے مفتی صاحب کو یہ بلند مقام عطا کیا وہ سید العلماء سید حسین علیین مکان کی بزم درس تھی. جہاں جہاں سے مفتی صاحب نے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھایا پھر حضرت استاد کی شکر گزاری اور اظہار ممنونیت میں کمال کر دکھایا. آپ کی اوراق الذہب اور دیوان رطب العرب میں اس ستائش گری کے نایاب مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں جن سے خود جناب مفتی علام کی پرواز فکر اور تصنیفی منزلت کا پتہ چلتا ہے. لکھنؤ میں اب فقہ کا بڑا چرچا تھا اور استدلالی فقہ کے اس دور نشأۃ میں بڑے بڑے فقیہہ مسند اجتہاد پر فائز تھے. یہی زمانہ تھا جب مجتہد اکبر فقیہہ اعظم شیخ محمد حسن اور سید علی طباطبائی عراق میں اس فن شریف کے تاجدار سمجھے جاتے تھے. ان کی کتابیں جواہر الکلام اور شرح کبیر حرف آخر کا درجہ پا چکی تھیں. مفتی صاحب غالباً یہاں کے اولین مجتہد تھے جنھوں نے عراقی دلستاں اور قمی اسلوب پر شریعت غرا پیش کی. فقہ جعفری میں آپ کا دست رس دیکھ کے جناب سلطان العلماء نے آپ کو مفتی مقرر کئے جانے کی سفارش کی. بادشاہ نے تاج العلماء و افتخار الفضلاء کے خطاب کے ساتھ تقرر کا پروانہ جاری کیا. اس طرح آپنے بیک وقت مدرسہ سلطانیہ کی معلمی اور مفتی حکومت کی دوہری ذمہ داریاں نبھائیں. ساتھ ہی ساتھ اپنے استاد یگانہ جناب سید العلماء کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ جاری رکھا.

عبادت میں غیر معمولی شغف اور خوف خدا میں مستغرق رہنے کے باوصف مزاج معلی میں خوش طبعی و مزاح کا مادہ نمایاں تھا. حاضر دماغی، برجستہ جوابی میں طاق تھے. نثر کے مانند نظم میں بھی اپنی مثال آپ تھے. اردو، عربی، فارسی شاعری میں یکساں دستگاہ رکھتے تھے جو طبع ہو کے سامنے آیا وہ بھی بہت ہے جو منظر عام پر نہیں آسکا اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں.

غصب اودھ تک مدرسہ سلطانیہ کے ایک مدرس اعلیٰ (سینیئر پروفیسر) اور مفتی حکومت تھے بعد میں آغا میر مرحوم کے فرزند نواب باقر علی خاں صاحب سے متعلق ہو کے کانپور میں قیام رہا پھر سلطان عالم واجد علی شاہ نے یاد فرمایا تو مٹیا برج تشریف لے گئے یہ سلسلہ درمیان میں منقطع ہوا تو لکھنؤ تشریف لائے. سلطان عالم نے پھر زحمت دی تو دوبارہ تشریف لے گئے بادشاہ نے قدر دانی و احترام کی حد کر دی.

مصنفات کی تعداد سوا سو بتائی جاتی ہے جو بیشتر عربی میں ہیں پھر فارسی میں مفتی صاحب کے دو صاحبزادگان جنھوں نے مفتی صاحب کی مسند علم آباد کی. مفتی محمد علی صاحب بڑے اور مفتی احمد علی صاحب چھوٹے فرزند تھے. بڑے مفتی صاحب کی نسل میں اب بھی بحمدہ علم دین باقی ہے جس سے پاکستان کے حضرات مستفید ہو رہے ہیں. جناب مفتی صاحب کی تدریسی و تعلیمی روایت ان کے ارشد تلامذہ و داماد جناب نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب سے آگے بڑھی جو جناب مفتی صاحب کے فرزندوں کی خورد سالی کی بنا پر مفتی صاحب کے جانشین ہوئے اور بحمدہ علم دین کی خدمت اس نسل کے متعدد علماء کے ہاتھوں ہو رہی ہے.

آپکے تلامذہ کی فہرست بہت طولانی ہے ان میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی بھی شامل ہیں جس کے فخر استاد شاگرد مولانا شبلی نعمانی ہوئے اس طرح جناب مفتی صاحب کا شجرۂ علم کمال بکثرت برگ و بار لایا.

کلکتہ سے واپس آکے جناب مفتی صاحب زندگی کے آخری دن لکھنؤ میں بسر کر رہے تھے کہ علیل ہوئے اور مرض جان کے ساتھ رخصت ہوا. مفتی صاحب نے ۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ / ۲۷ مارچ ۱۸۸۹ کو جاں جان آفریں کے سپرد کی جناب غفرانمآب کے امام باڑے کے گورستان میں آسودۂ خاک ہیں.

اب قلم کا سیاح حضرات علمائے اہل سنت کے منتخب تر بزرگوں کی طرف رخ کرتا ہے

مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی

آپ بہ اعتبار عہد مولوی دلدار علی غفرانمآب سے نصف صدی مقدم تھے آپ کی ولادت ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (غالباً ۲۹ جنوری ۱۷۰۴ء) کو قصبہ بلگرام (ہردوئی) میں حسینی سادات کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو واسط (ایران) سے چل کر نرلیس مار تا سرزمین اودھ پروارد ہوا تھا اور بلگرام میں آباد ہو کے اسے عالم خیز زمین بنا دیا یوں تو سارا خطہ اودھ عالم و عارف و زاہد خیز تھا لیکن جس بہتات کے ساتھ خاک بلگرام کے پردے سے عالم نکلے اس کی اپنی ایک الگ شناخت ہے اور یہ شناخت معین کرنے میں آزاد مرحوم کا حصہ کسی سے کم نہیں.

میر غلام علی میر محمد نوح کے گھر میں سید عبدالجلیل ایسے جلیل القدر عالم کی صاحبزادی کے بطن سے پیدا ہوئے آپ کا شجرۂ نسب موتم الاشبال عیسیٰ بن زید شہید سے گزرتا ہوا حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ "موتم الاشبال" کا مفہوم ہے شیر افگن لفظی معنی ہیں۔ شیر کے بچوں کو یتیم بنانے والا۔

میر غلام علی کی تعلیم کا مرحلہ کیسے طے ہوا اس کی نشاندہی کا وسیلہ فی الوقت مہیا نہیں ہے البتہ تکمیل تحصیل سے قبل والی منزل جسے ہم وسطانی سطح کہہ سکتے ہیں پرشکر اللہ حسینی اور میر طفیل محمد کی رہنمائی میں سر ہوئی۔ آزاد خود بتاتے ہیں ؎

شاگرد خاص پر طفیل محمدم　　　اور در علوم عقلی و نقلی ست رہبرم

قیاس قرین یہ ہے کہ والد بزرگوار (میر شکر اللہ) کے سامنے بس حصول برکت کے لئے زانوئے ادب تہہ کیا ہوگا اور اصل استفادہ فرزند نامدار (میر طفیل محمد) کی بزم درس سے کیا۔

ابھی تعلیم کی منزل تمام نہیں ہوئی تھی کہ سن بلوغ کو پہنچتے پہونچتے میر لطف اللہ بلگرامی کے ہاتھ پر طریقۂ چشتیہ میں بیعت ہو گئے۔ یہ سنہ ۱۱۳۰ھ کا واقعہ ہے بہ سنہ ۱۱۳۴ھ میں تکمیل تحصیل کے لئے اپنے جد امجد میر عبدالجلیل کی خدمت میں دہلی پہنچے جہاں میر صاحب ان دنوں سلطان شاہ کی ملازمت میں تھے۔ آزاد نے اپنے نانا کی خدمت میں فقہ، حدیث، سیرت، لغت و ادب میں استفادہ کیا بلکہ عربی و فارسی شاعری میں مشورۂ سخن انھیں بزرگوار سے کیا۔ آزاد اپنے فضل و کمال کو اپنے نانا کا ہی فیضان سمجھتے ہیں۔ اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

آزاد ما کہ فضل و کمالے بہم رساند۔ خدمت نمود حضرت عبدالجلیل را۔

نانا کی خدمت میں آزاد کا قیام دو سال رہا۔ پھر وطن واپس ہوئے۔

سنہ ۱۱۴۲ھ میں اپنے ماموں میر سید محمد کی طلب پر سوستان پہنچے۔ وہاں اپنے ماموں سے فن عروض و قافیہ میں استفادہ کیا اور اس دوران مطالعہ جاری رکھا۔ اور اپنے پہلے فارسی تذکرے "ید بیضا" کے کام کو آگے بڑھایا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ میر سید محمد دوسری سرکاری مہم پر بھیجے گئے۔ یا طویل رخصت پر وطن آ گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں آزاد مرحوم نے ان کی میر بخشی اور وقائع نگار کی حیثیت سے قائم مقامی کی۔ اس کے بعد آزاد نے وطن کی طرف مراجعت کی۔ یہ سفر بہت معلومات افزا رہا۔ مختلف دانشوروں اور علماء سے ملاقات کا موقع ملا۔ جن میں شیخ علی بادی کی ملاقات قابل ذکر ہے جنھوں نے آزاد کی علمی جلالت سے متاثر ہو کے اپنے ہاتھ سے کچھ اشعار لکھ کے بطور یادگار ہدیہ میں دئے۔

آزاد کے والد میر محمد نوح نواب شاہ نواز خاں صوبے دار الہ آباد کی سرکار میں میر ساماں کے منصب پر فائز تھے۔ میر صاحب اپنے دونوں بیٹوں کو نواب کی حضوری میں دربار لے گئے وہاں جو کچھ گذری اس سے بددل ہو کے آزاد اپنے باپ اور بھائی کو چھوڑ کے واپس چلے آئے کہ یہاں کی عاجزی اور خاکساری سے حاکم حقیقی کی طرف رجوع کیوں نہ کیا جائے۔

بظاہر اس واقعہ سے متاثر ہو کے آزاد نے حرمین شریفین کی زیارت کا قصد کر لیا۔ یہ منزل پا پیادہ سر کرنے کے لئے رجب سنہ ۱۱۵۰ھ میں گھر سے نکل پڑے راستے میں سرونج نامی مقام پر نواب آصف جاہ نظام دکن کے حضور میں وارد ہوئے جو جذبۂ للّٰہیت نواب سربلند خاں کی سرد مہری سے اُبھا تھا یہاں پہنچ کر کچھ کمزور پڑ گیا اور حسن طلب میں آصف کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ رباعی نذر کی ؎

اے حاکم دیں محیط جود و احساں　　　حق داد خطاب آصف شایاں

او تخت بدرگاہ سلیماں آورد　　　تو آل نبی را بدر کعبہ برساں

نواب نے عرض داشت قبول کی اور وسائل سفر مہیا کرا دئے۔

آزاد مالوے سے صورت پہنچے اور پھر وہاں سے چل کے جدہ کی بندرگاہ پر اترے اور سنہ ۱۱۵۱ھ انھوں نے حج و زیارت میں بسر کیا۔ اور "عمل اعظم" سے اس کا مادۂ تاریخ برآمد کیا۔

ہر چند کہ آزاد کا یہ سفر بیت خدا کے حج و بیت رسول کی زیارت کی نیت سے تھا۔ لیکن ان کے ذوق علم کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے کہ اس موقع کو بھی انھوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور انھوں نے مدینہ منورہ میں صحاح ستہ پڑھے مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو علم حدیث میں ہی شیخ عبدالوہاب سے کچھ استفادہ کیا۔ حج کی بجا آوری کے بعد سنہ ۱۱۵۲ھ میں وطن واپس پہنچے "سفر بخیر" مادۂ تاریخ ٹھہرا۔

کچھ دن اورنگ آباد و حیدرآباد میں قیام رہا پھر سنہ ۱۱۵۸ھ سے سنہ ۱۱۶۴ھ تک نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بعد کا زمانہ بھی یہیں گزارا۔ اسی دوران جواں سال بیٹے میر نور الحسین کا داغ دیکھا۔ اس غم نے میر صاحب کو نڈھال کر دیا پھر بھی دس سال حیدرآباد میں گزارے۔ سنہ ۱۱۸۰ھ میں آصف جاہ ثانی نے رحلت کی تو آزاد اورنگ آباد مستقلاً چلے گئے۔

میر صاحب نے کبھی بزم درس سجائی ہو اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن فن شعر میں میر صاحب نے مستفید ہونے والوں کے نام بکثرت ملتے ہیں۔ لیکن خدا رسیدہ اور مقبول بارگاہ عالم متورع کی حیثیت سے اول کی قدر و منزلت

زندگی میں بھی ہوئی. بعد وفات مزار زیارت گاہ خلائق بن گیا۔ یہ مزار اول والدین کا خصوصی مرجع رہا جو اپنی اولاد کو علم و فضل کا سرمایہ دار بنانا چاہتے تھے. وہ لوگ اپنے بچوں کو آزاد کے مزار پر لے جاتے اور قبر پر جو مصری کے ٹکڑے یا شکر کے ریزے پڑے ہوتے انھیں چاٹنے کے لئے اپنے بچوں سے کہتے. عقیدہ یہ رکھتے کہ اس عمل کی بدولت ان کی اولاد علم و عمل کی شیرینی سے شاد کام رہے گی.

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میر صاحب کے بزم درس آراستہ کرنے کی نہ کوئی تفصیل ملتی ہے اور نہ علم فقہ میں کوئی تصنیف ملتی ہے لیکن اول کی کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کے چار ابواب میں سے پہلا باب ہندوستان میں قرآنیات و حدیث کی جو اس وقت تک خدمت ہوئی اس کے ذکر پر مشتمل ہے. دوسرا باب میں ممتاز ہندوستانی علماء کا ذکر ہے. ادب، تاریخ، سوانح میں ان کے قلم نے وافر ذخیرہ پیش کیا. ان کی تصنیف مآثر الکرام کا شمار تذکروں میں کیا جاتا ہے لیکن خود مصنف علام نے اسے بلگرام کی تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے اس میں بلگرام اور مضافات کے تقریباً ۱۵۰ عارفوں اور فاضلوں کا ذکر ہے. اس طرح تقریباً ایک سو ساٹھ فارسی اور اردو شعراء کا تذکرہ ہے جس میں ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی کے بیان کے مطابق تیس شاعر بلگرام خاص کے ہیں. اس لئے ڈاکٹر عابدی نے اسے اہم تذکرہ قرار دیا ہے [۱۲]. اس کے علاوہ آزاد کے تین تذکرے اور ہیں. ان کے قلمی آثار کا احاطہ اس مضمون میں مقصود نہیں ہے.

میر غلام علی آزاد کے سن رحلت میں اختلاف ہے. بعض اہل قلم نے ۱۱۹۴ھ لکھا ہے. ایسی تاریخیں بھی دستیاب ہیں جس سے ۱۱۹۴ھ برآمد ہوتا ہے. بعض لوگوں نے ۱۲۰۰ھ سن وفات تحریر کیا ہے. اس کا مادہ "آہ غلام علی آزاد" پایا جاتا ہے. اس اختلاف تصفیہ کے لئے جس تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے امید ہے کہ ہمارے تحقیق کاروں میں سے کوئی مستعد اس کی طرف توجہ کرے گا. لیکن ڈاکٹر تقی علی کا کہنا ہے کہ:

> "... ۱۱۹۵ھ میں شاہ برہان الدین غریب کے مزار کے قریب زمین خریدی اور اس کا نام "عاقبت خانہ" رکھا. بالآخر ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا." [۱۳]

اس لئے قوی رجحان ۱۲۰۰ھ ہی کے سن وفات ہونے کا ہے. عشقی اور میر غلام رسول بلگرامی نے جو مادہ ہائے تاریخ برآمد کئے ہیں دونوں میں واو کے محذوف ہو جانے سے چھ کی کمی کا امکان یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا. اس کے علاوہ ۱۲۰۰ھ والی روایت میں تاریخ بھی ۲۱ ذیقعدہ نہیں ہے جو اس کے قرین صحت ہونے کی دلیل ہے. ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر ۱۱۹۴ھ کو سن وفات تسلیم کریں تو ۱۱۹۵ھ میں زمین کی خریداری کا واقعہ غلط ہو جائے گا. لہٰذا جب تک تحقیق عمل کسی قطع و یقین تک نہ پہونچا دے تب تک ۱۲۰۰ھ ہی کو میر کا سن وفات سمجھنا چاہئے مالک رام صاحب نے بھی یہی کہا ہے اور ان کا ماخذ اتحاف النبلاء اور خم خانۂ جاوید ہو [۱۴].

یہاں ایک پہلو کی طرف اشارہ شاید طلاب اور مبتدی تحقیق کاروں کے لئے سود مند ہو وہ یہ ہے کہ اس بات کو دیکھا جائے کہ میر صاحب کی کہی ہوئی تاریخیں کس سنہ تک کی ملتی ہیں. آزاد مرحوم کو تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ تھی اور بکثرت مادہ ہائے تاریخ ان سے یادگار ہیں.

بلگرام کی سرزمین جیسا کہ عرض ہوا بڑی عالم خیز تھی. یہاں کے صدہا بزرگوار بلا مبالغہ مثلاً علامہ مرتضیٰ بلگرامی، سید عبدالجلیل بلگرامی وغیرہ متقدمین ہیں. اور عماد الملک سید حسین بلگرامی وغیرہ متاخرین میں اس کے مستحق تھے کہ ان کے ذکر جمیل سے اس تحریک کی زینت بڑھائی جاتی مگر افسوس ہے کہ مضمون کو طول عمل سے بچانے کی خواہش سدّ راہ ہے.

اب ہم خیرآباد کی طرف رجوع کرتے ہیں. اودھ کا یہ تاریخی قصبہ بھی علماء فضلاء و شعراء کا بڑا مخزن رہا ہے.

(باقی آئندہ)

حواشی

۱. اس کی پہلی اشاعت ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی سے ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی. اور وہی اشاعت پیش نظر ہے۔ (۲) اعلام و افکار، سبط محمد نقوی ص ۱۳ بحوالہ مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۰۵ (۳) ایضاً. (۴) مطلع انوار سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ص ۳۲-۲۱ بحوالہ شیعیت کی تاریخ، محمد باقر شمس ص ۱۲ (۵) ایضاً. (۶) سوانح حیات حضرت غفرانمآب سید آغا مہدی لکھنوی ص ۴۲ (۷) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارکپوری ص ۱۱۱ بحوالہ مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴ (۸) سوانح حیات حضرت غفرانمآب. سید آغا مہدی لکھنوی ص ۱۷ (۹) انجلی شاہ، سبط محمد نقوی ص ۲۲۲ (۱۰) ایضاً ص ۲۰-۱۱۹ (۱۱) مطلع انوار صفحہ ۳۸۲ (۱۲) ماہنامہ العلم بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۹۳ء مضمون ڈاکٹر محمد تقی علی ص ۹۶. (۱۳) ایضاً (۱۴) تذکرۂ ماہ و سال. مالک رام ص ۹۶.

□□
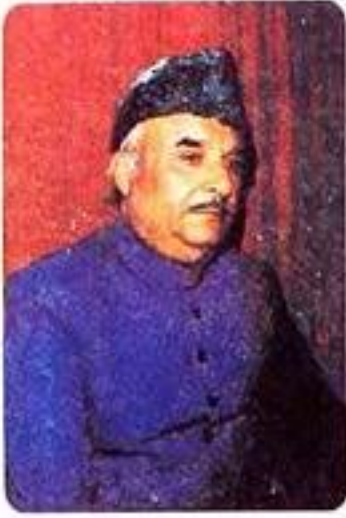
اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱ - نیا گاؤں (ایسٹ)
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

لکھنؤ کا رثائی ادب

اور میر خلیق کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

مرثیہ رثا سے مشتق ہے اور اس کے معنی کسی عزیز کے گزرنے پر رنج و ملال کا اظہار کرنا ہے۔ اردو ادب میں مرثیے کا اطلاق شہدائے کربلا کے آلام و مصائب اور ان کی مظلومیت کے خوں چکاں واقعات کے بیان کرنے پر ہوتا ہے۔ مرثیہ کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں اتنا عروج حاصل ہوا کہ ناقدینِ ادب نے اسے ایک اہم صنف کے طور پر تسلیم کیا ہے اور جتنا لٹریچر اس میں فراہم کیا گیا ہے وہ دنیائے ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

مرثیہ عزاداری کی آغوش میں پروان چڑھا اور اس کے ارتقا کے لیے لکھنؤ کا ماحول سازگار ثابت ہوا۔ اودھ میں عزاداری کی ابتدا باقاعدہ طور پر نواب سعادت خاں برہان الملک میر محمد امین نیشاپوری (متوفی ۱۷۳۹ء) کے عہد میں اس وقت ہوئی جب قاضی محمد عاقل نے بابری مسجد کی مرمت کرائی اور پھر انہی کی اجازت سے باقی شاہ فقیر نے مسجد کے چبوترے پر ایک تعزیہ رکھا۔ نواب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے داماد مرزا محمد مقیم نواب صفدر جنگ (متوفی نومبر ۱۷۵۴ء) نے اودھ میں فیض آباد کی بنیاد ڈالی۔ موصوف نے عزاداری کو فروغ دینے کے لئے امام باڑے تعمیر کیے۔ ان کی بیوی صدر جہاں بیگم (متوفی ۱۷۹۶ء) نے موتی باغ کے عقب میں ایک عالی شان امام باڑہ ۱۷۶۴ء میں تعمیر کیا۔ اس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ بعد ازاں ان کے صاحبزادے نواب شجاع الدولہ بہادر (متوفی ۱۷۷۵ء) نے اپنی بیوی نواب بہو بیگم امۃ الزہرا (متوفی ۱۸۱۵ء) کے لئے فیض آباد میں ہی اپنے حرم سرا موتی محل میں ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کیا اس کے بھی آثار اب تک موجود ہیں۔

فیض آباد میں ہی جواہر علی خاں خواجہ سرا (متوفی ۱۷۹۹ء) نے نواب شجاع الدولہ کی زندگی میں کاٹھ کا ایک وسیع امام باڑہ بنایا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد داراب علی خاں خواجہ سرا (متوفی ۱۸۱۸ء) نے اس میں توسیع کی اور اسے پختہ بنایا۔ اس وقت یہ فیض آباد کا سب سے بڑا امام باڑہ ہے۔ جواہر علی خاں بہو بیگم کے خزانے کے وزیر تھے۔ بیگم صاحبہ انھیں نواب ناظر کے نام سے پکارتی تھیں اور اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ میر حسن، نواب ناظر کی رفاقت میں فیض آباد میں رہتے تھے۔ انھوں نے اس امیر کبیر کی حویلی کی تعریف میں ایک مثنوی "قصر جواہر" کے نام سے لکھی۔ فیض آباد میں نواب حسن رضا خاں سرفراز الدولہ (متوفی ۱۸۰۱ء) نے ۱۷۶۵ء میں اپنے امام باڑے میں علم نصب کیا تھا۔ اس کی ایستادگی کی تاریخ مرزا سودا نے کہی ہے

صدق دل سے ترا جو برپا ہے	اں علم نذر حضرت عباسؑ
سر ترے سایا اس علم کا ہے	سال تاریخ اس علم کی ہے یہ

۱۱۷۹ھ

نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ امام باڑوں میں مجلسیں ہوتی تھیں اور شعرا مرثیے پڑھتے تھے۔ جن لوگوں نے مرثیے میں مہارت حاصل کی تھی، ان میں سے چند شعرا یہ ہیں۔

افسردہ (مرزا پناہ علی)، میر امانی حسن (میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان)، جرأت (میاں قلندر بخش)، خُلق (میر احسن خلق)، خلیق (میر مستحسن)، درخشاں (مرزا منکو بیگ)، سودا (مرزا محمد رفیع)، صبر (میر محمد علی)، ضاحک (میر ضاحک)، فغاں (اشرف علی)، گماں (نذر علی)، مقبل (اکبر علی خاں)، گدا (مرزا گدا علی)۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند نواب آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۷۹۷ء) ۱۷۷۵ء میں مسند وزارت پر رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے کچھ ہی دنوں کے بعد فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ ان کے ساتھ اور لوگوں کے علاوہ شعرا کا قافلہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے قبل لکھنؤ کی کوئی رونق نہ تھی اور وہ دیہات سے بھی بدتر تھا۔ یہاں کی زمین پست و بلند تھی۔ بازار، گلی کوچے نہایت ہی تنگ اور محدود تھے۔ میر حسن (متوفی ۱۷۸۸ء) جب پہلی بار دارالخلافہ بننے سے قبل لکھنؤ آئے تھے تو انھوں نے لکھنؤ کی ہجو کہی تھی۔ وہ مثنوی گلزار ارم میں لکھتے ہیں ؎

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں   نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے ازبس دل پہ ڈیرا   لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا   کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
یہ گلِ سے گلی یوں تر رہے ہے   بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی   کہیں پستی ہے اور گاہے بلندی
جو کوئی مدت کو بھولے یہاں گھر   پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در
چڑھے ہے گو مستی جب گرد آکر   حباب آسا ہے پھرتے ہیں سب گھر
سوائے تودۂ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

نواب آصف الدولہ بہادر نے یہاں وارد ہوتے ہی تعمیرات شروع کیں محلوں کے محلے آباد کیے، سڑکیں بنوائیں، بازار لگوائے۔ جب میر حسن دوبارہ لکھنؤ آئے تو یہاں کی حالت کچھ اور ہی دیکھی۔ اب شہر کی ترقی اور گہما گہمی دیکھ کر کہتے ہیں ؎

رہے نت آصف الدولہ سلامت   کہ جس نے کی یہاں طرحِ اقامت
عمارت کی یہاں وہ اس نے بنیاد   کہ نظارے سے ہو جیسے جہاں شاد
مٹادی اس نے سب یاں کی کدورت
بنائی لکھنؤ کی ایک صورت

لکھنؤ کی تمام عمارات میں بڑا امامباڑہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ہندوستان کے طول و عرض میں فنِ تعمیرات کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کئی سال تک جاری رہی۔ بالآخر ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔ مادۂ تاریخ یہ ہے :—

"رواقِ عرش جناب ائمہ اطہار" : ۱۲۰۵ھ

آصف الدولہ بہادر جو شاعر بھی تھے، اپنے امامباڑے میں نو تصنیف مرثیہ ایام محرم میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے ارد گرد امرا و رؤسا کے علاوہ شعرا کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ عزاداری کے سیاہ پوش اور غم آلود ماحول نے امرا اور شعرا کو اس قدر متاثر کیا کہ بہت سے امامباڑے اور مرثیہ گو شعرا وجود میں آگئے۔ راجہ جھاؤلال (متوفی ۱۸۱۳ء) نے ٹھاکر گنج میں ایک وسیع امامباڑہ تعمیر کیا۔ اس کے نو در اور چار دیواریں اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ ان کے علاوہ راجہ ٹکیٹ رائے (متوفی ۱۷۹۹ء)، افتخارالدولہ راجہ میوارام (متوفی ۱۸۶۷ء)، راجہ بلاس رائے رنگین، جگن ناتھ (خطاب شرف الدولہ) متوفی ۱۸۶۲ء، نے بھی امامباڑے اور کربلائیں تعمیر کیں، ان میں کاظمین آج بھی مرجع خلائق ہے۔ شرف الدولہ نے کاظمین کے علاوہ گھڑیالی میں بھی امامباڑہ بنایا تھا، اس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ایک مشہور ہندو رئیس ولادام تھے۔ وہ بھی عزاداری شان و شوکت سے کرتے تھے۔ انھوں نے امامباڑہ تعمیر کیا۔ اس میں میر انیس اور ان کے بعد میر نفیس پڑھتے تھے۔ ان امامباڑوں میں جو مجلسیں برپا کی جاتی تھیں ان میں شعرا مرثیہ ہی پڑھتے تھے۔ مجلسوں میں ہندو لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ انھیں تعزیوں سے بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی گھروں میں تعزیے رکھتے تھے۔ ایک انگریز خاتون مسز میر حسن علی لندنی اپنی کتاب (آبزرویشنز آن دی مسلمانز آف انڈیا، ۱ مرتبہ کروک ۱۸۳۲ء لندن) میں لکھتی ہیں :

"ہندوستان میں کسی شیعہ مسلمان کا گھر تعزیہ سے خالی نہیں ہوتا، ہندوؤں کو تعزیوں سے کافی عقیدت ہے چنانچہ تعزیہ دیکھ کر یہ لوگ مؤدبانہ جھک جاتے ہیں۔ مجالس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور مسلمان انھیں بخوبی بٹھاتے ہیں۔ اس طرح امامباڑوں میں ہر مذہب کا آدمی صرف جوتا اتار کر داخل ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سوائے انگریزوں کے کسی اور سے امامباڑے کے باہر جوتا اتارنے کے لئے کہنا بھی نہیں پڑتا۔"

ایک اور انگریز خاتون، جس نے لکھنؤ میں محرم دیکھا تھا اور جس کا نام مِسں فانی پارکس تھا، اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

"یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیعوں کے علاوہ سُنّی اور ہندو بھی ایّام محرم میں اپنے گھروں میں تعزیے رکھتے ہیں میرا باورچی ایک مجوسی تھا، وہ بھی محرم میں تعزیے پر کم سے کم چالیس روپئے خرچ کر کے ایک پرجوش مسلمان کی طرح عزاداری کے مراسم بجالاتا تھا۔ عاشورہ کے دن اپنے تعزیے کو کربلا میں دفن کرنے کے بعد پھر وہ اپنے دھرم کی پیروی کرنے لگتا تھا۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کی مزید تائید مرزا محمد حسن قتیلؔ لکھنوی (متوفی ۱۸۔۱۸۱۷ء) سے بھی ہوتی ہے۔ وہ "ہفت تماشا" ص ۱۵۶ میں لکھتے ہیں کہ:

"لکھنؤ میں خدا کے فضل سے ہندو بھی تعزیہ دار، مرثیہ گو اور مرثیہ خوان ہیں۔"

غرضیکہ لکھنؤ میں جن اماماڑوں میں مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں، وہاں مرثیہ پڑھنا لازم و ملزوم تھا۔ مرثیہ ابتدا سے ہی آغوش شاہی میں پروان چڑھا تھا، اس لئے مرثیہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا ہوگئی جو عمر بھر مرثیے ہی کہتے رہے۔ مرثیہ زمانہ قدیم میں غزل اور مربع کی صورت میں محدود اشعار میں لکھا جاتا تھا اور اس قسم کے مرثیے محض رونے اور رلانے کے لیے پڑھے جاتے تھے۔ ان میں کوئی ادبی شان نہیں ہوتی تھی۔ اس قسم کی مثالیں دکنی ادب میں ملتی ہیں۔ لکھنوی شعراء نے اس کی ہیت اور روایت میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ سب سے پہلے اس کے لیے مسدس کا بہترین پیکر استعمال کیا گیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے پرانے مرثیہ گو شعراء جن کے مرثیے بڑی تعداد میں مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، قابل ذکر ہیں:

احسانؔ، اعجازؔ، افسردہؔ، بشیرؔ، ترقیؔ، حامدؔ، حیدریؔ، خادم رضاؔ، سوداؔ، شریفؔ، عالمؔ (مرزا محمد عالم)، عزاؔ، کرمؔ، گداؔ، مقبلؔ، مذنبؔ، مشرقؔ، میرؔ، ناظمؔ، ہوسؔ، میر گھاسی اور مہربانؔ ان تمام شعراء نے مسدس میں ہی مرثیے کہے تھے اور یہ ذخیرۂ ادب اور راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں مرثیہ کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اس دور میں مرثیے میں تنوع اور جدت آگئی اور اس کے اجزائے ترکیبی بھی ایجاد کیے گئے۔ میر خلیقؔ، میاں دلگیرؔ، میر ضمیرؔ، مرزا سید فصیحؔ، ذہینؔ، عزاؔ وغیرہ نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ میاں دلگیر کی چھ، میر ضمیر کی ایک اور میرزا فصیح کی دو جلدیں آج سے سو سال پہلے چھپ چکی تھیں۔ یہ جلدیں اب بہت کمیاب ہیں۔

سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں جو مرثیہ گو مشہور ہو چکے تھے اور جن کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فسانۂ عجائب" میں میاں دلگیر کے ضمن میں کیا ہے، یہ ہیں:

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن، نیک ضمیر خلیقؔ، فصیحؔ مرد مسکینؔ، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظمؔ خوب، دبیرؔ مرغوب، سکندرؔ بصورت گداؔ، بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا، عرصۂ قلیل میں سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"

فن مرثیہ کو اودھ کے آخری تاجدار حضرت واجد علی شاہ کے عہد میں اتنا عروج حاصل ہوا کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ افسوس کہ سلطنت اودھ کے انتزال کے بعد ہی مرثیہ کا فن بھی رو بہ زوال ہوا۔ انیسؔ و دبیرؔ، انسؔ و مونسؔ، عشقؔ و تعشقؔ اور نفیسؔ کے پہلو بہ پہلو ہندو شعراء نے بھی مرثیے میں نام پیدا کیا۔ ان میں دیا کشن ریحانؔ، راجہ الفت رائے الفتؔ، کنور دھنپت رائے محبؔ، رام پرشاد بشیرؔ، میندولال زارؔ، گر بخش رائے اور لالہ حسین بخش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرثیہ گوئی کے آخری دور میں اوجؔ، عروجؔ، پیارے صاحب رشیدؔ اور عارفؔ وغیرہ نے اس فن کو متنوع مضامین سے دوچار کیا۔ آزادی سے قبل جن ہندو شعراء نے مرثیہ کے فن میں مظاہرہ کیا، اور جو لکھنؤ کی عزاداری کے ماحول سے متاثر ہوئے تھے ان میں نانک لکھنوی، دلّو رام کوثریؔ، روپ کماری، فراقؔ دریابادی، منی لال جوانؔ اور یوگیندر پال صابرؔ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ مجالس عزا میں مرثیہ پڑھتے تھے انھوں نے متعدد مرثیے کہے ہیں جو راقم الحروف کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ جوشؔ نے اپنے انقلاب آفریں مرثیوں میں تحریک آزادی کے

ولولوں اور اُمنگوں کو اُجاگر کر کے اہلِ استبداد اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ان کے مرثیے قابلِ مطالعہ ہیں۔ ایسا قادر الکلام شاعر اب کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کا مرثیہ "حسین اور انقلاب" معرکے کی چیز ہے۔

اُردو مرثیہ ہر اعتبار سے بھائی چارہ اور قومی یک جہتی کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی سیرت ہر بنی نوع انسان کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ انھوں نے سچائی، اتحاد وحدت اور انسانیت کے بلند اصولوں کے تحفظ کے لیے عظیم ترین اور بے مثال قربانی پیش کی، وہ آزادی پسند تھے۔ جیو اور جینے دو یعنی صلح پسندی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ وہ فتنہ و فساد اور جاہ و اقتدار سے دور رہ کر زندگی گزارنا چاہتے تھے اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتے تھے۔ مرثیوں میں انہی زریں اصولوں کا احیاء کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندستانی تہذیب کے اعلیٰ عناصر محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذُوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

صندل اور مانگ ہندستانی عورتوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں دونوں عناصر عرب کی عورتوں میں مفقود ہیں۔ اب جبکہ ہندستانی عورت دُعا کے طور پر صندل اور مانگ کے الفاظ استعمال کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو دُعا حضرت زینب کرتی ہیں' ایسے موقعوں پر وہ محل کی مناسبت سے موزوں ترین ہے۔ کسی عورت کا عورت کو دعا دینا کہ مانگ صندل سے بھری رہے' اس کا یہ مدّعا ہرگز نہیں کہ فی الواقع مانگ میں صندل بھرا ہوا ہو۔ بلکہ یہ کہنا ہے کہ سہاگ قائم رہے۔ شوہر زندہ رہے۔ علاوہ بریں ہندو عورتیں مانگ میں صندل نہیں بلکہ سیندور بھرتی ہیں۔ صندل بطور قشقہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ امر قطعًا غیر متعلق ہے کہ عرب عورت اس حالت میں کیا دعا مانگتی ہے۔ جہاں تک ہندستانیوں کے جذبات کا تعلق ہے یہ دُعا بالکل نیچرل ہے اور انیس کے مخاطب ہندستانی ہیں نہ کہ عرب کے مسلمان۔ یہ مرثیہ نگاروں، خاص کر انیس کا کمال ہے کہ انھوں نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے ان میں ایک حد تک ہندستانی فطرت کو بھی شامل کر لیا ہے۔

لکھنؤ کی مجالس میں صاحبانِ فہم کا مجمع رہتا ہے۔ اس میں ہندو وغیرہ بھی شرکت کرتے ہیں اور باادب ہمہ تن گوش ہو کر مرثیہ سنتے ہیں انیس ایک مرثیے میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بند انیس کی کسی جلد میں نہیں ہیں بلکہ ایک قلمی نسخے میں موجود ہیں' جو راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان میں سے صرف دو بند جن کے پہلے مصرعے یہ ہیں ؎

(۱) ہر چند بے ثبات ہیں یہ آسمان اساس
(۲) ذی علم و نکتہ فہم و سخن سنج و ذی شعور

پروفیسر ادیب مرحوم نے ایک رسالہ "ادب" لکھنؤ بابت مئی ۱۹۳۱ء صـ۳۵ میں "عکس تحریرِ حضرت انیس مغفور" کے عنوان سے ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع کیے:۔

"خدائے سخن میر انیس مغفور نے غدر کے بعد اُجڑے ہوئے لکھنؤ کی تعریف میں سولہ بند کہہ کر کسی مرثیے میں شامل کر دیئے تھے۔ یہ بند ایک دُو ورق پر خود حضرت مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مغفور کے پڑوتے جناب محمد حسن صاحب فائز کے پاس موجود ہیں۔ انھیں میں سے نویں اور دسویں بند کا عکس ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ناظرین اس یگانۂ روزگار کی شانِ خط سے اپنی آنکھیں روشن کریں!" (ادیب)

ہماری تحقیق کے مطابق مرثیے کے یہ بند انیس کے اس مرثیے میں موجود ہیں جو راجہ صاحب کے کتب خانے میں ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

جب لشکرِ خدا کا علَم سرنگوں ہوا (۲۳۱ بند)

ہر دل ہے عندلیب گلستانِ لکھنؤ　　رضواں بھی ہے ارم میں ثناخوانِ لکھنؤ
گلزار مومنیں ہے زہے شانِ لکھنؤ　　نعرے علی علی کے ہیں قربانِ لکھنؤ
کیوں سُرخرو نہ ہو چمن سبزوار ہے
دیکھو کہ اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے
مالی بھی اس مرقعِ ماتم میں دنگ ہے　　گلشن کو صدقے کیجیے یہ مجلس کا رنگ ہے

نوحوں میں ان کے نالۂ بلبل کا ڈھنگ ہے   ماتم کے ولولے میں بکا کی امنگ ہے

دس روز ماتمِ شہِ دیں میں گزرتے ہیں
جیتے رہیں یہ لوگ کہ رونے پہ مرتے ہیں

مجلس کا انتظام اسی شہر پر ہے ختم   رونے کا اہتمام اسی شہر پر ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پر ہے ختم   بس ماتمِ امام اسی شہر پر ہے ختم

پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

سب عارفِ حق خلفِ بوتراب ہیں   شیدائے نام سبطِ رسالت مآب ہیں
سرگرم کارِ خیر و شریکِ ثواب ہیں   بے شک یہ کوثری ہیں کہ آنکھیں پُر آب ہیں

روتے ہیں ذکرِ قتلِ شہِ خوش خصال پر
موتی نثار کرتے ہیں زہراؑ کے لال پر

ذی علم، نکتہ فہم، سخن سنج و ذی شعور   ذی قدر، ذی وقار، فروتن، سخی، غیور
نخوت نہ خود سری، نہ تکبر نہ مکر و زور   وضعیں درست، قلب صفا اور رخوں پر نور

کیونکر نہ فرش و عرش پہ یہ نیک نام ہیں
آقا حسینؑ سا ہو تو ایسے غلام ہیں

سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ہندستانی معاشرہ روبہ تنزل ہوا ہے اور ترقی پذیر زمانے میں انسانی افکار و خیالات میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فقدان ہو رہا ہے جہاں لوگ مذہبی معاملات میں دور ہوتے جا رہے ہیں وہاں عزاداری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ منی لال جوآں سندیلوی اپنے ایک مرثیے کے چہرے میں کہتے ہیں ؎

ہم شانِ خلد کوچہ و بازارِ لکھنؤ   جامِ جہاں نما در و دیوارِ لکھنؤ
حوریں بھی آتی ہیں پئے دیدارِ لکھنؤ   حق سے ملائکہ ہیں طلب گارِ لکھنؤ

ہر شخص کی زباں پہ ہے چرچا حسینؑ کا
سایہ ہے لکھنؤ پہ شہِ مشرقین کا

بے شک عزائے شاہ کا مرکز ہے لکھنؤ   وہ اہلِ شہر ہیں کہ فرشتوں کی جن میں خو
لاکھوں ملیں گے ایسے جو رہتے ہیں باوضو   پتھر پسیج اٹھے وہ لہجے میں گفتگو

بزمِ عزا سے مات ضیا کہکشاں کی ہے
قرباں مجلسوں میں فضا آسماں کی ہے

ایسا ہے کون جس کو نہیں ہے غمِ امام   سبطِ نبیؐ پہ بھیج رہا ہے ہر اک سلام
ہیں اہلِ لکھنؤ پہ عزاداریاں تمام   شہؑ نے گلا کٹا کے کیا ہے بلند نام

سب کو جواں ہے یادِ شہِ مشرقین کی
ہر دل میں ایک قبر بنی ہے حسینؑ کی

انیس اور دبیر نے مرثیے کے فن میں زبردست تبدیلی رونما کی اور اپنے متنوع مضامین اور طرزِ ادا کی جدت سے اس کو رزم نگاری سے ہمکنار کیا۔ اس طرح دو کتابیں مرتب کی گئیں۔ ایک رزم نامہ انیس (مسعود حسن رضوی) اور رزم نامہ دبیر (ذخیر لکھنوی)۔ انیس کے مرثیے فن تنقید نگاری کے بانی ارسطو کے مقرر کردہ اصولوں کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں مبالغہ کی خوبیوں کے علاوہ المیہ عناصر بھی بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ابتدا، درمیانی کڑیاں اور خاتمہ کے اجزا ملتے ہیں اور یہ ایک ہی نشست میں ختم ہوتے ہیں۔ وہ مرثیے کے اسلوب کے بارے میں کہتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خالِ سیاہ چہرۂ گل رو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

میر انیس اپنے والد میر خلیق کے شاگرد تھے۔ وہ فخر سے کہا کرتے تھے ؏

حقا کہ یہ خلیق کی ہے سرسبز زباں

خلیق کے مرثیے اپنی سلاست زبان اور فصاحت و محاورات کے اعتبار سے ادبا و شعرا کے لئے ایک معیار اور محک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے تینوں بیٹے انیس، انس اور مونس، ان کے پوتے اور پرپوتے سب مرثیہ گوئی میں اپنے اپنے وقت میں استاد مانے جاتے تھے۔ ہندستانی مسلمانوں کے آخری دورِ تمدن کا یہ بھی ایک زمانہ ہے جو معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہی نسل سات پشتوں تک مسلسل شعر و شاعری کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر قائم رہی۔ غالباً دنیا کے کسی تمدن میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میر خلیق نے صحتِ محاورہ او بیان کی سادگی اور لطافت کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس کا نفسِ شعر مصحفی سے

قطعی متاثر نظر نہیں آتا۔ ان کے گھر میں کئی پشت سے شاعری کا چرچا تھا اور لکھنؤ کے سارے باکمال ان کے خاندان کی زبان سیکھنا فخر سمجھتے تھے خلیق نے جو کچھ سیکھا میر حسن سے سیکھا۔ خلیق صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ دیوان اب نایاب ہے۔ راقم کو ان کی متعدد غزلیں دستیاب ہوئیں جن کے اشعار کی تعداد ۲۲۱ ہے۔

میر خلیق (متوفی ۱۸۴۴ء) کے مرثیوں کی کوئی جلد نہیں چھپی ہے ناقدینِ ادب مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ خلیق کے مرثیے ان کے ساتھ ہی دفن ہو چکے ہیں۔ شبلی کا یہ بھی کہنا درست نہیں کہ انیس سے پہلے عون و محمد کی روایت کا سرے سے کہیں پتہ نہ تھا۔ (موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۵۵ الٰہ آباد ایڈیشن ۱۹۳۶ء) خلیق نے ان دونوں شہزادوں کے حال میں متعدد مرثیے کہے ہیں۔ مثال میں ذیل کے مرثیے پیش کیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) جب کہ زینبؑ کے پسر جنگ کو آئے رن میں (۵۸ بند)
سال کتابت ۳ر جمادی الاول ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء)

(۲) جب گرے گھوڑوں سے زینبؑ کے پسر میدان میں (۶۰ بند)
سال کتابت ۱۰ر شوال ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء)

(۳) رن کی جب قاسمؑ و عباسؑ نے رخصت پائی (۳۶ بند)
سال کتابت ۹ر رمضان ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۴ء)

آج سے کوئی ۲۵ سال قبل ادیب مرحوم کے ذخیرۂ مراثی میں میر خلیق کے مراثی کی چار ضخیم غیر مطبوعہ جلدیں راقم کی نظر سے گزریں۔ ان کی تعداد ۳۴۶ ہے۔ بعض مرثیوں کے ایک سے زیادہ نسخے بھی ہیں۔

علاوہ بریں راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں کوئی ۷۵ نسخے دستیاب ہوئے۔ ان سبھی مرثیوں کی فہرست ہم نے "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" میں تفصیلات کے ساتھ مرتب کی ہے۔ خلیق کے دیوان سلام کی فہرست بھی کتاب میں شامل ہے۔ ہم نے مراثی خلیق کی ایک جلد بھی ترتیب دی ہے اس میں ۳۰ غیر مطبوعہ مرثیے ہیں۔ ذیل میں ہم میر خلیق کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ کے ابتدائی چند بند درج کرتے ہیں۔

اس میں ۱۲۹ بند ہیں۔ اس مرثیے سے یہ روایت بھی کالعدم ہو جاتی ہے کہ انیس اور دبیر سے قبل مرثیوں میں بندوں کی تعداد ۵۰، اور ۶۰ کے درمیان ہوتی تھی۔ مقطع میں خلیق نے میر ضمیر (متوفی ۱۸۵۲ء) کا نام بھی لیا ہے۔ مرثیے میں حضرت عباس کا سراپا بڑی نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کھینچا گیا ہے۔ اس کا طرزِ اسلوب لاجواب اور برجستہ ہے۔ سادگی، شگفتگی اور روانی قابلِ ستائش ہے۔ استعارے پُرلطف، تشبیہیں دلآویز، بندشیں چُست ہیں۔ مرثیے میں آمد، رفت، رجز، جنگ، شہادت اور بین کے متنوع مضامین اچھے ڈھنگ سے استعمال کیے گئے ہیں۔ غرضیکہ شاعر کی قادر الکلامی، مضامین کی پختگی اور مکالمہ نگاری کے گوناگوں خوبیوں سے مرثیہ لبریز ہے ؎

ہاں آمدِ برادرِ شاہِ شہید ہے
لرزاں مثالِ بید سپاہِ یزید ہے
مشہورِ دو جہاں یہ شجاع و سعید ہے
صبحِ شبِ قتال اسے روزِ عید ہے
غُل ہے کہ یہ دلیر ہے ابنِ دلیر ہے
یہ غازیوں کا غازی ہے شیروں کا شیر ہے

شاہِ سریرِ منصبِ اعلائے جعفری
فرماں روائے سلطنتِ ارثِ حیدری
سرتاج نور مہر سپہرِ رخِ چنبری
زیرِ نگیں ہے کشورِ ہر خشکی و تری
شاہِ وفا حسینؑ ہے اور یہ وزیر ہے
خود بھی امیر و ابنِ جنابِ امیرؑ ہے

سردار ہے شجاعوں کا غازی یہ سربسر
سینہ برائے سرورِ دیں کر دیا سپر
سر کر دیا نثار، سرِ شاہِ بحر و بر
تحسین اس کو کرتے ہیں سارے بچو پسر
سب مل کے اسکو کہتے ہیں شیدائے اہلبیتؑ
سردفترِ وفا ہے یہ سقائے اہلبیتؑ

مرثیے کا مقطع یہ ہے ؎

خاموش اے خلیق بہت طول اب ہوا
افسردہ ان دنوں دلِ غمگین ہے مرا

(باقی)

پروفیسر شیام لال کالڑا عابد پشاوری
صدر شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی۔ جموں توی
۱۸۰۰۰۱

انشا کا وطن

اپنے مولد کے اعتبار سے انشا مرشد آبادی (بنگالی) ہیں لیکن انھیں دہلوی کہا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت فیض آباد میں ہوئی اور غالباً وہیں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی۔ سپاہیانہ زندگی کے طفیل چند سال بندیل کھنڈ میں گزارے، اور عمر کا بیشتر حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں۔ اس کے باوجود کہ اُن کی شاعری کا آغاز فیض آباد میں ہوا اور عمر کا معتد بہ حصہ لکھنوی درباروں کے توسل میں گزرا، وہ فیض آبادی یا لکھنوی نہیں کہلائے۔ حالانکہ ان کی شاعری میں لکھنوی عناصر کی تعداد خاصی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس کو بعد میں لکھنؤ اسکول کا نام دیا گیا، اس کی بنیاد انشا اور ان کے معاصرین کے ہاتھوں پڑی۔ اس لحاظ سے انشا لکھنوی اور دہلوی اسکولوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود کو دہلوی کہتے ہیں اور نہ صرف خود کہتے ہیں بلکہ ان کے تذکرہ نگاروں نے بھی انھیں دہلوی لکھا اور مانا ہے۔ تاریخ ادب میں ان کا شمار دہلوی شعراء میں کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ تفصیلی تجزیے کا محتاج ہے۔

وطنیت انسان کا نجی معاملہ ہے۔ کوئی خواہ کہیں پیدا ہوا ہو یا کسی بھی جگہ عمر گزارے، وہ غالباً تنسیب وطن کے لیے آزاد ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں دخل اندازی مناسب نہیں۔ لیکن صیرفی تحقیق ہر ہر کھوٹا کھرا پرکھا جاتا ہے۔ محقق کا فرض ہے کہ وہ کھرے کی ترویج پر زور دے خواہ اس سے مسلمات کی شکست ہو یا دلوں کی۔ محقق اپنی بات جبراً نہیں منواتا۔ وہ صرف حقائق پیش کر دیتا ہے اور ردّ و قبول اہلِ نظر کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں مجھے جو موضوع پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے دیا گیا تھا اس کا عنوان تھا انشاء اللہ خان دہلوی، حیات شخصیت اور کارنامے" مگر آج محسوس ہوتا ہے

انشا کے نام کے ساتھ دہلوی کا اضافہ ایک قدیم روایت کی پیروی اور تکلف کے سوا کچھ نہیں۔ آخر وطنیت کی بنیاد کے لیے کچھ قاعدے تو ہوتے ہوں گے۔ ہم کسی کو دہلوی یا لکھنوی کس بنیاد پر کہتے ہیں۔ بغیر اسباب و علل کے کسی کے نام کو کسی جگہ سے نسبت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عام طور سے جو شخص جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں کا متوطن کہلاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ مثلاً غالب اکبر آباد میں پیدا ہوئے لیکن دہلوی کہلائے۔ یہی حال میر کا بھی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے دہلوی کہلانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب تو غالباً سات سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہے اور ۱۳ برس کی عمر سے مستقلاً دہلی میں رہنے لگے اور آخر وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔ میر بھی خاصی کم سنی میں دہلی چلے آئے۔ گویا ان دونوں کی تربیت، پرورش و پرداخت، مزاج کی ساخت و تعمیر میں سرزمین دہلی کو سب سے زیادہ دخل رہا۔ چنانچہ وہ دہلوی ہو گئے۔ اگرچہ میر لکھنؤ جا کر دفن ہوئے اور عمر کا ایک معتد بہ حصہ انھوں نے وہاں گزارا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں انسان کی تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت ہوتی ہے اور جہاں اس کا ذہن بالیدہ ہوتا ہے وہ بھی اس کا وطن ہو سکتا ہے، خواہ وہ فوت کہیں جا کر ہو اور اپنے مولد سے دور وہ خواہ ساری عمر ہی کیوں نہ گزار دے۔ اردو کے کئی شاعر اور ادیب اپنے مولد سے دور فوت ہوئے لیکن ان کی نسبت مولد ہی سے رہی مسکن سے نہیں۔

اردو کی تاریخ میں انشا کا معاملہ سب سے نرالا ہے۔ وہ پیدا کہیں ہوئے، تربیت کہیں پائی۔ جوانی میں دھوم کہیں مچائی، فوت کہیں ہوئے۔ طرفہ تر یہ کہ جہاں انھوں نے زندگی کا غالباً سب سے کم عرصہ گزارا وہی ان کا وطن قرار پایا۔ اگر وطن کی بنیاد مولد ہے تو

انھیں بنگالی یا مرشد آبادی ہونا چاہیئے۔ اگر تعلیم و تربیت کو بنیاد مانا جائے تو یہ حق مرشد آباد اور فیض آباد کو ملنا چاہیئے۔ اگر مسکن یا زندگی کے طویل ترین قیام اور مدفن کو ترجیح دی جائے تو وہ لکھنوی ہیں۔ پھر انھیں دہلوی کہنے کا کیا جواز ہے۔ اگر کوئی دہلی کی بولی بولتا ہے تو وہ زبان دان ہے، زیادہ سے زیادہ اہل زبان ہو سکتا ہے لیکن دہلوی نہیں۔ وطنیت تو مولد و مسکن پر منحصر ہوتی ہے۔ نوحؔ کا شعر ع

نارووی اس سبب سے ہیں مشہور
نوحؔ نارے کے رہنے والے ہیں

دلّی کی بولی بولنے سے اہلِ زبان ہو گئے۔ لیکن وطن نارا ہی رہا اس سے نوحؔ دہلوی نہیں ہو گئے۔ اُردو پران کی قدرت کے پیش نظر انشؔا کو فصحا اور اہلِ زبان میں شمار کرنا بجا، لیکن انھیں دہلوی کہنے کا کوئی جواز نہیں۔ اپنی زندگی کے بہ مشکل دو سال انھوں نے دہلی میں گزارے۔ دو برس کے اس مختصر تعلق کی بنا پر انھیں دہلوی کہلانے پر اصرار ہے۔ اصرار کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اسے وجہ جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ دہلی شعر و ادب کا مرکز تھی۔ اس مرکزیت نے اُسے برتری بخشی۔ اسی برتری سے منسوب ہونا شعرا کے لیے باعثِ فخر تھا۔ زبان دانی دہلویت کا طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ بیرون دہلی کے شعرا بھی دہلوی کہلانے یا دہلی سے نسبت و تعلق کو فخر سمجھتے تھے۔ زبانِ دہلی سکۂ رائج الوقت تھی۔ جس نے دہلی نہیں دیکھی اس کی زبان دانی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ مصحفؔی کہتے ہیں ع

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

میرؔ، میر امنؔ، ذوقؔ، داغؔ وغیرہ دلّی کے روڑے ہونے کو زباں دانی کی سند اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان کا معیار قرار دیتے ہیں۔ دار الخلافے کے بھنگی تک کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔ لیکن دوسرے شہروں کے شرفا کو بھی بعض اوقات یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی حصولِ افتخار کا یہی جذبہ شعرا کو دلّی سے منسوب ہونے پر اکساتا ہے۔ انشؔا بھی اس سے مستثنا نہیں ہیں۔ غالباً انھیں اس کا احساس تھا کہ وہ مرشد آباد میں پیدا ہوئے، فیض آباد میں تربیت پائی، ایک لکھنوی دربار میں کچھ دن دھوم مچا کر حالات کے جبر کے تحت چند روز کے لیے دہلی جانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن وہاں سکون میسر نہ ہوا تو فوج میں شامل ہو کر چند برس راجپوتانہ اور بندیل کھنڈ کی خاک چھانتے پھرے۔ آخر لکھنؤ پہونچ کر دم لیا اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ گویا ان کے بزرگوں کا مولد اور وطن نجفِ اشرف، ان کا اپنا مولد مرشد آباد، پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی سعادت مرشد آباد اور فیض آباد کے حصے میں آئی۔ آخری مسکن و اقامت گاہ لکھنؤ ہوا۔ اسلام کی رُو سے وطنیت کے لیے کسی جگہ کم از کم بارہ برس کا قیام لازمی ہے۔ انشا کو اغلباً اس کا احساس تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے دریائے لطافت لکھی تو خاصی تاویل تشریح کے بعد کسی سے دہلوی ہونے کے لیے چار شرطیں مقرر کیں۔ ۱۔ اس کے والدین دہلی میں پیدا ہوئے ہوں۔ ۲۔ اس کو اردو دانوں کی صحبت میسر آئی ہو۔ ۳۔ زبان اور لہجے کی تحصیل و تحقیق میں اس کو شغف ہو۔ ۴۔ تیزی طبع اور دقاوتِ ذہن۔ ان چار شرطوں میں پہلی شرط فوت ہو جائے تو بھی طالب صادق کے لیے حصولِ مرتبہ ممکن ہے اگرچہ یقینی نہیں۔ لیکن باقی تین شرطیں واجب ہیں۔ یہ شرطیں اگرچہ حقیقت پر مبنی ہوں تاہم یہی انشؔا کے اپنے معاملات ہیں۔ ان کے والد نجفِ اشرف سے ہندوستان آئے تھے۔ اس لیے انشؔا چار میں سے پہلی شرط پوری نہیں کرتے۔ دوسری شرط کے لیے قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اہلِ زبان کی صحبت خود انشؔا کے مذہب کے مطابق دہلی کے علاوہ دوسری جگہ میسر نہیں آسکتی۔ اہلِ زبان کی صحبت کے لیے انشؔا نے کسی مدت کا تعین بھی نہیں کیا۔

انشؔا کی زندگی کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۵۲ء۔ ۱۷۵۵ء کے آس پاس مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں فیض آباد آئے۔ یہیں تعلیم و تربیت کی تکمیل بھی ہوئی اور شعر گوئی کا آغاز بھی۔ اپنا ابتدائی مختصر دیوان بھی سولہ برس کی عمر میں انھوں نے فیض آباد ہی میں مکمل کیا اور اپنے والد کے ساتھ شجاع الدولہ کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ نواب کی وفات کے بعد تقریباً چھ برس لکھنؤ میں آصف الدولہ سے متوسل رہے۔ ۱۷۸۰ء میں دہلی چلے گئے۔ اس طرح انشؔا نے بچپن مرشد آباد میں گزارا۔ اور عنفوانِ شباب

کے تقریباً پندرہ برس اودھ میں گزارے۔ ۱۷۸۰ء میں دہلی آنے کے بعد وہ یہاں ۱۷۸۲ء تک کُل دو برس رہے۔ اور پھر جہاتِ راجپوتانہ اور بندیل کھنڈ میں ہمدانی کے شریک رہے۔ پانچ چھے برس کے بعد واپس لکھنؤ چلے گئے (۱۷۹۱ء) آخر کم و بیش تیس برس کے قیام کے بعد وہیں انتقال کیا۔ اپنی ۶۴ - ۶۵ سالہ زندگی میں انھوں نے کُل دو یا ڈھائی سال دلّی میں گزارے۔ جب وہ دلّی پہنچے تو شعرا میں میر درد کے علاوہ باقی سب بڑے شعرا پورب کو ہجرت کر چکے تھے (میر و مصحفی اگرچہ دلّی میں تھے لیکن دلّی میں انشا کا اُن سے ملنا ثابت نہیں) مظہر سے گو وہ ملے تھے لیکن انھیں دنوں مظہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ شاہ حاتم سے ملاقات کا بھی کوئی ذکر کہیں نہیں آیا۔ اِن حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کن کن فصحا کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ ان کے دہلی کے دوستوں میں قتیل اور رنگین قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن دونوں پنجابی۔ قتیل کو فرید آبادی کہا جائے تو اور بٹالوی مانا جائے تو۔ غالباً اسی لیے دریائے لطافت میں انشا نے قتیل کو اپنی ہر تحریر میں ترمیم و تنسیخ کا حق دیا ہے لیکن اُردو زبان و محاورے کے سلسلے میں یہ حق اپنے ہی پاس رکھا ہے۔ اسی طرح رنگین سرہندی تھے۔ نجف خاں کے لشکر میں بھی فصحا کا مجمع نہیں تھا۔ لشکر کی قیام گاہ بھی مغل پورے کے آس پاس تھی جسے انشا نے فصحا کے محلوں میں شمار نہیں کیا۔
بہر حال انشا نے دو برس دہلی میں گزارے اور ان جیسے ذہین شخص کے لیے تحصیلِ زبان کچھ مشکل نہیں تھی۔ باقی دو شرطیں انشا بوجوہ احسن پوری کرتے ہیں۔ تیزیِ طبع اور وقادتِ ذہن میں ان کے معاصرین میں مشکل ہی سے کوئی اُن کا حریف ہو سکتا ہے۔ زبان کی تحصیل و تحقیق سے ان کے شغف کا ثبوت خود دریائے لطافت ہے۔ اس لیے ان کا زباں داں بلکہ اہلِ زبان ہونا مسلّم (اور اس عہد میں دہلویت کو وطنیت سے زیادہ زباں دانی کے مفہوم میں اصطلاحاً استعمال کیا گیا ہے) لیکن دہلی المولد ہونا مشکوک ہے۔ زباندانی کو وطن کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر انھیں مرشد آبادی نہ بھی کہا جائے تو بھی اُن کے لکھنوی ہونے میں شبہ نہیں۔ انھوں نے اپنی دو تہائی عمر لکھنؤ میں گزاری۔ ادبی اعتبار سے بھی ان کے یہاں دہلوی سے زیادہ لکھنوی خصوصیات ملتی ہیں۔ آتش اور ناسخ نے تو لکھنویت کو اعتبار دیا۔ اُن کے عہد میں تو صرف دبستانِ لکھنؤ کو تسلیم کر لیا گیا، اسی کی داغ بیل تو انشا اور ان کے معاصرین (جرأت و مصحفی وغیرہ) ہی کے ہاتھوں پڑی۔ انشا کو دہلوی کہنے پر اصرار کرنے والوں کو اِن حقائق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

□□

طلسم ہوش رُبا میں نسوانی معاشرہ .... صـ۳۹ کا بقیہ

صـ۳۹ کا بقیہ

اور 'امراؤ جان' نہیں۔ کسی حد تک 'فسانۂ آزاد' بھی نہیں بلکہ داستانیں ہیں یا 'طلسمِ ہوش رُبا' ہے۔ جو داستانوں کے کوہِ عقیق گیان چند جین کے لفظوں میں :—

" داستانیں اودھ کی تہذیب کا ایک ارژنگ ہیں
یہ اس تہذیب کے روشن اور چمکتے ہوئے نقوش ہیں
جو آج کے دور میں بھی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ وہ
تہذیب جس کے پس منظر میں اس کے ماضی کی وراثت
تھی، حال کی لطافت تھی اور مستقبل کی طرف خوش گوار
صحت مند اور روشن اشارے تھے"۔

اب اس کے بعد بھی ساری داستان میں کسی کو یاد رہ جائے کہ اودھ، لکھنؤ کی پہچان عیاشی تھی تو پھر یہ کہنا پڑے گا ؎

مہتاب میں دھبے ہیں گلوں میں کانٹے
بد بیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے □□

استفادہ : "طلسم ہوش رُبا : ایک مطالعہ" از ڈاکٹر راہی معصوم رضا

معذرت: اودھ نمبر سے متعلق بہت سے اہلِ قلم کی نگارشات مختلف اسباب کی بنا پر اس شمارے میں جگہ نہ پا سکیں۔ کوشش یہی ہے کہ انھیں آئندہ شمارہ میں جگہ مل سکے۔

—— ایڈیٹر

شہاب سرمدی
۹۴۴۔ دودپور، سول لائنس
علی گڑھ

جائسی و نظامی کی اودھی و پارسی

اس کا ایک رُخ "بزم و رزم" کے عنوان سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اودھ میں مثنوی ہو یا مرثیہ، بزم و رزم کا التزام دونوں میں بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے براہ راست جائسی کی مثنوی "پدماوت" کی طرف آیئے اور اس کے بزم و رزم پر قدرے تفصیل سے نظر ڈالیے۔

بزم و رزم

شدید جذبہ چاہے وہ غم کا ہو یا خوشی کا جیسے انسانی رُوح کی گہرائیوں میں تیر جاتا ہے ویسے ہی انسانی تہذیب پر شدید تر اثر انداز ہوتا ہے۔ جائسی نے انسان و کائنات، خالق و مخلوق، جلال و جمال رشد و ہدایت، حسُن و عشق اور اسی طرح حرص و ہوس، ظلم و ستم، اور غصہ و نفرت کے متعلق جو کچھ جس طرح کہا ہے اسے پوری کتاب پدماوت پر پھیلا کر دیکھئے تو بزم کے ایک عظیم شاعر کا تعارف حاصل ہوگا اور اعلان جنگ سے لے کر میدانِ جنگ تک جس طرح ہر حرکت ہر آواز کے ہیجان اور تناؤ کو انھوں نے الفاظ و اوزان کا جامہ پہنایا ہے جس طرح ہوتی ہوئی تھرکتے ہوئے گھوڑے، ٹھوکر پر ٹھوکر دیتے ہوئے ہاتھی سمتیں سیدھی کرتی ہوئی توپیں، تلواریں سونتے اور نیزے تانے سپاہی بڑھتے اور لڑتے ہیں اور جس طرح جائسی نے ہر شور، ہر دھماکے، ہر چیخ، ہر للکار کو پدماوت کے ہر پاٹھک کے کانوں تک پہونچایا ہے اسے حساب میں لیجئے، یا پھر جنگ اور میدانِ جنگ سے الگ بھی اگر کسی بہادر کا ذکر آگیا، یا میدانِ جنگ میں بھی حسُن و جمال کا تصوّر در آیا ہے، یا عورت کی جنسی خواہش نے ترغیبِ حریفانہ سے کام لینا چاہا ہے تو اندازِ بیان نے معاً تیور بدل لیے ہیں، لہجہ کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، سکون کی جگہ سنسنی اور ٹھہراؤ کی جگہ تناؤ نے لے لی ہے یا پھر جس طرح "دھائیں دھائیں اور سائیں سائیں" کی دھواں دھاری میں میٹھے سُر اور مدّھم لے کی شہاس بھی جس طرح پیوست ہوتی ملتی ہے، اس کا لحاظ کیجئے تو ایک آفاقی قد و قامت کا رزم نگار سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

جائسی، جیسا ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، نظامی سے بنہایت متاثر تھے چنانچہ انھوں نے نظامی کا انداز خوب خوب برتا ہے لیکن جیسا کہ ہر صاحبِ طرز شاعر کا شعار ہوتا ہے میدانِ جنگ کی "گرد" میں "توپ اور تُفنگ" کا دھواں بھی ملا دیا ہے۔ نظامی نے اپنے "سکندر نامہ" میں دارا و سکندر کے لشکر کا پہلا ٹکراؤ یوں نظم کیا ہے ؂

زبس گرد بر تارک و ترک و زیں زمیں آسماں، آسماں شُد زمیں
فرو رفت و بر رفت راہ نبرد نم خوں بہ ماہی و بر ماہ گرد
زسُمِّ ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

ان ابیات کی تاب لانا کھیل نہیں تھا، مگر مرحبا ہے جائسی کو اور حبّذا ان کی اُودھی کو، کہ نہ پیوند کا پتہ چلتا ہے نہ جوڑ کا۔ ایسی حالت میں نظامی اور جائسی کا تقابل دلچسپ سے زیادہ مفید ہوگا۔ لیکن تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اس لیے بات بزم و رزم تک محدود رہے تو مناسب ہوگا۔ خاص کر اس لئے کہ بقول میرانیس ؂

آؤ طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
دکھلائے زباں سب کو یہیں معرکۂ رزم

یہ رزم و بزم کو یکساں اہمیت دینے والا جذبہ انیسویں صدی کے اُودھی سماج

کے لئے بڑا چوکھا رنگ رکھتا تھا چنانچہ رزم و بزم کے رنگ ڈھنگ کو الگ اور ایک ساتھ برتنے کی تکنیک کے بارے میں جائسی خود بھی جا بجا اشارے کرتے ہیں: جیسے "توپ اور حسین عورت" کے تلازمہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

بیر سنگار دُاءُ اک ٹھاؤں   (۵۰۷/ب)

बीर सिगाँर दुअउ एक ठाऊँ

کہیں دوسروں کے منھ میں بات ڈال کر (جیسے رتن سین کی زبانی)

بیر سنگار جتے میں دَو ءُ   (۳۲۴/ب)

बीर सिगाँर जिते मैं दोऊ।

نظامی بھی اسی طرح سکندر سے کہلاتے ہیں ؎

بہ مہر تو ام بیشتر گشت عزم
کہ دیبائی بزمی و زیبائی رزم

خاتمۂ کتاب میں نظامی مدحِ سکندر اس طرح کرتے ہیں:

یہ بزم آفتابیست افروختہ
بہ رزم اژدہائے جہاں سوختہ

دو بالکل متضاد کیفیات کو ایک ساتھ ہی نہیں ایک ہی بات کی طرح بیان کرنا آسان نہیں پھر بھی جائسی نے "آورد" اور "آمد" کے بین بین جو طریق کار برتا ہے وہ اودھی جہاکاویہ کو فردوسی و نظامی کی مثنوی نگاری سے ہم پلہ کر دیتا ہے۔ مثلاً وہ ایک نئی بیاہی دلہن کا چتر کھینچتے ہوئے ویر اور سنگار رس کا دو آتشہ تیار کرتے ہیں۔ صرف ایک بیت پر غور کیجئے:

اَلَکْ پھانس گیہ میل اَسُوجھا
اَدھر اَدھر سوں چاہے جُو جھا۔   (۶۱۹/ب)

अलक–फाँस गिय मेल असूझा
अधर अधर सौं चौह जूझा।

یعنی: "کمندِ زلف کا پھندا دکھائی نہیں دیتا۔ تمھارے گلے میں یہی پھندا ڈال کر ہونٹ سے ہونٹ بر سرِ پیکار ہو جانا چاہتے ہیں۔"

اب نظامی کو ملاحظہ فرمایئے۔ سکندر اپنی از حد حسین و جمیل اور زیرک چینی کنیزک سے التفات کی مہلت نہیں پاتا۔ چینی کنیزک پہلے تو چپ رہی پھر ایک دن بپھر کر کہنے لگی ؎

اگرچہ کمندِ جہانگیرِ شاہ   فتادست در گردنِ مہر و ماہ
کمندِ من از زلف بر ساز مش
نہ ترسم بگردن در اندازمش

"یہ سچ ہے کہ شاہ جہانگیر نے حوصلہ و مردانگی کی کمند سورج اور چاند کی گردن میں بھی ڈال دی ہے مگر میں نے اس کے لئے وہ کمندِ زلف تیار کی ہے جسے اسی کی گردن میں ڈالتے مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔"

قادرالکلامی کے ان مظاہروں سے قطع نظر "پدماوتِ جائسی" اور "سکندر نامۂ نظامی" میں باہم دگر ہندی اور ایرانی کا وہ سانجھس ملتا ہے جس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول نہ کرانا ہماری طرف سے کوتاہی ہوگی۔ مثلاً:

لغات و اصطلاحات

ہند و ایران میں تہذیبی لین دین کا بیوپار اتنا پرانا رہا ہے کہ ان کی زبانوں میں لغات کا مشترک ہونا معاملۂ معمولہ سمجھا جا سکتا ہے چنانچہ فردوسی و فرخی نے بہت سے ہندستانی الفاظ استعمال کیے ہیں اسی طرح فارسی الفاظ کی ایک خاصی تعداد دسویں صدی سے پہلے بھی ہندستانی ہو گئی تھی۔ اسی لیے نظامی جیسا مشکل پسند شاعر بھی سنسکرت زبان کا ایک سموچا لفظ اس بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے جیسے وہ عام ایرانی بول چال کا ہو، کہتا ہے ؎

ندارد کسے سوگ در جبر گاہ
نہ کس جز قزاگند پوشد سیاہ

جائسی نے بھی فارسی کے ہزاروں الفاظ استعمال کئے ہیں مگر ان میں بہتیرے ایسے ہیں جو خاص نظامی کے انداز سے اپنائے گئے ہیں مثلاً دیو بمعنی شیطان، ساز بمعنی جنگی ساز و سامان، چکاوک، "چکئی چکوا" بمعنی سرخاب، ہرے بمعنی ہرات، بے سراک (بے سرا) بمعنی خچر، بار بمعنی دروازہ اور دربار، بہری (بہری) بمعنی بال، اور ان کے علاوہ خنگ، بور، دُر کیبی، سمند گھوڑوں کے لئے۔ اسی طرح موسیقی، اسپ شطرنج اور چوگان کے تلازمے اور اس سے بھی آگے بڑھا جائے تو فلسفۂ وجود اپنی ساری متانت و دیانت کے ساتھ جائسی اور نظامی کے یہاں یکساں ملتے ہیں

صرف دو ایک مقامات مدنظر ہوں:

فلسفۂ تخلیق

ہتُ پہلیئں اور اَب ہے سوئی   پُنِ سو رَہِی رہِی نہیں کوئی
اُوئیں سَب کینھ جَہاں لَگ کوئی
وہ نَہ کینھ کاہُو کَر ہُوئی

——— جائسی

हत पहिलेइं और अब है सोई।
पुनि सो रहहि, रहहि नाहिं कोई।।
ओइं सब कीन्ह 'जहाँ लगि कोई।
वह न कन्हि काहू कर होई।।

تو ای کآسماں را برافراختی   زمیں را گزرگاہ او ساختی
نہ بُود آفرینش تو بُودے خُدائے
نہ باشد ہمہ ہم تو باشی زجائے

——— نظامی

فلسفۂ وجود

آدِ سُوئیں بَرنَو بَڑ راجا

——— جائسی

आदि सोइं वरनौं बड़ राजा।

خدایا جہاں پادشاہی تراست

——— نظامی

عقیدہ اور تخیل میں جو متوازیت نظامی اور جائسی کے یہاں پائی جاتی ہے اس سے قطع نظر متفرق مضامین سے دونوں کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اس سلسلے میں فارم اور ہیئت کی بحث نہ چھیڑی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ دونوں کا وہ طریقۂ کار جو بحیثیت مثنوی نگار سامنے آیا ہے وہ گفتنی ہے۔ مثلاً: ذکر نامۂ دیگراں یعنی دوسرے گرنتھوں کا ذکر، یہ جائسی سے پہلے اودھی میں اور نظامی سے پہلے فارسی میں نہ ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح "نشاط بھوگ" کی مثال ہے "شب وصال" کی منظر کشی و محاکات نگاری بھی انہی دونوں شعرا کی خصوصیت سمجھی جا سکتی ہے۔ "نکھ سکھ وَرنَن"، "کھٹ رِتُ وَرنَن" اور بارہ ماسہ کی ٹھیٹھ روایات جائسی لوک ساہتیہ اور دیسی ادب سے لیں۔ نظامی کے یہاں ان کو ڈھونڈھنا عبث تھا لیکن بڑا دلچسپ اتفاق ہے کہ یہاں بھی نظامی جائسی کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ نکھ سکھ ورنن کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ؏

پس از ناخن پائے تا فرقِ سر

یہ نکھ سکھ (ناخن اور بال) کی لفظی تشریح ہے۔ نظامی اور جائسی دونوں نے سنسکرت کے زیرِ اثر اس تصور کو اپنایا ہے حالاں کہ ہر حصۂ جسم کا بیان دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ اس طرح جائسی کے کئی سراپے ایسے ہیں جن میں نظامی کی سراپا نگاری کا انداز پایا جاتا ہے۔ البتہ فوج کی فراہمی، فوج کا کوچ، فوجی ہاتھی جنگی لباس اور گھمسان کی لڑائی، یہ اور اس طرح کے دوسرے عنوانات اور بھی ہیں جن کو نظامی اور جائسی نے اس یگانگت سے برتا ہے کہ اس کی توجیح نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً:

فوج کی فراہمی

فرستاد تا لشکر از ہر دیار   روانہ شود بر درِ شہریار
قدر خاں ز چیں، گور خاں از ختن   رئیس از مداین و لبید از یمن

——— نظامی

لکھے پتر چارِہُوں دِس دھائے   جاوَت اُمرا، بیگ بُلائے
رہا نہ رُوم، سام، سُلطانو   کاسمیر، ٹھٹھا، مُلتانو

——— جائسی (ب ۴۹۵/۳۰۱)

लिखे पत्र चारिहँ दिसि धाये।
जावत उमरा, बेग बुलाये।।
रहा न रुम 'साम सुल्तानू।
कास्मीर, ठ्ठा मुल्तानू।।

فوج کا کوچ

بہ غُرید کوس از درِ شہریار
جہاں شد ز بانگِ جرس بے قرار

——— نظامی

ساہ بجاءِ چڑھا جگ جانا
بسِ کوس بھا پہَل پیانا

——— جائسی (ب ۴۵۵/۴)

साह बजाइ चढ़ा जग जाना।
बसि-कोस मा पहल पयाना।।

فوجی ہاتھی

ز پیلاں دو صد پیل پولاد پوش   کہ آرند خونِ زمیں را بجوش

زبس پیل کا آمد بہ جالش بروں
شد از پائے پیلاں زمیں نیلگوں

——— نظامی

لوہے سارہست پہرائے   میگھ گھٹا جس گرجت آئے
سوا لاکھ ہستی جب چلا،   پربت سرِس چلت جگ ہلا

——— جائسی

लोहे सारि हस्ति पहिराये।
मेघ–घटा जस गरजत आये।।
सवा–लाख हस्ती जब चला।
परबत सरिस चलत जग हला।।

نظر اس پہ کی جائے تو مناسب ہوگا کہ جائسی نے نظامی کی کسی طرح نقالی نہیں کی سوائے اس کے کہ تاثر بھرپور پیدا کیا ہے۔ موقع اور موضوع کے اعتبار سے۔

جنگی لباس

بہ آہن شداں غرق جملہ سپاہ   نہادہ بہ سر برز آہن کلاہ
قبائے زرہ بر تنش تابدار   چو سیماب روشن چو بیما بدار

——— نظامی

اب جائسی کی ابیات ملاحظہ ہوں ؎

جیبا کھول راگ سو مڑھے   لیجم گھال اراکنہ چڑھے
چمکے پکھریں سار سنواری   درپن چاہ ادھک اجیاری

——— (ب ۳۹۹، ۵/۴)

जेबा खोल राग सों मढ़ें।
लेजिम वालि इराकिन्ह चढ़े।।
चमकै पखरैं सारि सँवारी।
दरपन चाहि आधक उजियारी।।

اس کے بعد دونوں لشکروں کا آمنے سامنے آجانا، للکار، بھنکار اور جنگ کی ابتدا، نظامی نے اس طرح تصویر کھینچی ہے ؎

دو ابر از دو سو در خروش آمد   دو دریائے آتش بہ جوش آمد
سپاہ از دو جانب صف آراستہ
زمیں آسماں وار برخاستہ

جائسی فرماتے ہیں ؎

داؤ سمند ددھ اُددھ اپارا
دُاؤ میرو کھکھند پہارا

दाउ समुदन्दधि दउधि अपारा।
दुअउ मेरु खिखिन्द पहारा।।

——— دوہا ———

دھرتی سرگ داؤ دھر   جوہہیں اوپر جوہ
کوؤ ٹرے نہ ٹارے   دُواؤ بجر سموہ

(ب ۵۱۶/۵، نیز ۸-۹)

धरती–सरग दाऊ धर	जूहहिं ऊपर जूह।
कोऊ टरै न टारे	दूअउ बज्र–समूह

اس کے بعد رزم کا تتمہ ہے ؎

گھمسان کی لڑائی

بہ جنبش درآید بہ دریائے خوں   شد از موج آتش زمیں لالہ گوں
برانگیخت رزمی چو بارندہ میغ
تگرگش زپیکان و باراں ز تیغ
بہ شمشیر پولاد و تیر خدنگ   گزرگاہ بر مور کردند تنگ
بہ تیغ آتش برکشیدہ چو آب
کزو خیرہ شد چشمۂ آفتاب

جائسی بھی اسی "گھمسان" کو نظم کرتے ہیں اور نظامی کی نقل کیے بغیر اودھی کو "پارسی" کا ہم پلّہ بنا کر اپنی اچھوتی انفرادیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

گرب گیندنہہ گگن پسیجا
رُہیر جو چوا ای دھرت سب بھیجا   (ب ۵۱۷، ۶/۶)

गरब गैंदन्ह गगन पसीजा।
रुहिर जो चुअइ धरति सब भीजा।।

سو سو مَن کے بر سہیں گولا   بر سہیں ٹپک تیر جس اولا
لوہن سین سوجھ سب کاری   تل اک کہوں نہ سوجھ اگھاری
باجہیں کھرگ اُٹھے دَر آگی
بھوئیں جری چہے سرگ کنہ لاگی

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

حسن واصف عثمانی

۱۱۔ کلن کی لاٹ، قبر ماموں بھانجہ
لکھنؤ

لکھنؤ کے چند اخبار

لکھنؤ میں اُردو صحافت کی تاریخ اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ تحقیق اور خالص علمی تحقیق بن جاتا ہے۔ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں لکھنؤ سے بے شمار رسالے، اخبار اور ماہنامے نکلے۔ ان کے ناموں کی پوری فہرست مرتب کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ بڑے بڑے اہم اخباروں، رسالوں اور ماہناموں کے فائل ناپید ہیں۔ قدیم اخباروں کے متفرق شمارے کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ مگر "اودھ اخبار"، "اودھ پنچ" اور "روزنامہ ہمدم" کے مکمل فائل دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ لکھنے یا اس سلسلے میں تحقیق اسی لیے ناممکن اور محال نہ بھی ہو تو ہر حال میں ادھوری اور نامکمل ضرور رہے گی۔

اس کے باوجود لکھنؤ کی اُردو صحافت کا ایک عمومی جائزہ اس لیے ممکن ہے کہ لکھنؤ میں اُردو صحافت کی روایت کے بعض امتیازات ایسے ہیں جن کو باہم مربوط کیا جائے تو لکھنوی صحافت کا انفرادی چہرہ نکھر کر سامنے آسکتا ہے۔ اس انفرادیت میں اولیت زبان کے بارے میں اہلِ لکھنؤ کے رویّے کو حاصل ہے۔ لکھنؤ کے اہلِ زبان کا لسانی رویّہ اردو کے مزاج کو ابتدا سے ایک خاص نہج پر لے جانے کا تھا۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں کے اثرات سے اردو تنقید میں اب انکار کا رویہ بھی نظر آنے لگا ہے۔ لیکن لکھنؤ کے مخصوص لسانی رویّے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس نے شعر و شاعری کی طرح نثر نگاری میں لب و لہجہ پر دھیان دیا۔ لکھنؤ میں یہ لسانی رویّہ تاریخ اور جغرافیہ کے دو بڑے عوامل سے پیدا ہوا۔ دہلی سے آنے والی کھڑی بولی کا جو روپ ریختہ کے نام سے لکھنؤ آیا اس پر لکھنؤ کی شہری تہذیب اور شہری سماج نے اپنا تصرف کیا۔ لکھنؤ اودھی بھاشا کے علاقے میں بسا تھا اس لیے لکھنؤ نے زبان کے سلسلے میں ناسخ اور اور ان کی پیروی کرنے والوں کی اصلاح زبان کی تحریک کو پوری طرح قبول کر کے الفاظ کے اپنے کینڈے بنائے اور زبان کی نحوی ساخت کے دائرے میں نئے امکانات تلاش کیے۔ لکھنؤ کی نثر کا یہ ارتقا جس معراجِ کمال پر پہونچا وہ طلسم ہوش رُبا کی داستانوں میں نظر آتا ہے، جو ۱۹ویں صدی میں لکھنؤ کی زندہ اور رائج زبان کے بے مثال نمونے فراہم کرتی ہیں۔

لکھنؤ کی اُردو صحافت کے ابتدائی نقوش بے شمار مذہبی اور نیم مذہبی رسالوں میں ملتے ہیں لیکن اس میں مطبع نول کشور کے اودھ اخبار اور پھر منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ کو اپنے اثرات اور ہمہ گیری کی وجہ سے بنیادی اہمیت دینا ہوگی۔ دونوں نے پڑھنے والوں کا وہ عوامی طبقہ پیدا کیا جس کے بغیر صحافت وجود میں نہیں آسکتی۔ اودھ اخبار اور اودھ پنچ دونوں جس زمانے میں نمودار ہوئے وہ داستانوں کا دور اور طلسم ہوش ربا کی ہمہ گیری کا زمانہ تھا لیکن دونوں نے ادب اور صحافت کی نئی زبان پیدا کرنے کا بنیادی کام کیا۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر توجہ اور تحریر کی روایت قائم کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسین کا ادبی مرتبہ سب تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انھوں نے لکھنؤ میں اُردو صحافت کو شعر و شاعری، انشا پردازی یا مزاح نگاری کے تفریحی دائروں سے باہر نکالنے کا فرض بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انجام دیا۔ اودھ اخبار نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل پر انھیں تحریروں کے ذریعے غور و فکر کی دعوت دی۔ اودھ اخبار نے اودھ کے زمینداروں اور اودھ کے عوام کے مسائل پر بہت تعمیری اظہار خیال کیا۔ اودھ پنچ نے ملک کی سیاست اور بین الاقوامی سیاست پر بھی تیکھے پن کے ساتھ

اپنی تحریروں میں شوخی کے ساتھ ساتھ غور وفکر کا رنگ شامل رکھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کو صرف فسانۂ آزاد یا سیرِ کہسار جیسی ادبی کتابوں کے حوالے سے یاد کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سرشار نے جدید فلکیات پر اُردو میں پہلی بار ایک کتاب انگریزی سے منتقل کی۔ یہ کتاب "شمس الضحیٰ" اردو میں جدید عصری علوم کو منتقل کرنے کی تاریخ میں خاصی وقیع اور اہم کوشش ہے۔

لکھنؤ کی اُردو صحافت میں ایک اہم باب "مسلم گزٹ" کی اشاعت ہے۔ میر جان صاحب کے اس رسالے نے سنجیدہ فکری اور علمی تحریروں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ خاص طور پر اس دور میں جب اس کی ادارت وحیدالدین سلیم کے سپرد رہی۔ وحیدالدین سلیم نے "مسلم گزٹ" کو ملک گیر شہرت اور وقار کا حامل بنا دیا۔ سماجی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل پر مسلم گزٹ میں شائع ہونے والی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے نئے اور عصری خیالات کو ادا کرنے کے لیے زبان کو نئے الفاظ اور اصطلاحیں بھی ملیں، جمہوریت، نمائندگی اور قوم پرستی یا وطن دوستی جیسے بے شمار الفاظ جدید معانی کے حامل تھے جو اصطلاحوں کی شکل میں روشناس اور رائج ہوئے۔ وحیدالدین سلیم اصطلاح سازی کے ماہر تھے بعد میں وہ پروفیسر وحیدالدین سلیم کے روپ میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی جامعۂ عثمانیہ اس کے دارالترجمہ و تالیف کے ذریعے اصطلاح سازی کی بے مثال خدمات کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن ان کے کام کی ابتدا "مسلم گزٹ" سے پوری طرح وابستہ ہے۔

فسانۂ عجائب اور طلسم ہوش رُبا کی نثر سے نکل کر عصری خیالات اور جدید حیات کی ترجمانی کرنے والی سادہ علمی نثر تک پہونچنے میں لکھنؤ کی اُردو صحافت نے اس لسانی رویّے سے کبھی انحراف نہیں کیا جو الفاظ، محاوروں اور جملوں کی ساخت میں کسی انحراف کو برداشت نہیں کرتا تھا، اس لیے لکھنؤ میں صحافت پر شعر وادب کی گرفت برابر قائم رہی اور اخبار نویسی میں زبان وبیان کی ایک معیاری سطح کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی برابر ہوتی رہی۔

بیسویں صدی میں روزنامہ "ہمدم" کی اشاعت نے ایک عام مقبولِ عام اور کثیر الاشاعت اخبار کی ضرورت پوری کی۔ "ہمدم" سید جالب دہلوی کی سربراہی میں نکلا تھا جو باکمال نثر نگار، بہترین مترجم اور قدیم وجدید زمانے کی قاموسی معلومات رکھتے تھے۔ دہلوی ہونے کے باوجود سید جالب دہلوی نے "ہمدم" میں زبان وبیان کے کلاسیکل لکھنوی اسلوب کی پیروی کی۔ روزنامہ "ہمدم" نے ایک اور تاریخی کارنامہ بھی انجام دیا، جس زمانے میں وہ نکلا اس زمانے پر مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" اور ظفر علی خاں کے "زمیندار" کا گہرا اثر تھا۔ "الہلال" اور "زمیندار" دونوں سیاست میں مذہب کی گرمی پیدا کرتے تھے۔ اردو صحافت پر جذباتیت کا خول چڑھانے میں الہلال اور زمیندار کی ہمہ گیر کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن یہ زندگی اور سماج کے بارے میں زیادہ بالغ نظری اور گہرائی کے رویے کو عام کرنے کا وہ کام زیادہ اہم تھا جو لکھنؤ میں مسلم گزٹ اور "ہمدم" جیسے اخباروں نے کیا۔ اُردو صحافت میں مذہب، ہنگامی سیاست اور جذباتیت کی جگہ فکر ونظر کو روشن کرنے میں "مسلم گزٹ" اور "ہمدم" نے لاہور کے "پیسہ اخبار" کی طرح عصری تصوّرات کو فروغ دیا۔ عصری معلومات فراہم کرنے کو اپنا مقصد اور مشن بنایا، پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار رکھنے اور ان کی ذہنی تربیت کے لیے ادبی نثر پارے بھی شائع کیے اور مزاحیہ کالم شروع کیے۔ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں تک لکھنؤ کی اردو صحافت اپنے اسی ڈھنگ پر چلتی رہی۔ افسوس ہے کہ اس کے بے شمار نمونے اب ہماری دسترس سے باہر ہیں چند مشہور ناموں کے سوا بہت سے اخباروں اور رسالوں کو فراموش کرنا پڑا ہے۔

لکھنؤ میں انیس احمد عباسی کے روزنامہ "حقیقت" اور پھر عبدالرؤف عباسی نے روزنامہ "حق" کے ذریعہ اسی روایت کو پروان چڑھایا انیس احمد عباسی، سید جالب دہلوی کی طرح قاموسی علم رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں علم وفکر کی فراوانی ہوتی تھی۔ ان صحافیوں نے معیاری اخبار نویسی کی راہ سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ادبی اور علمی میدان میں ادب اور بہت سے رسالوں کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن اہم مقام ظفر الملک علوی کے "الناظر" کو دینا پڑتا ہے جس نے جدید مسائل، شعر وادب اور عصری تحریکوں پر سنجیدہ اور مقصدی نثر نگاری کے نمونے پیش کیے۔

ہفتہ وار اخباروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے سچ، صدق اور صدق جدید کے سلسلے کو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ تینوں کا اوڑھنا بچھونا پُرانی

مشرقی تہذیب کا دفاع اور مغرب پر جارحانہ حملہ کرنا تھا۔ ان میں مولانا آزاد کا وہ مذہبی طنطنہ نہیں تھا جو سیاست پر مذہب کا خول چڑھا سکتا یہ صرف خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ ممکن ہے جو ذہن و فکر کی جگہ جذبات کو مخاطب بناتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں ادب اور شاعری سے چاشنی آتی تھی مگر ان کا ذہن قدیم کی حمایت کے باوجود بہت جدید تھا۔ انھوں نے صحافت میں جذباتیت کے عمل دخل کو کم کرنے کا فرض بہرحال انجام دیا جس سے فکروشعور میں روشنی پیدا ہوئی۔

الناظر کی طرح ایک اور رسالے "ہندوستانی" کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشہور ہفتہ واروں کی طرح "سرفراز" کو بھی یاد کرنا ضروری ہے جو شیعہ کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے ملک گیر اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا میدان عام نہیں خاص تھا۔ پھر بھی ایک فرقہ یا جماعت کے مخصوص مسائل کے علاوہ "سرفراز" نے سیاسی اور سماجی مسائل کے وسیع تر پہلوؤں پر ہمیشہ توجہ رکھی۔ یہ اصلاح احوال کے مقاصد اپنے سامنے رکھتا تھا۔ قدیم و جدید کے مناسب امتزاج کا علمبردار تھا۔ "سرفراز" نے تعلیمی کو آگے بڑھایا اور اجتماعیت کے شعور کی آبیاری کی۔ "سرفراز" کی برسہا برس کی فائلوں میں لکھنؤ کی تاریخ، تہذیب، لکھنؤ اور اودھ کی نامور شخصیتوں اور عزاداری اور مرثیہ گوئی کے بارے میں معلومات کا ایک بڑا خزانہ دفن ہے۔

اسی طرح حیات اللہ انصاری اور ان کے ساتھیوں کے اس کارنامے کا ذکر ضروری بلکہ فرض ہے جو روزنامہ "قومی آواز" کی شکل میں اُردو دُنیا کے سامنے آیا تھا۔ یہ اُردو صحافت کو اپنے عصر اور اس کی ترقی یافتہ صحافت سے ہم آہنگ کرنے اور ہم پلّہ بنانے کی ایک ایسی کوشش تھی جو حوصلے، امنگ اور ذہانت تینوں کی طلب گار تھیں۔ حیات اللہ انصاری کی سربراہی میں قومی آواز کے بانی صحافیوں نے اخبار کی تزئین، ترجمے میں عام فہمی، سلاست اور اُردو کے مزاج پر زور دینے کے کامیاب تجربے کئے۔ تزئین کاری کو اہمیت دے کر سُرخیوں کی کتابت کے ڈھنگ مقرر کیے۔ ٹیلی پرنٹر سروس سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ خبروں کی اشاعت کا طریقہ اختیار کیا، جس میں خبریں گڑھنے یا خبروں کی جگہ ذاتی خیالات کو خبر کی طرح پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ "قومی آواز" نے ہفتہ وار میگزین کے ذریعہ شعروادب اور تنقید کو بھی اخباریت کا ایک جز بنایا۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے بے تکلف انداز میں جو اداریے لکھے ان میں زبان کا لطف اور ہلکے ہلکے طنز کے پہلو بہ پہلو ایک مجموعی فکر کی عکاسی ہوتی تھی۔ "قومی آواز" نے اُردو صحافت کا معیار بلند کرنے کا تاریخی فریضہ انجام دیا اور اس کا اعتراف ہندستان اور پاکستان میں اخبار نویسوں کی برادری عام طور پر کرتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسا سنجیدہ، جدید اور زمانے کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اخبار صرف لکھنؤ میں ہی نکل سکتا تھا جہاں اودھ اخبار، اودھ پنچ، مسلم گزٹ، ہمدم اور حقیقت جیسے اخباروں نے اردو صحافت میں ہمہ گیری کی وہ روایت پیدا کی اور پروان چڑھائی تھی جو اُردو کے کسی اور مرکز میں موجود نہیں تھی۔ بیسویں صدی کے وسط تک لکھنؤ کی اردو صحافت کا یہ امتیازی وصف بالکل سلامت رہا اور جہاں بھی اچھے اخبار نکلے وہ کسی نہ کسی طرح اس وصف کو لکھنؤ سے مستعار لیتے رہے۔ لکھنؤ کے اہل زبان کے اثرات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی اردو صحافت نے بھی غیر محسوس طریقے پر ساری اردو صحافت کو متاثر کیا ہے۔

لکھنؤ کی سنجیدہ صحافت کی روایت اس صدی کے نصف ثانی میں دو ہفتہ واروں نے قائم رکھی۔ ہفتہ وار "ندائے ملّت" کے رُوحِ رواں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی تھے۔ "ندائے ملّت" کے معیار کو انھوں نے جدید مغربی صحافت کے معیار کے برابر رکھنے کا خاکہ بنایا تھا اور شعوری طور پر وہ برابر یہی کوشش کرتے رہے کہ "ندائے ملّت" زبان و بیان، ترتیب اور اظہار خیال یا اظہار فکر میں جذباتیت سے پرہیز کرے۔ ندائے ملّت نے عصری معلومات کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے قومی، ملّی اور بین اقوامی مسائل پر نہ صرف اپنے ادارتی شعبہ کی سنجیدہ تحریروں کی اشاعت کی بلکہ لکھنے والوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کیا۔ ندائے ملّت ملک بھر میں مقبول تھا اور کثیر الاشاعت ہونے کے باوجود عوامی یا بازاری نہیں تھا وہ جذبے کی جگہ غور و فکر کی ترجمانی کرتا تھا۔

دوسرا ہفتہ وار "عزائم" تھا جو جمیل مہدی نے شروع کیا تھا آگے چل کر روزنامہ بھی ہو گیا تھا۔ ہفتہ وار عزائم بھی سنجیدہ اور فکر انگیز صحافت کی راہ پر ثابت قدم رہا۔ لیکن جمیل مہدی بنیادی طور پر ایک (باقی ص ۹۶ پر)
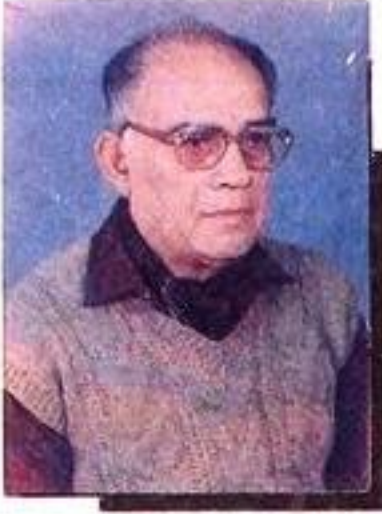
ڈاکٹر کاظم علی خاں
۲۰۔ بی، جاپلنگ روڈ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۱

اودھ میں

اُردو شاعروں کی آخری آرامگاہیں

صُوبوں اور ریاستوں کی جغرافیائی سرحدیں تغیرات، سیاسی انقلابات اور انتظام و انصرام کی ضروریات کے ہاتھوں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں۔ شمالی ہندستان کے قلب میں واقع صوبہ اودھ کی سرحدیں بھی جمع و تفریق کے اسی تاریخی عمل (Historical Phenomenou of plus and minus) سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ اوراقِ تاریخ شاہد ہیں کہ والیِ اودھ نواب سعادت علی خاں کے عہدِ حکومت (جنوری ۱۷۹۸ء تا جولائی ۱۸۱۴ء) کے دوران اودھ اور انگریزوں کے درمیان نومبر ۱۸۰۱ء میں ہونے والے معاہدہ الٰہ آباد کے نتیجے میں اودھ کا نقشہ گھٹ کر لگ بھگ آدھا رہ گیا تھا۔ پھر انگریزی سرکار نے اپنے دورِ حکومت میں اودھ میں آگرے کا علاقہ بڑھا کر اس کا نام ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ (United Provinces of Agra & Awadh) رکھا تھا۔ صوبۂ اودھ کی ان گھٹتی بڑھتی سرحدوں کے باعث پیدا ہونے والی پیچیدگی کے پیشِ نظر اس مقالے میں ہم نے اودھ کے بہ تفصیلِ ذیل صرف ان بارہ اضلاع سے سروکار رکھا ہے، جو ۱۸۶۳ء کے ایک پرانے نقشے کے مطابق اس صوبے میں شامل تھے:—

(۱) اُنام یعنی اُناؤ، (۲) بہرائچ، (۳) پرتاپ گڑھ، (۴) دریاباد، (۵) رائے بریلی، (۶) سلطان پور، (۷) سیتاپور (۸) فیض آباد، (۹) گونڈہ، (۱۰) لکھنؤ، (۱۱) لکھیم پور، (۱۲) ہردوئی

تہذیب و معاشرت، علوم و فنون اور شعر و سخن کے میدان میں معروف و مشہور اودھ جیسی سرزمین کی خاک جن بے شمار اردو شاعروں کی آخری اور دائمی آرام گاہوں کی امین ہے ان کے ناموں کے مکمل اعداد و شمار کا گوشوارہ تیار کرنا آسان نہیں۔ لہٰذا یہ مقالہ صرف ان شاعروں کے ذکر تک محدود ہے جو ہمارے علم اور حافظے میں موجود ہیں۔ خاکِ اودھ میں میدانِ شعر و سخن کے جو "گنج ہائے گراں مایہ" اپنی دائمی آرام گاہوں میں محوِ خواب ہیں، ان کے ذکر کا آغاز ان اشعار سے کرنا بے محل نہ ہوگا ؎

مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے"؟ ؎

——— غالبؔ

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں ؎

——— میر فتح علی شیداؔ

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا ؎

——— ناسخؔ لکھنوی

آتشؔ لکھنوی، خواجہ حیدر علی

وفات: ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ / چہار شنبہ ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء

مدفن: مادھولال کی چڑھائی (لکھنؤ) کے پاس واقع خود اپنے مکان میں دفن ہوئے تھے، اب مدفن کا نشان باقی نہیں۔

مصادر: ادبی مقالے ص ۱۴۳، آبِ بقا ص ۱۰۱، دیوانِ شرر ص ۳۴۸۔ تاریخ وفاتِ آتش شعر نمبر، آغا حجو شرف احوال و آثار ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۴

آرزو ۔ سراج الدین علی خاں ۔ (فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے)۔

وفات : ربیع الآخر ۱۱۶۹ھ / جنوری ۱۷۵۶ء (لکھنؤ میں فوت ہوئے)۔

مدفن : پہلے فیض آباد میں دفن ہوئے پھر اپنی وصیت کے مطابق دہلی میں دفن ہوئے ۔

مصادر : تذکرہ گلشن سخن ص ۵۵ تا ص ۵۶ ، تذکرہ ماہ و سال ص ۶۴

آسی الدنی ، مولوی عبدالباری

وفات : صفر ۱۳۶۸ھ / جنوری ۱۹۴۶ء

مدفن : قبرستان عیش باغ ، لکھنؤ

مصادر : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۳ ص ۳۲ ، تذکرہ ماہ و سال ص ۶۷

آصف لکھنوی ، آصف الدولہ

وفات : اواخر ربیع الاول ۱۲۱۲ھ / ستمبر ۱۷۹۷ء

مدفن : آصفی امام باڑہ لکھنؤ

مصادر : تاریخ آصفی ص ۲۵ حاشیہ ۱ ، ادبی مقالے ص ۵۵ ، لکھنؤ کے چند نامور شعراء جلد ۱ ص ۵۳ ، حاشیہ ۱

آہ امیٹھوی ، ممتاز علی (شاگرد امیر مینائی)

وفات : ۱۲ دسمبر ۱۹۳۵ء

مدفن : امیٹھی (لکھنؤ)

مصادر : دبستان امیر مینائی ص ۸۰ تا ص ۸۵

اثر لکھنوی ، نواب مرزا جعفر علی خاں

وفات : ۶ جون ۱۹۶۷ء

مدفن ، قبر کربلائے تال کٹورہ لکھنؤ کے اندرونی احاطے میں روضے کے جنوب کی جانب کھلے صحن میں موجود ہے ۔

مصادر : انتخاب غزلیات جعفر علی خاں اثر ص ۱۱ ، حدیث میر (دیباچہ)

احسن لکھنوی ، سید مہدی حسن

وفات : رجب ۱۳۵۸ھ / اگست ۱۹۳۹ء

مدفن : امام باڑا آغا باقر لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۴ ص ۲۸

اختر لکھنوی ، مرزا سجاد علی خاں

وفات : اکتوبر ۱۹۷۶ء

مدفن : امام باڑا غفران مآب لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ معاصرین جلد ۴ ص ۱۴۷

اختر لکھنوی ، یونس خالدی

وفات : ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۵ء

مدفن : قبرستان عیش باغ ، لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۵ ص ۵۰

اخگر ، وصی احمد

وفات : ۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء

مدفن : قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر : آرزو لکھنوی ۔ حیات اور کارنامے ص ۸۱ ، تذکرہ ماہ و سال ص ۲۸ بکھرتی یادیں ص ۱۳۵

ادب لکھنوی ، سید حیدر میرزا

وفات : اواخر محرم ۱۳۱۴ھ / جولائی ۱۸۹۶ء

مدفن : احاطۂ روضۂ زینبیہ لکھنؤ

مصادر : مہذب اللغات جلد ۱ ص ۱۰ ، معاصر پٹنہ ۲ ص ۱۲۵

ادیب لکھنوی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی (پدم شری)

وفات : ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء / ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ

مدفن : کربلائے منشی تفضل حسین خاں ، لکھنؤ

مصادر : تذکرہ معاصرین جلد ۳ ص ۳۲۳ ، تذکرہ ماہ و سال ص ۳۰ میں ہجری سال وفات درست نہیں ، پروفیسر ادیب محقق (قلمی نسخہ ورق ۱)

ادہم لکھنوی ، بہادر حسین

وفات : ۱۹۱۱ء

مدفن : کربلائے امداد حسین خاں لکھنؤ (یہ کربلائے امین الدولہ بھی کہی جاتی ہے)

ماخذ : تذکرہ ماہ و سال ص ۳۰

ازل لکھنوی ، آغا حسن

وفات : ۱۴-۱۳۱۳ھ / ۹۷-۱۸۹۶ء

مدفن : لکھنؤ

ماخذ : ادبی مقالے ص ۱۶۵

آسلم لکھنوی، محمد اسماعیل

وفات: ۲۴ر اپریل ۱۹۷۷ء مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ معاصرین جلد ۴ ص ۲۴۹، چند شعرائے اردو۔ تحریر و تصویر کے آئینے میں حصہ ۱ ص ۲۱

اسیر لکھنوی، تدبیر الدولہ منشی سید مظفر علی

وفات: ۷ار ربیع الاول ۱۲۹۹ھ / ۷ر فروری ۱۸۸۲ء

مدفن: لکھنؤ

مصادر: مظفر علی اسیر اور ان کا عہد ص ۱۹۷ تا ص ۱۸۶، تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۳، معاصر پٹنہ حصہ ۲ ص ۱۲۱

اشہر لکھنوی

وفات: ۱۱ر جنوری ۱۹۶۷ء مدفن: قبرستان اہل تشیع سیتاپور

مصادر: تذکرۂ ماہ و سال ص ۳۶، آغا اشہر لکھنوی کے فرزند ڈاکٹر آغا ہادی مسیح شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ سے ۴ر نومبر ۱۹۹۳ء کو ملنے والی ذاتی معلومات۔

لطہر فیض آبادی، اطہر حسین (آئی اے ایس)

وفات: ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۸ء مدفن: غالباً فیض آباد

ماخذ: ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ ۸ر جنوری ۱۹۸۹ء ص ۲

افسر میرٹھی، حامد اللہ

وفات: ۱۹ر اپریل ۱۹۷۴ء مدفن: قبرستان اطبائے لکھنؤ جھوائی ٹولہ

مصادر: تذکرہ معاصرین جلد ۳ ص ۹، تذکرہ شعرائے اتر پردیش جلد ۱ ص ۲۲

افسر لکھنوی، سید نواب

وفات: ۷ر اگست ۱۹۸۱ء مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

مصادر: تخلیقی نقوش ص ۱۳، تذکرہ شعرائے اتر پردیش جلد ۹ ص ۴۸

افسردہ: مرزا پناہ علی (مرثیہ نگار)

وفات: ۱۲۵۰ھ مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

مصادر: آبِ بقا ص ۱۱، اردو مرثیے کی روایت ص ۱۹۷

افقر موہانی وارثی، سید محمد حسین

وفات: رمضان ۱۳۹۱ھ / نومبر ۱۹۷۱ء

مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: صحیفہ تواریخ ص ۹۴ تذکرۂ معاصرین جلد ۱ ص ۲۷۸، تذکرہ شعرائے اتر پردیش جلد ۵ ص ۴۵ تا ص ۴۶

امانت لکھنوی، سید آغا حسن

وفات: ۲۸ر جمادی الاول ۱۲۷۵ھ / ۳ر جنوری ۱۸۵۹ء

مدفن: مسافر خانہ نزد امامباڑہ آغا باقر لکھنؤ

مصادر: ضیاء نور ص ۲۲۴ تلاش و تحقیق ص ۳۷۹، لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۸۰

انس لکھنوی، سید محمد میرزا

وفات: جمادی الاول ۱۳۰۲ھ / فروری ۱۸۸۵ء

مدفن: باغ میر عشق واقع دال منڈی نزد رکاب گنج لکھنؤ

مصادر: حضرت رشید ص ۳۴، مہذب اللغات جلد ۱ ص ۳۸۵

انس: میر مہر علی

وفات: محرم ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء مدفن: مقبرہ حکیم مہدی لکھنؤ

مصادر: مہذب اللغات جلد ۱ ص ۳۸۴، باقیات انیس جلد ۱ ص ۱۵۵، تذکرہ ماہ و سال ص ۵۴

انشا، انشاء اللہ خاں

وفات: اواخر جمادی الآخر ۱۲۳۳ھ / مئی ۱۸۱۸ء

مدفن: امامباڑا آغا باقر لکھنؤ

مصادر: مقالات و نشریات ص ۳۸۵، انشاء اللہ خاں انشا، ص ۲۸۱ تا ص ۲۸۲

انیس، میر ببر علی

وفات: ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء / ۲۹ر شوال ۱۲۹۱ھ

مدفن: مزار انیس نزد چوک لکھنؤ۔ قدیم مدفن انیس کی بیسویں صدی عیسوی میں جدید تعمیر ہو چکی ہے۔

مصادر: حیاتِ انیس ص ۱۹، واقعاتِ انیس ص ۱۲۸، انیسیات ص ۱۰۰، خیابانِ تواریخ ص ۶

اوج لکھنوی، مرزا محمد جعفر

وفات: ۲۵ر جمادی الآخر ۱۳۲۵ھ / ۱۸ر اپریل ۱۹۱۷ء

مدفن: احاطہ مزارِ دبیر واقع کوچہ مرزا دبیر نزد نخاس لکھنؤ

مصادر: تلاشِ دبیر ص ۱۵۱، دبستانِ دبیر ص ۱۸۲، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی۔ حیات اور ادبی کارنامے ص ۱۱۵ تا ص ۱۱۶

بادشاہ لکھنوی، نصیر الدین حیدر (فرماں روائے اودھ)

وفات: ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ / جولائی ۱۸۳۷ء

مدفن: کربلائے نصیر الدین حیدر متصل ڈالی گنج ریلوے جنکشن لکھنؤ۔ شیعہ ڈگری کالج ڈالی گنج لکھنؤ کی عمارت اسی کربلا کی آراضی پر واقع ہے۔

ماخذ: کلام نصیر الدین حیدر بادشاہ صفحہ "ض" نیز ذاتی معلومات

بحر لکھنوی، شیخ امداد علی (شاگرد ناسخ)

وفات: ۱۲۹۵ھ۔ متعدد مصادر میں بحر لکھنوی کا سنہ وفات غلطی سے ۱۳۰۰ھ درج ہوا ہے۔

مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ (آب بقا)

مصادر: لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۵۹، آب بقا ص ۱۴۴، قصیدہ نگاران اتر پردیش ص ۹۲ اور تذکرہ ماہ و سال ص ۷۶ میں بحر کا سنہ وفات ۱۳۰۰ھ درست نہیں، بحر کا صحیح سنہ وفات ۱۲۹۵ھ ہے جو تلخیص تاریخ لطیف مشمولہ نگار رام پور جولائی ۱۹۶۲ء ص ۲۹ نیز زبان اور قواعد ص ۱۵۸ تا ص ۱۵۹ حاشیہ ۲؎ نیز ص ۴۲۸ تا ص ۴۲۹ میں دیکھا جا سکتا ہے

بسمل سندیلوی، چودھری سید امیر حسن

وفات: ۱۷؍ دسمبر ۱۹۷۶ء مدفن: آبائی قبرستان نزد آئی۔ آر انٹر کالج سندیلہ (ضلع ہردوئی)

ماخذ: تذکرۂ معاصرین جلد ۲ ص ۳۲۳

بسمل کاکوروی، منشی واحد علی (تلمیذ امیر مینائی)

وفات: جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ / اپریل ۱۹۱۷ء

مدفن: احاطۂ درگاہ حضرت شاہ صبغت اللہ کاکوروی

مصادر: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۴۷، دبستان امیر مینائی ص ۱۰۷ تا ص ۱۰۸، تذکرۂ ماہ و سال ص ۸۳

بقا لکھنوی، میر بادشاہ علی (فرزند میر وزیر علی صبا لکھنوی)

وفات: رجب ۱۳۲۳ھ / ستمبر ۱۹۰۵ء

مدفن: مسجد میر صبا لکھنوی واقع احاطہ سنگی بیگ لکھنؤ

مصادر: انتخاب صبا ص ۸، دبستان دبیر ص ۲۶۶ تا ص ۲۶۷، قلزم اعجاز ص ۲۴۰ میں بقا کا سال وفات ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء ملتا ہے۔

بسمبوق رُدولوی، شیخ ولایت علی

وفات: جولائی ۱۹۱۸ء مدفن: مسولی

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص ۸۶

بیخود موہانی، سید محمد احمد (سابق صدر شعبۂ اردو شیعہ انٹر کالج لکھنؤ)

وفات: نومبر ۱۹۴۰ء

مدفن: کربلائے منشی فضل حسین خاں، لکھنؤ

ماخذ: بیخود موہانی۔ حیات و شاعری ص ۴۸

بیدل کاکوروی، حافظ علی عسکری خاں

وفات: ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء

مدفن: خاندانی قبرستان رسولی باغ کاکوری

ماخذ: تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۲۸۵ تا ص ۲۸۷

تپش، مولوی غلام محمد خاں (شاگرد غالب)

وفات: ۱۳۲۰ھ مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: تلامذہ غالب ص ۱۰۹، آب بقا ص ۱۷۰، نیا دور لکھنؤ نول کشور نمبر ص ۱۵۰ تا ص ۱۵۱ حاشیہ ۹

ترقی لکھنوی، اسد الدولہ رستم الملک آغا محمد تقی خاں بہادر فیل جنگ

وفات: ۲۴؍ شعبان ۱۲۴۶ھ / سہ شنبہ ۸؍ فروری ۱۸۳۱ء

مدفن: خاندانی ہڑواڑ واقع محلہ نور باڑی لکھنؤ

ترقی کی لوح مزار پر ان کے فرزند مرزا حیدر (حیدر) کا یہ فارسی قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

اسد اللہ رفت زیں عالم	در شب بست و چارم شعباں
بود روز سہ شنبہ وقت صباح	کہ شد آں مہر در زمیں پنہاں
گشت تاریک از غمش عالم	چوں کہ او بود حاتم دوراں

سال تاریخ فوت حیدر گفت

کہ "بود او مکین باغ جناں"

۱۲۴۶ھ

(بشکریہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین لکھنؤ)

تسلیم لکھنوی، منشی امیر اللہ

وفات: اواخر جمادی الاول ۱۳۲۹ھ / اواخر مئی ۱۹۱۱ء

مدفن : کربلا خدا یار خاں لکھنؤ

مصادر : نگار رامپور جولائی ۱۹۶۲ء ص ۳۱ ، ادبی مقالے ص ۲۹۶ میں ہجری سنہ وفات ۱۳۲۹ھ کتابت کا سہو ، امیر اللہ تسلیم حیات و شاعری ص ۳۰

تعشق لکھنوی ، سید میرزا

وفات : رمضان ۱۳۰۹ھ / اپریل ۱۸۹۲ء

مدفن : باغ میر عشق واقع دال منڈی نزد رکاب گنج لکھنؤ

مصادر : حضرت رشید ص ۳۹ ، مہذب اللغات جلد ۳ ص ۲۷۲

ثاقب لکھنوی ، ذاکر حسین قزلباش

وفات : ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء

مدفن : امام باڑا غفران مآب لکھنؤ (ذاتی معلومات)

مصادر : تلاش و تعارف ص ۲۷۱ ، تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۶ ص ۸۷ تلازم اعجاز ص ۲۵۵

جان لکھنوی ، جان رابرٹ

وفات : ۱۳ مئی ۱۸۹۲ء — مدفن : غالباً لکھنؤ

ماخذ : اردو کے یورپین شعراء ص ۴۰ تا ص ۴۱

جرأت لکھنوی ، شیخ قلندر بخش

وفات : ۱۲۲۴ھ — مدفن : لکھنؤ

مصادر : ادبی مقالے ص ۱۳۵ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۱۵

جگر بسوانی ، حکیم محمد افتخار علی صدیقی (شاگرد امیر مینائی)

وفات : ۷ مئی ۱۹۵۸ء — مدفن : بسواں ضلع سیتاپور

مصادر : دبستان امیر مینائی ص ۱۳۷ ، تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۸ ص ۹۳

جگر مرادآبادی ، علی سکندر

وفات : ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء — مدفن : گونڈہ

مصادر : مقالات و نشریات ص ۱۵۸ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۱۶ تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۱ ص ۱۲۰

جعفر لکھنوی ، نواب فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر

وفات : ۱۲۳۰ھ

مدفن : امامباڑا مرزا محمد زکی علی خاں واقع پل زنگی محل (نزد پولیس چوکی پاٹا نالہ) لکھنؤ

مصادر : تذکرۂ بے بہا ص ۲۸۰ تا ص ۲۸۱ ، تلاش و تحقیق ص ۴۵۶ تا ص ۴۵۷ حاشیہ ۱۷

جلال لکھنوی ، حکیم میر ضامن علی

وفات : شوال ۱۳۲۷ھ / اکتوبر ۱۹۰۹ء

مدفن : کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

مصادر : مقالات و نشریات ص ۴۳ ، لکھنؤ کے چند نامور شعراء جلد ۱ ص ۲۴۳ و ص ۲۴۷

جلیس ، سید ابو محمد (شاگرد عارف و رشید)

وفات : ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء — مدفن : احاطہ مزار میر انیس لکھنؤ

مصادر : باقیات انیس ، جلد ۱ ص ۱۵۷ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۱۰

جوش لکھنوی ، خواجہ محمد علی (فرزند خواجہ حیدر علی آتش)

وفات : ۱۲۶۴ھ بمقام لکھنؤ — مدفن : لکھنؤ

مصادر : آب بقا ص ۱۷ تا ص ۱۸ ، ادبی مقالے ص ۱۴۷ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۳۰

جھنجھٹ لکھنوی ، مشرف علی صدیقی

وفات : ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ء — مدفن : قبرستان عیش باغ لکھنؤ

ماخذ : تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۳ ص ۱۰۱ تا ص ۱۰۳

حسرت ، جعفر علی

وفات : ۱۲۰۶ھ — مدفن : نخاس لکھنؤ سے متصل خود اپنی حویلی میں دفن ہوئے ۔ اب حویلی و مدفن دونوں کا پتہ نہیں ۔ حسرت کے سال وفات اور مدفن دونوں کے باب میں اختلاف ملتا ہے ۔

ماخذ : تحقیق نامہ ص ۱۱۷ تا ص ۱۱۸

حسرت موہانی ، سید فضل الحسن

وفات : یک شنبہ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء — مدفن : باغ مولوی انوار لکھنؤ

ماخذ : حسرت موہانی - حیات اور کارنامے ص ۱۳۷

حسن ، میر غلام حسن (صاحب مثنوی سحر البیان)

وفات : یکم محرم ۱۲۰۱ھ / ۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء

مدفن : عقب باغ مرزا قاسم علی خاں واقع محلہ مفتی گنج لکھنؤ

ماخذ : اسلافِ میر انیس ص۶۶ تا ص۶۸

حشؔ سیتاپوری ، سید محمد کاظم

وفات : ۱۰؍ جون ۱۹۷۳ء

مدفن : کربلائے سلیم پور نزد سیتاپور ریلوے اسٹیشن سیتاپور

مصادر : تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۱۲ ص۱۴۷ ، تذکرۂ ماہ و سال ص۱۳۳

حمیدؔ لکھنوی ، زائرِ حرم عبدالحمید صدیقی

وفات : ۱۵؍ فروری ۱۹۶۵ء مدفن : قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر : تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۷ ص۹۶ ،

چند شعرائے اردو ۔ تحریر و تصویر کے آئینے میں حصہ ۲ ص۱۶

خبیرؔ لکھنوی ، سید سرفراز حسین

وفات : صفر ۱۳۸۵ھ / جون ۱۹۶۵ء

مدفن : شبیہ روضۂ حضرت حرؑ واقع ٹیلہ لکھنؤ ۔ تال کٹورا روڈ پر واقع پٹرول پمپ کے شمال میں نو تعمیر شدہ کالونی کے عقب (مغرب) میں شبیہ روضۂ حضرت حر موجود ہے ۔

مصادر : دبستانِ دبیر ص۹۱۴ ، لکھنؤ کے چند نامور شعراء جلد ۱ ص۱۲۷

تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۲ ص۱۰۹

خلیقؔ ، میر مستحسن (پدرِ میر انیس)

وفات : ۱۲۶۰ھ

مدفن : اپنے فرزند میر انیس کے امام باڑے میں دفن ہوئے جو ۱۸۵۷ء میں نیست و نابود ہوگیا ۔ اس کا محل وقوع ہاتھی پارک لکھنؤ کے مقابل دریائے گومتی کے جنوب کی جانب افتادہ زمین پر بتایا جاتا ہے جو ریلوے پل سے متصل ہے ۔

ماخذ : اسلافِ میر انیس ص۱۴۰ تا ص۱۴۱

خلیلؔ شاہجہاں پوری ، ڈاکٹر عبدالاحد خاں

وفات : ۱۱؍ فروری ۱۹۸۲ء مدفن : قبرستانِ عیش باغ لکھنؤ

ماخذ : نثر نگارانِ اردو (اترپردیش ملا) جلد ۱ ص۱۹۲

خلیلؔ لکھنوی ، دوست علی (شاگرد خواجہ آتش)

(زمانۂ وفات اور مدفن نامعلوم)

ماخذ : دبستانِ آتش ص۱۰۷ تا ص۱۰۸

دبیرؔ لکھنوی ، مرزا سلامت علی

وفات : ۹؍ مارچ ۱۸۷۵ء / ۳۰؍ محرم ۱۲۹۲ھ

مدفن : مکان مسکونہ خود واقع کوچہ مرزا دبیر لکھنؤ

ماخذ : تلاشِ دبیر ص۱۹ تا ص۲۱ حاشیہ ملا

(تذکرۂ ماہ و سال ص۱۵۱ میں تاریخ وفات دبیر "سلخ محرم ۱۱۹۲ھ مطابق ، مارچ ۱۸۷۵ء" کا اندراج درست نہیں ۔ کاظم)

دلگیرؔ غلام حسن

وفات : ۲۴؍ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ / ۲۲؍ اکتوبر ۱۸۴۸ء

مدفن : ٹیڑھی قبر واقع چڑیا بازار نخاس لکھنؤ (بہ حوالہ پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی و خبیر لکھنوی)

مصادر : معتمد الہ آغا میر ۔ اسلاف و اخلاف ص۱۰۱ ، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۴۷۳ ، تذکرۂ ماہ و سال ص۱۵۴

دلؔ لکھنوی ، عبدالرزاق

وفات : ۱۹؍ دسمبر ۱۹۸۰ء مدفن : آبائی قبرستان صدر بازار لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۵ ص۱۳۹

ذکیؔ لکھنوی ، منے آغا

وفات : ۳؍ نومبر ۱۹۶۲ء مدفن : کربلائے ملکہ جہاں عیش باغ لکھنؤ

ماخذ : تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۳ ص۱۵۴

ذوقؔ کاکوروی ، مولوی محی الدین

وفات : ۳؍ جمادی الآخر ۱۳۰۳ھ / ۹؍ مارچ ۱۸۸۶ء

مدفن : خطیرا متصل چاند محل کاکوری

ماخذ : تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص۲۹۸

رازؔ بلگرامی ، سید شریف الحسن

وفات : ۱۰؍ اگست ۱۹۷۱ء مدفن : امام باڑا حکیم احمد حسن بلگرام (ضلع ہردوئی)

ماخذ : تذکرۂ معاصرین جلد ۱ ص۳۵۵ تا ص۲۵۶

رزمؔ ردولوی ، جعفر مہدی

وفات : ۹؍ ستمبر ۱۹۸۷ء مدفن : ردولی

ماخذ : تذکرۂ ماہ و سال ص۱۶۵

رسا لکھنوی، میر عابد علی (خلف میر وزیر علی صبا لکھنوی)

وفات: ۱۹۱۸ء مدفن: اما مباڑہ اکرام اللہ خاں نخاس لکھنؤ

مصادر: انتخاب صباحت ص ۵ تا ص ۶، دبستان دبیر ص ۲۶۰،
تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۶۵

رشید لکھنوی۔ (دیکھئے نواب مرزا محمد زکی علی خاں زکی لکھنوی)

رشید لکھنوی، سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب

وفات: ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ / اوائل ستمبر ۱۹۱۸ء

مدفن: باغ میر عشق محلہ دال منڈی نزد رکاب گنج، لکھنؤ

مصادر: حضرت رشید ص ۲۱۳، مہذب اللغات جلد ۶ ص ۳۶، معاصرین حصہ ۲
ص ۱۲۷، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۶۷

رفیع لکھنوی، مرزا محمد طاہر

وفات: ۱۹۴۸ء مدفن: احاطۂ مزار دبیرؔ واقع کوچہ مرزا دبیر

ماخذ: تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۱۲ ص ۹۵

رفیق لکھنوی، ڈاکٹر رفیق حسین

وفات: ۱۹۹۳ء مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

ماخذ: ذاتی معلومات

رہبر لکھنوی، نواب سجاد علی خاں

وفات: ۱۹۹۲ء (تاریخ وفات تصدیق طلب)

مدفن: کربلائے امین الدولہ امداد حسین خاں، لکھنؤ

ماخذ: ذاتی معلومات

ریاض خیرآبادی، سید ریاض احمد

وفات: ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء

مدفن: خطیرا (خاندانی قبرستان) خیرآباد ضلع سیتاپور

مصادر: تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۳ ص ۱۶۰، تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۶۹

رئیس لکھنوی، سید عسکری

وفات: دوشنبہ ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۰۹ھ / نومبر ۱۸۹۱ء

مدفن: احاطہ مرزا انیس لکھنؤ

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۶۹

زکی و رشید لکھنوی، نواب مرزا محمد زکی علی خاں (شاگرد انیس)

وفات: سنہ وفات نامعلوم

مدفن: اما مباڑا زکی علی خاں، واقع پل فرنگی محل لکھنؤ

مصادر: تلاش و تحقیق ص ۲۶۸ تا ص ۲۸۱، شاگردانِ انیس ص ۲۱۹

ساحر لکھنوی، سید افتخار حسین رضوی

وفات: ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء مدفن: کربلائے امداد حسین خاں لکھنؤ

مصادر: قومی آواز لکھنؤ ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء، دستاویز ص ۱۳۵ نیز
ذاتی معلومات

ساحر کاکوروی، شیخ فضل حق عرف منشی غلام مینا

وفات: ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ / ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء

مدفن: تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری

مصادر: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۳۱۳، تلامذۂ مصحفی ص ۱۵۲ نیز ص ۱۵۵

ساحر، مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد اسٹیٹ

وفات: ۳ محرم ۱۳۵۰ھ / ۲۲ مئی ۱۹۳۱ء

مدفن: کربلائے محمود آباد

مصادر: تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۸۳، تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۴
ص ۱۵ نیز ص ۱۳۶، مراثی محب ص ۲۰ میں تاریخ وفات ۴۰ محرم
۱۳۵۱ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء" کا اندراج مشکوک ہے۔ ساحر نے
مرثیہ نگاری میں اپنا تخلص محب رکھا تھا۔

ساغر بہرائچی، سید ساغر مہدی

وفات: ۲۰ دسمبر ۱۹۸۰ء مدفن: بہرائچ

ماخذ: تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۲ ص ۱۵۳

سالک لکھنوی، سید محمد حسن

وفات: ۱۱ مارچ ۱۹۷۶ء مدفن: اما مباڑا غفران مآب لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ معاصرین جلد ۴ ص ۵۹ تا ص ۶۰، سالک لکھنوی ص ۳۴۴،
تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۹ ص ۱۵۴

سجاد کاکوروی، منشی سجاد حسین (مدیر اودھ پنچ لکھنؤ)

وفات: شنبہ ۶ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ / ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء

مدفن: تکیہ بے نوا شاہ کاکوری

مصادر: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۱۸۳ تا ص ۱۸۴، نثر نگارانِ اُردو (اترپردیش)

جلد ۱ ص ۱۴۹

سحرؔ، احمد حسین (صاحب تذکرۂ بہار بے خزاں)

وفات: ۱۶ر صفر ۱۲۸۹ھ / اپریل ۱۸۷۲ء   مدفن: غالباً کاکوری

ماخذ: "تلاش و تعارف" ص ۴۲

سحرؔ محمود آبادی، امیر الدولہ راجا امیر حسن خاں آف محمود آباد اسٹیٹ

وفات: ۳۰ر مئی ۱۹۰۳ء   مدفن: کربلائے محمود آباد

ماخذ: "تذکرۂ ماہ و سال" ص ۱۸۹

سحرؔ کاکوروی، منشی عبد المجید (فرزند منشی غلام مینا کاکوروی)

وفات: سہ شنبہ ۲۲ر مئی ۱۸۹۹ء

مدفن: خاندانی قبرستان، متصل تکیہ شریف کاکوری

ماخذ: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۲۶۵ تا ص ۲۶۶

سحرؔ مقیم الدولہ نواب محمد علی محمد خاں (والیٔ محمود آباد)

وفات: یک شنبہ ۱۰ر رمضان ۱۲۷۴ھ / ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء

مدفن: کربلائے محمود آباد

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۸۹

سراجؔ لکھنوی، سراج الحسن

وفات: ۲۳ر جنوری ۱۹۶۸ء   مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۶ ص ۱۵۶

تذکرۂ معاصرین جلد ۱ ص ۴۵

سروشؔ طباطبائی، سید محمد عسکری

وفات: ۳ر مئی ۱۹۶۶ء   مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

ماخذ: تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۷ ص ۱۴۹

سلیسؔ لکھنوی، سید محمد (فرزند میر انیس)

وفات: ۱۶ر ربیع الآخر ۱۳۰۸ھ / ۳۰ر نومبر ۱۸۹۰ء

مدفن: مزار انیس لکھنؤ

ماخذ: باقیاتِ انیس جلد ۱ ص ۱۵۶

سلیمؔ پانی پتی، مولوی وحید الدین

وفات: ۱۰ر صفر ۱۳۴۷ھ / ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء

مدفن: ملیح آباد (ضلع لکھنؤ)

ماخذ: وحید الدین سلیم - حیات اور ادبی خدمات ص ۵۰

سلیمؔ جرولی، سید اکبر مہدی

وفات: ۱۹۴۷ء   مدفن: محمود آباد

ماخذ: دبستانِ دبیر ص ۵۸۲ نیز ص ۵۸۶

سوداؔ، مرزا محمد رفیع

وفات: ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء   مدفن: امامباڑا آغا باقر لکھنؤ

ماخذ: مرزا محمد رفیع سودا ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۱

سوزؔ، سید محمد میر

وفات: ۱۲۱۳ھ ("داغ اب سوز کا لگا دل کو" — جرأت)

۱۲۱۳ ہجری

مدفن: لکھنؤ

مصادر: انتخاب میر سوز ص ۴، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۰۱

سیدؔ لکھنوی مفتی محمد عباس

(شیعہ عالم دین اور مرزا غالب کے مکتوب الیہ)

وفات: ۲۵ر رجب ۱۳۰۶ھ / اواخر مارچ ۱۸۸۹ء

مدفن: امامباڑا غفران مآب لکھنؤ

مصادر: تجلیات۔ باب السیرۃ ص ۳۲۰ تا ص ۳۲۲، تذکرۂ بے بہا ص ۲۳۱، خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۰۱، اردوئے معلٰی حصہ اول ص ۲۱۷ تا ص ۲۱۸

شادؔ لکھنوی، محمد جان

وفات: یک شنبہ ۶ر ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ / اگست ۱۸۹۹ء

مدفن: احاطۂ روضۂ فاطمین نزد درگاہ حضرت عباس رستم نگر لکھنؤ

مصادر: آبِ بقا ص ۹۸ نیز ۱۷۰، نگار رامپور جولائی ۱۹۲۳ء ص ۴۳، انتخابِ شاد بیرو میر ص ۶، تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۱۰

شدیدؔ لکھنوی، سید سجاد حسین

وفات: ۲۷ر رجب ۱۳۹۸ھ / اوائل جولائی ۱۹۷۸ء

مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۱۷

شررؔ کاکوروی، ارتضیٰ علی (شاگرد داغ دہلوی)

وفات: ۱۵ر ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ / اگست ۱۹۲۱ء

مدفن: متصل عیدگاہ سیتاپور

ماخذ: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص۲۷ تا ص۳۰

شرر لکھنوی، مولانا عبدالحلیم (شاگرد امیر مینائی و نظم طباطبائی)

وفات: جمعہ ۱۷ر جمادی الآخر ۱۳۴۵ھ/ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء

مدفن: قبرستان جھوائی ٹولہ لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ ماہ و سال ص۲۱۸، دبستان امیر مینائی ص۲۱۵ تا ص۲۱۷

شکو لکھنوی، دانیال ساکرمینس تھینال گارڈنر

وفات: ۲۷ر ستمبر ۱۹۰۷ء

مدفن: غالب لکھنؤ

ماخذ: اُردو کے یورپین شعراء ص۶۳ تا ص۶۴

شمس لکھنوی، ابوالفضل تصدق حسین خاں

وفات: دسمبر ۱۹۶۲ء مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

ماخذ: دبستان امیر مینائی ص۲۲۷ تا ص۲۲۹

شمسی لکھنوی، حکیم شکیل احمد

وفات: ۱۲ر نومبر ۱۹۸۵ء مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

ماخذ: تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۵ ص۱۷۱

شمشاد لکھنوی، مولوی عبدالاحد

وفات: ۲۵ر ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ مدفن: باغ مولوی انوار لکھنؤ

ماخذ: تذکرہ علمائے فرنگی محل ص۱۸۹

شوق بہرائچی، ریاست حسین

وفات: ۱۳ر جنوری ۱۹۶۴ء

مدفن: تکیہ چھڑے شاہ، متصل آزاد انٹر کالج بہرائچ

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص۲۲۸

شوق سندیلوی، محمد عبدالعلی

وفات: ۱۸ر جنوری ۱۹۵۷ء مدفن: آبائی قبرستان سندیلہ (ضلع ہردوئی)

ماخذ: تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۷ ص۱۹۱

شوق لکھنوی، حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب مرزا

وفات: ربیع الآخر ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء

مدفن: کربلائے امداد حسین خاں لکھنؤ (تحقیق طلب)

ماخذ: حیاتِ شوق ص۷۹ تا ص۸۱

شہنشاہ مرزا

وفات: ۲۲ر جنوری ۱۹۸۸ء مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: تذکرہ ماہ و سال ص۴۲۷ ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ ۸ر جنوری ۱۹۸۹ء ص۱

شہید لکھنوی، شیخ محمد بخش (شاگرد ناسخ)

وفات: ۱۲۷۷ھ مدفن: لکھنؤ

مصادر: ضیاء نور ص۲۲۵، تلاش و تحقیق ص۳۷۹ تا ص۳۷۷

شہید لکھنوی، مرزا صادق حسین

وفات: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۷ء مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

ماخذ: تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۲ ص۱۹۳

صبا لکھنوی، میر وزیر علی (شاگرد خواجہ حیدر علی آتش)

وفات: ۲۷ر رمضان ۱۲۷۱ھ/ ۱۳ر جون ۱۸۵۵ء

مدفن: احاطہ مسجد صبا واقع احاطہ سنگی بیگ لکھنؤ

ماخذ: انتخاب صبا ص۵

صحنی لکھنوی، سید ابن علی ایڈووکیٹ

وفات: ۱۶ر اپریل ۱۹۸۹ء

مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ (ذاتی معلومات)

صفی لکھنوی، سید علی نقی

وفات: ۲۵ر جون ۱۹۵۰ء

مدفن: احاطہ مقبرہ ٹھاکر نواب علی خاں (متصل امامباڑا غفران مآب) لکھنؤ

مصادر: مقالات و نثریات ص۳۰، صفی لکھنوی ـ حیات اور کارنامے ص۳۸ تا ص۴۰

ضمیر لکھنوی، سید مظفر حسین (مرثیہ نگار)

وفات: ۲۳ر محرم ۱۲۷۲ھ/ شنبہ ۶ر اکتوبر ۱۸۵۵ء

مدفن: مسجد میر ضمیر مفتی گنج لکھنؤ (اس مسجد کی جگہ اب ایک اقامتی مکان تعمیر ہو چکا ہے اور مکان سے متصل ایک نئی مسجد بھی بنا دی گئی ہے، مگر اس نئی مسجد میں ضمیر کی قبر موجود نہیں)۔

مصادر: تلاش دبیر ص۱۹۶، تذکرۂ ماہ و سال ص۲۳۶، تقویم یک صد و دو سالہ لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء

طالب سیتاپوری، حکیم سید محمد شریف (شاگرد مرزا غالب)

وفات : ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ / ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء

مدفن : تکیہ مدار شاہ ، محلہ قضیارہ سیتاپور

ماخذ : تلامذۂ غالب ص ۳۷

ظریف لکھنوی ، سید مقبول حسین

وفات : ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء   مدفن : قبرستان کھجوہ (شاستری نگر) لکھنؤ

مصادر : کلیاتِ ظریف " دیوانجی " پیش گفت ص ۷۳ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۵۳

تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۱۰ ص ۱۸۷

ظفر الملک علوی ، اسحاق علی کاکوروی

وفات : فروری ۱۹۴۶ء   مدفن : کاکوری

ماخذ : تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۵۴

عارف لکھنوی ، سید علی محمد

وفات : ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ / اکتوبر ۱۹۱۶ء

مدفن : احاطۂ مزارِ انیس، لکھنؤ

مصادر : نگارشاتِ ادیب ص ۲۲۳ ، قلزم اعجاز ص ۲۶۳

عالم لکھنوی ، میرزا الطاف حسین

وفات : ۲۰ مارچ ۱۹۵۲ء

مدفن : مسجد عزاخانہ سید تقی صاحب نزد سرکٹا نالہ لکھنؤ

مصادر : نغماتِ طوبیٰ ص ۱۶ ، تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۸ ص ۲۰۸

عرش لکھنوی ، میر حسن عسکری عرف میر کلو (فرزند میر تقی میر)

وفات : ۱۸۶۷ء   مدفن : باغ میر عشق محلہ دال منڈی لکھنؤ

مصادر : دیوانِ عرش ص ۱۲ نیز ص ۱۴ ، حضرت رشید ص ۱۹ تا ص ۲۰

نگارشاتِ ادیب ص ۲۴۰ تا ص ۲۴۲

عرفان لکھنوی ، سید بادشاہ حسین

وفات : ۲ نومبر ۱۹۲۵ء   مدفن : کربلائے امداد حسین خاں لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۴ ص ۲۳۸

عروج لکھنوی ، سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب

(فرزند میر نفیس خلف و جانشین میر انیس)

وفات : ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء / ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ

مدفن : احاطۂ مزارِ انیس لکھنؤ

مصادر : نگارشاتِ ادیب ص ۲۷۳ ، دولھا صاحب عروج ص ۱۰۵ نیز ص ۱۳۵

(عروج نے ایرا میڈیکل سنٹر ۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ نخاس لکھنؤ کے جنوب میں واقع مکانِ مسکونہ نواب مرزا محمد حسین علی عرف بنا صاحب (عقب معدن الادویہ) میں وفات پائی تھی۔ معدن الادویہ نخاس جہاں حکیم صاحب عالم کا مطب تھا، اب وہاں ایک نو تعمیر مارکٹ تیار ہو گئی ہے)

عزیز صفی پوری ، ولایت علی خاں (شاگرد مرزا غالب)

وفات : ۲ جولائی ۱۹۲۸ء

مدفن : درگاہ حضرت شاہ مخدوم خادم صفی ، صفی پور (ضلع اناؤ)

مصادر : تلامذۂ غالب ص ۲۱۱ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۷۲

عزیز لکھنوی ، مرزا محمد ہادی

وفات : دوشنبہ ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء / ۲۷ ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ

مدفن : باغ مرزا عباس علی خاں واقع کھجوہ (شاستری نگر) لکھنؤ

مصادر : عزیز لکھنوی ۔ حیات اور کارنامے ص ۵۱ تا ص ۵۲ ، شیعہ کالج میگزین لکھنؤ ۹۲-۱۹۹۱ء عزیز لکھنوی نمبر ص ۱۱۲

عشرت لکھنوی ، خواجہ عبدالرؤف

وفات : ۹ جون ۱۹۴۰ء   مدفن : لکھنؤ

ماخذ : تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۷ ص ۲۲۲

عشق لکھنوی ، سید حسین میرزا

وفات : ۲۴ شعبان ۱۳۰۳ھ / اواخر مئی ۱۸۸۶ء

مدفن : باغ میر عشق ، دال منڈی ، نزد رکاب گنج لکھنؤ

مصادر : حضرت رشید ص ۳۸ ، دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی ص ۱۳۴

نگارشاتِ ادیب ص ۱۴۰ ، تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۷۴

عیش لکھنوی ، منشی ندا علی

وفات : مارچ ۱۸۹۹ء   مدفن : لکھنؤ

ماخذ : معاصر پٹنہ حصہ ۶ ص ۱۲۶

عیشی ، طالب علی خاں

وفات : ۱۲۴۰ھ   مدفن : لکھنؤ

ماخذ : طالب علی خاں عیشی ۔ حیات اور کارنامے ص ۱۰۶ و ص ۱۰۷

فارغ سیتاپوری : سید محمد افضل (شاگرد انیس)

وفات: ۱۹ر صفر ۱۳۱۸ھ / جون ۱۹۰۰ء
مدفن: بلہرہ (ضلع بارہ بنکی)
ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال صـ ۲۹۱

فاطر لکھنوی، شمس العلما سید سبط حسن

وفات: ۲۸ر محرم ۱۳۵۴ھ / ۲ر مئی ۱۹۳۵ء
مدفن: امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ
مصادر: سالک لکھنوی صـ ۲۱۲، تذکرۂ معاصرین ۲ / صـ ۳۶۵

فائز لکھنوی، محمد حسن

وفات: اگست ۱۹۴۶ء   مدفن: احاطۂ مزار انیس لکھنؤ
ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال صـ ۲۹۲

فائق لکھنوی، ظفر حسین عرف بابو صاحب

وفات: ۲۱ر شعبان ۱۳۶۴ھ / اوائل اگست ۱۹۴۵ء
مدفن: احاطۂ مزار انیس، لکھنؤ
ماخذ: باقیاتِ انیس صـ ۱۵۹ عیسوی سالِ وفات ۱۹۴۹ء تصحیح کا طالب ہے

قبول لکھنوی، مرزا مہدی علی خان (شاگردِ ناسخ)

وفات: ۱۲۷۶ھ   مدفن: لکھنؤ
ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال صـ ۳۰۶

قدر بلگرامی، سید غلام حسنین (شاگرد مرزا غالب)

وفات: یکشنبہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۸۴ء / ۲۳ر ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ
مدفن: کربلائے تال کٹورا، لکھنؤ
مصادر: معاصر پٹنہ حصہ ۲ صـ ۱۲۱، تلامذۂ غالب صـ ۳۶۰، انتخاب دیوان قدر بلگرامی صـ ۹، نیا دور لکھنؤ نومبر/دسمبر ۱۹۸۰ء صـ ۱۵۲ حاشیہ ۳۱ (منشی نول کشور نمبر)

قدیر لکھنوی، قدیر احمد خاں

وفات: ۱۰ر اپریل ۱۹۶۹ء   مدفن: لکھنؤ
ماخذ: تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۶ صـ ۲۳۵

قدیم لکھنوی، میر علی نواب

وفات: ۱۹۵۱ء   مدفن: احاطۂ مزار انیس لکھنؤ
ماخذ: تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۱۲ صـ ۲۳۵

قلندر کاکوروی، مولانا شاہ تراب علی

وفات: ۵ر جمادی الاوّل ۱۲۷۵ھ / ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء
مدفن: روضہ شاہ تراب علی قلندر کاکوری
ماخذ: تذکرۂ مشاہیر کاکوری صـ ۷۵ تا صـ ۸۱

کامل لکھنوی، مولوی سید علی میاں

وفات: ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء   مدفن: امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ
مصادر: معیارِ کامل صـ ۱۶، قلزم اعجاز صـ ۲۵۷ میں کامل کا ہجری سنہ وفات "۱۳۲۴ھ" درست نہیں مگر عیسوی سنہ وفات ۱۹۰۴ء درست ہے۔

کوثر خیرآبادی، عابد علی (شاگرد امیر مینائی)

وفات: ۲ر جمادی الاوّل ۱۳۴۰ھ / اوائل جنوری ۱۹۲۲ء
مدفن: خاندانی قبرستان، خیرآباد
ماخذ: دبستانِ امیر مینائی صـ ۳۱۳

کیف لکھنوی، شیخ فضل احمد (شاگرد آتش و صبا لکھنوی)

وفات: شب جمعہ ۱۴ر ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ / ۲۰ر مئی ۱۸۷۵ء
مدفن: باغ مولوی انوار، لکھنؤ
مصادر: تلاش و تحقیق صـ ۴۶۹ تا صـ ۴۷۰، آئینہ ناظرین صـ ۲۲۱

گویا ملیح آبادی، فقیر محمد خاں نواب حسام الدولہ (شاگرد ناسخ)

وفات: ۱۲۶۸ھ   مدفن: مقبرۂ گویا واقع مرزا گنج ملیح آباد
مصادر: گویا۔ صاحبِ سیف و قلم صـ ۱۳۱، انتخابِ بُستان حکمت صـ ۸، جوش شناسی صـ ۱۹۱

لائق لکھنوی، سید محمد ہادی

وفات: یک شنبہ ۱۹ر جمادی الاوّل ۱۳۹۷ھ / ۸ر مئی ۱۹۷۷ء
مدفن: احاطۂ مزارِ انیس لکھنؤ
مصادر: تذکرۂ معاصرین جلد ۴ صـ ۲۵۷، تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۴ صـ ۲۵۶

ماچس لکھنوی، مرزا اقبال حسین (مزاحیہ شاعر)

وفات: ۲۶ر اگست ۱۹۷۰ء
مدفن: کربلائے امین الدولہ امداد حسین خاں لکھنؤ
ماخذ: شیعہ کالج میگزین لکھنؤ ۸۵-۱۹۸۴ء صـ ۹۳

ماہر لکھنوی، سید باسط حسن (برادر خورد سید محمد حسن سالک لکھنوی)

وفات : ۲۴ر اپریل ۱۹۹۳ء   مدفن : امامباڑہ غفران مآب لکھنؤ

ماخذ : ذاتی معلومات

مجاز رُدولوی ، اسرارالحق

وفات : ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء   مدفن : قبرستان نشاط گنج لکھنؤ

ماخذ : اسرارالحق مجاز ــ شخصیت اور شاعری ص۱۲۳ تا ص۱۲۴

مصحفی امروہوی ، غلام ہمدانی

وفات : ۱۲۴۰ھ   (مقام وفات : لکھنؤ)

مدفن : لکھنؤ

مصادر : انتخاب کلام مصحفی ص۵ ، مصحفی ۔ حیات وکلام ص۱۴۰ تا ص۱۴۳

مضطر لکھنوی

(دیکھئے عرفان لکھنوی ، سید بادشاہ حسین رضوی)

معراج لکھنوی ، محمد معراج رسول وارثی

وفات : ۱۹۸۲ء   مدفن : لکھنؤ

ماخذ : تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۲ ص۲۶۴ تا ص۲۶۵

مُعزّز لکھنوی ، مرزا محمد عزیز (برادر بزرگ ماچس لکھنوی)

وفات : سہ شنبہ ۲۳ر نومبر ۱۹۷۶ء

مدفن : کربلائے امین الدولہ امداد حسین خاں لکھنؤ

مصادر : تذکرہ معاصرین جلد ۴ ص۱۷۵ ، تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۲ ص۲۷۴

منظر لکھنوی ، سید جعفر حسین

وفات : اواخر مئی ۱۹۶۵ء

مدفن : مسجد عزاخانہ "سید تقی صاحب" نزد سرکٹا نالا ۔ لکھنؤ

مصادر : تذکرہ ماہ وسال ص۳۶۶ ، تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱ ص۲۹۱

ذاتی معلومات از غضنفر حسین زیدی نبیرہ جعفر حسین منظر لکھنوی

(موصولہ ۸ر نومبر ۱۹۹۳ء)

منظر لکھنوی ، سید منظر حسن (برادر سالک لکھنوی و ماہر لکھنوی)

وفات : ۲۳ر جون ۱۹۷۵ء

مدفن : امامباڑا غفران مآب چوک لکھنؤ

مصادر : تذکرہ معاصرین جلد ۳ ص۲۶۶ ، تذکرہ شعرائے اترپردیش

جلد ۱۵ ص۲۷۷

مؤدّب لکھنوی ، عسکری میرزا (فرزند حیدر میرزا آدب لکھنوی)

وفات : جون ۱۹۵۳ء   مدفن : روضۂ زینبیہ لکھنؤ

مصادر : مہذب اللغات جلد ۱۲ ص۴۸۰ تا ص۴۸۱

تذکرۂ ماہ وسال ص۳۶۸

مونس لکھنوی ، میر نواب (برادر خورد میر انیس)

وفات : ۱۲ر شوال ۱۲۹۲ھ / نومبر ۱۸۷۵ء

مدفن : احاطۂ مزار انیس لکھنؤ

ماخذ : باقیات انیس جلد ۲ ص۱۵۵

مُہذّب لکھنوی ، سید محمد میرزا

وفات : ۴ر نومبر ۱۹۸۵ء   مدفن : روضۂ زینبیہ لکھنؤ

ماخذ : تذکرۂ ماہ وسال ص۳۷۱

میر ، میر محمد تقی

وفات : جمعہ ۲۱ر ستمبر ۱۸۱۰ء / ۲۰ر شعبان ۱۲۲۵ھ

مدفن : قبرستان اکھاڑا بھیم نزد سٹی اسٹیشن لکھنؤ

مصادر : ادبی مقالے ص۵۱ ، حدیث میر ۔ دیباچۂ نیز ص۱۵

میکش لکھنوی ، آغا محمد حیدر (شاگرد بیخود موہانی)

وفات : ۱۷ر جون ۱۹۹۱ء   مدفن : برولی (ضلع بارہ بنکی)

ماخذ : تذکرۂ ماہ وسال ص۳۷۴

ناسخ لکھنوی ، شیخ امام بخش

ولادت : ۷ر محرم ۱۱۸۶ھ / جمعہ ۱۰ر اپریل ۱۷۷۲ء

وفات : پنجشنبہ ۲۴ر جمادی الاول ۱۲۵۴ھ / ۱۶ر اگست ۱۸۳۸ء

مدفن : مکان خود واقع محلہ ٹکسال نزد چوک لکھنؤ

ماخذ : انتخاب غزلیات ناسخ ص۶ تا ص۸ نیز ص۱۵

ناصح : سید ناصرالدین حیدر عرف یوسف میرزا (شاگرد و مکتوب الیہ غالب)

وفات : ۱۳۰۰ھ   مدفن : محلہ نوربا ڑی لکھنؤ

مصادر : تلامذۂ غالب ص۵۰۰ ، خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ ص۸

(خطوط غالب بنام یوسف مرزا) ، اردوئے معلّٰی حصہ اول طبع اول ص۳۲۹ تا ص۳۴۹

ناظر خیامی ۔ سید شریف الحسن

وفات : ۸ر جولائی ۱۹۷۹ء   مدفن : امامباڑا غفران مآب لکھنؤ

ماخذ: تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۷، ص ۳۰۵

ناظرؔ کاکوروی، مشیر احمد علوی

وفات: ۱۷ر جولائی ۱۹۶۹ء   مدفن: قبرستان تکیہ شریف کاکوری

ماخذ: تذکرۂ معاصرین ۲، ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۲

ناوکؔ لکھنوی، اشتیاق حسین

وفات: ۱۸ر جنوری ۱۹۸۴ء   مدفن: کربلائے تال کٹورا لکھنؤ

ماخذ: تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۱ ص ۲۷۷

نسیمؔ دہلوی، اصغر علی خاں

وفات: ۱۴ر رمضان ۱۲۸۲ھ/یکم فروری ۱۸۶۶ء

مدفن: باغ کٹرا خدایار خاں لکھنؤ

مصادر: ادبی مقالے ص ۲۹۶ نسیم دہلوی۔ حیات و شاعری ص ۴۷ میں عیسوی سنہ وفات "۱۸۶۴ء" درست نہیں۔

نفیسؔ لکھنوی، میر خورشید علی (خلف و جانشین میر انیس)

وفات: ۱۳ر ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ/اوائل مارچ ۱۹۰۱ء

مدفن: احاطۂ مزار انیس، کوچۂ میر انیس لکھنؤ

مصادر: انتخاب نفیس ص ۴، قلزم اعجاز ص ۱۹۶

نہالؔ لکھنوی، سید افتخار علی رضوی

وفات: یکم اپریل ۱۹۹۰ء   مدفن کربلائے امداد حسین خاں لکھنؤ

مصادر: قومی آواز لکھنؤ ۲ر اپریل ۱۹۹۰ء، تذکرہ شعرائے اترپردیش جلد ۱۷ (قلمی نسخہ)

نیرؔ سلطان پوری، سید توکل حسین

وفات: ۱۵ر اگست ۱۹۸۵ء   مدفن: سلطان پور

ماخذ: تذکرۂ شعرائے اترپردیش جلد ۱۲ ص ۳۱۱

نیرؔ کاکوروی، الحاج نور الحسن (صاحب نور اللغات، شاگرد امیر مینائی، و محسن کاکوروی)

وفات: ۱۹ر جمادی الآخرہ ۱۳۵۵ھ/ستمبر ۱۹۳۶ء

مدفن: جھنجھری روضہ، کاکوری

مصادر: دبستان امیر مینائی ص ۳۷۷ تا ص ۳۸۰، تذکرہ ماہ و سال ص ۳۹۸

وحیدؔ لکھنوی، سید ہادی

وفات: ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء

مدفن: مقبرہ حکیم میر مہدی، نزد تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ ماہ و سال ص ۴۰۳، باقیات انیس جلد ۱ ص ۱۵۸

وزیرؔ لکھنوی، خواجہ محمد وزیر

وفات: ۲۲ر ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ/ستمبر ۱۸۵۵ء

مدفن: لکھنؤ

مصادر: تذکرۂ ماہ و سال ص ۴۰۴، انتخاب خواجہ وزیر ص ۶ تا ص ۷، لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۱۵، آخری دو ماخذوں میں عیسوی سنہ وفات غلط درج ہوا ہے۔

وسیمؔ خیرآبادی، سید محمد عسکری

وفات: ۲۴ر رمضان ۱۳۴۷ھ/مارچ ۱۹۲۹ء

مدفن: احاطۂ مسجد عسکری میاں، محلہ شیخ سرائے خیرآباد

ماخذ: تذکرۂ ماہ و سال ص ۴۰۶

ہوسؔ لکھنوی، مرزا محمد تقی خاں (شاگرد میر حسن و مصحفی)

وفات: ۲۰ر شوال ۱۲۵۱ھ/۸ر فروری ۱۸۳۶ء سے چند ماہ قبل

مدفن: لکھنؤ

ماخذ: لکھنؤ کے چند نامور شعراء جلد ۱، ص ۹ تا ص ۱۹

یگانہؔ چنگیزی

وفات: ۴ر فروری ۱۹۵۶ء   مدفن: کربلائے منشی فضل حسین خاں لکھنؤ

مصادر: یگانہ: ساحل احمد ص ۱۱، شیعہ کالج میگزین لکھنؤ ۸۵-۱۹۸۴ء ص ۲۳، یگانہ۔ احوال و آثار ص ۲۸ تا ص ۲۹

یلدرمؔ۔ سجاد حیدر

وفات: ۱۲ر اپریل ۱۹۴۳ء   مدفن: قبرستان عیش باغ لکھنؤ

مصادر: انتخاب سجاد حیدر یلدرم ص ۱۹، تذکرۂ ماہ و سال ص ۴۱۸، چند شعرائے اردو۔ تحریر و تصویر کے آئینے میں حصہ ۲ ص ۳۴، سجاد حیدر یلدرم ص ۹۳، نثر نگاران اردو۔ اترپردیش۔ جلد اول ص ۱۵۲ میں سنہ وفات ۱۹۴۲ء غلط درج ہوا ہے۔

یونسؔ زیدپوری، یونس حسین (شاگرد مرزا جعفر اوج)

وفات: ۱۱ر اپریل ۱۹۵۸ء

مدفن : کربلائے ملکہ جہاں عیش باغ، لکھنؤ

ماخذ : تذکرۂ شعرائے اتر پردیش جلد ۶ صـ۲۳۳ تا صـ۲۳۴

استدراک

مقالہ مکمل ہونے کے بعد آج ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ء کو اپنے دیرینہ رفیق شوکت عمر کی وفات کی خبر ملی۔ یہاں بصد افسوس ان کے نام کا اضافہ کر رہا ہوں — کاظم علی خاں

شوکت عمر

وفات : ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ء (بلرام پور اسپتال لکھنؤ)

تدفین : قبرستان اجریاؤں، نزد گومتی نگر لکھنؤ

ماخذ : ذاتی معلومات و قومی آواز لکھنؤ سہ شنبہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۲ء صـ۱ نیز صـ۵

□□

حواشی :

۱؎ تفصیل کے لئے درج ذیل مصادر ملاحظہ ہوں :

(۱) تواریخ نادر العصر، منشی نول کشور، نئی دہلی طبع ۱۹۹۰ء صـ۵۷ تا صـ۵۸ نیز صـ۹۲

(۲) انگریزی کتاب "ہسٹری آف ماڈرن انڈیا" اے۔ ایل۔ سریواستوا آگرہ، طبع ۱۹۶۹ء صـ۹۰ تا صـ۹۱

(۳) انگریزی کتاب "اودھ انڈر واجد علی شاہ" جی۔ ڈی۔ بھٹناگر۔ بنارس طبع ۱۹۶۸ء حاشیہ نمبر۳

۲؎ تواریخ نادر العصر، منشی نول کشور پریس لکھنؤ طبع اول مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے ابتدائی صفحات میں شامل اودھ کا نقشہ ملاحظہ کیا جائے (بحوالہ طبع ۱۹۹۰ء)

۳؎ دیوان غالب۔ مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء صـ۵۳

۴؎ "دلیں" مقالہ نگار کا تصرف ہے۔ اصل ماخذ میں "دلیں" کی جگہ "ملک" ملتا ہے۔

۵؎ تذکرۂ گلشن سخن : مصنفہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی، مرتبہ : سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع ۱۹۶۵ء صـ۱۶۳

۶؎ کلیات شیخ امام بخش ناسخ، مطبع محمدی لکھنؤ۔ طبع اول مطبوعہ

۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ (مطابق دوشنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء) صـ۴۳

(بہ شکریہ استاد محترم پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ)

□□

اودھی و پارسی

صـ۷۹ کا بقیہ

सौ सौ मन कै बरसंहि गोला।
बरसँहि तुपुक, तरि जस ओला।।
लौहैं सैन सूझ सब कारी।
तिल एक कतहँ न सूझ उधारी।।
बाजीहँ खरग उठै दर आगी।
मुइं जरि चहै सरग कँह लागी।।

اسی طرح جائسی اور نظامی یعنی اودھی اور پارسی کی متوازیت کے اور بھی کئی پہلو ہیں، مگر طوالت کے پیش نظر اتنے ہی پر اکتفا کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔

□□

لکھنؤ کے چند اخبار

صـ۸۲ کا بقیہ

انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریروں میں زبان کی چاشنی اور شعری نثر کی شان ہوتی تھی۔ اپنے منفرد اسلوب کی تحریروں کی وجہ سے عزائم بھی بہت مقبول ہوا۔ روزنامہ ہونے کے بعد جمیل مہدی کے اداریے اس میں خاصے کی چیز ہوتے تھے۔

"ندائے ملت" اور "عزائم" طے شدہ مقاصد کو سامنے رکھ کر نکالے گئے تھے اور انھوں نے اپنے مقاصد کی کامیاب تکمیل کی۔ ان کی اثر انگیزی، شہرت اور وقار نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اردو میں معیاری اور سنجیدہ صحافت کی بڑی گنجائش ہے اور ایسی صحافت کے قدر دانوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی نے فکر، منطقی تجزیے اور مربوط نثر کو اور جمیل مہدی نے رنگین و سیال انشا پردازی کی اس روایت کو آگے بڑھایا جو اردو صحافت میں ابتدا سے دو الگ الگ دھاروں کی طرح نظر آتی ہے لیکن صحافت کو نثر سے یا ادب سے وابستہ کرنے کے لیے یہ دونوں دھارے اہم ہیں۔ لکھنؤ میں صحافت ان دونوں دھاروں کی ہمیشہ ترجمان رہی ہے۔

□□

مرزا کوکب قدر
"تاج اکبر"، سیول لائنس
علی گڑھ

اودھ کا آخری تاجدار

واجد علی شاہ کو بر بنائے عقیدت ہی اودھ کا آخری تاجدار لکھا جاتا ہے اور یہ بھی اسی عقیدت کا کرشمہ ہے کہ ذمہ دار اہل قلم نواب آصف الدولہ کی مقبولیت کو بھی نہیں بھولے۔ ان کی مملکت کے ساتھ ان کا لقب "نواب" بھی واجد علی شاہ کو تفویض ہوا اور اس نکتے پر مطلق غور نہیں کیا گیا کہ اگر مرزا محمد واجد شاہ نواب تھے تو شاہ لکھنے کے کیا معنیٰ؟ اور اگر شاہ تھے تو نواب لکھنے سے کیا حاصل؟ ہمیں ایسے عقیدت شعار افراد سے قطعی کوئی تعرض نہیں لیکن جب ایسے افراد کے نزدیک یہ غلط نہیں کہ "نواب واجد علی شاہ" اودھ کے آخری تاجدار تھے تو مولوی نجم الغنی خاں رامپوری کے اس بیان کو تسلیم کر لینے میں کیا عذر کہ اودھ والوں میں سے نہ کسی کی نکسیر پھوٹی نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری، اور ملک آبائی چپ چپاتے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ واجد علی شاہ کو اودھ کا آخری تاجدار کہنا درحقیقت تاریخ کے صحیح تناظر سے چشم پوشی کرنا اور طنز و تعریض کے ایسے پہلو فراہم کرنا ہے کہ تہوّر اور مردانگی کے شیدائی شرم سے آب آب ہو جائیں۔ نجم الغنی خاں نے اپنا بیان اس خفت کو مٹانے کے لیے انشاد کیا تھا جو شجاع الدولہ کے روہیل کھنڈ فتح کر لینے پر روہیلہ پٹھانوں کے حصے میں آئی تھی۔ روہیل کھنڈ کے معرکے (۱۱۸۸ھ) میں صرف حافظ رحمت خاں نے اپنے چند فدائیوں کے ساتھ آگ اگلتی توپ کے سامنے اپنے آپ کو یہ سمجھ کر ڈال دیا تھا کہ جب عزت سے جینا دشوار ہو تو بہادروں کی طرح جان دے دینا آسان ہے۔ روہیلہ تذکرہ نگار اپنے طنز سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ شجاع الدولہ کے اخلاف میں کوئی حافظ رحمت خاں بھی نہ تھا جو جان پر کھیل جاتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ ۵۷ء کے معرکوں میں اودھ کے چپے چپے پر سورج بنسی راجپوتوں کی اولاد اور سلاطین اودھ کے موروثی جاں نثاروں نے شجاعت کی اسی روایت کو پروان چڑھایا اور اودھ کی لفظی وجہ تسمیہ "اجودھ" "غیر مفتوح"

کوئی آبرو بخشی۔ واجد علی شاہ کے فرزند برجیس قدر کی ذات وجیہات میں مذکورہ بالا دونوں بیانوں کی تردید موجود ہے اور یہ مقالہ اسی لیے سپردِ قلم ہے کہ جو شبہات اس سلسلے میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کا انسداد ہو جائے۔

برجیس قدر کی تاجپوشی اور تاجداری حقیقت تھی یا افسانہ اس کی چھان بین کے لیے تاریخی شواہد کا لحاظ اور آئین سیاست سے استنباط ضروری ہے کیونکہ یہی وہ کسوٹی ہے جو بے بنیاد اور بے ثبات دعووں اور ٹھوس حقیقتوں میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔

آئین سیاست کا پہلا اصول اس امر کی تحقیق ہے کہ مدعی جس حق کا طلب گار ہے وہ اس تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ انگریز اس نکتے سے بخوبی واقف تھے اور شاہان اودھ اور سلاطین مغلیہ کی اولاد میں ایسے بزرگ افراد کو جو مدعی بنائے جا سکتے تھے پہلے ہی بیلی گارد میں محصور کر لیا تھا۔ انھیں اس کا قطعی اندازہ نہ تھا کہ جس رزم آرائی سے واجد علی شاہ کے مختلف البطن بھائی دارا سطوت یہ کہہ کر منھ پھیر لیں گے کہ جب شجاع الدولہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو مجھ سے کیا ہوگا۔ اسی جرأت آزما منصب کو ایک فرض شناس شہزادہ اپنی وطن پرست مستقل مزاج ماں کی سرپرستی میں برضا و رغبت قبول کرے گا اور اپنی تمام زندگی اسی جد و جہد کی نذر کر دے گا ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کارخانۂ قدرت میں ایسے بلند اقبال افراد کی نشاندہی دنیا میں قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ برجیس قدر پیدا ہوئے تو توپوں کی سلامی نے ساکنان اودھ کو خبردار کیا اور ختنہ کی تقریب پر نذرانے کے اٹھارہ لاکھ روپئے انھیں باشندگان اودھ کا پہلا خراج عقیدت تھا جو اس شہزادے کے حصے میں آیا۔ یہ شہنائیاں

یہ چراغاں اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا کیونکہ جو بچے برجیس قدر سے پہلے پیدا ہوئے وہ اس زمانے کی یادگار تھے جب مرزا محمد واجد علی ولی عہد نہ تھے اور جب ولی عہد کے محل میں چراغ روشن ہوا تو خود دادا نے نام تجویز کیا۔ باپ نے ذکر کیا تو صرف اسی نومولود کے نام کے ساتھ منصب کی نشان دہی تاج بنا کے کی۔ لکھنؤ کے خاص و عام اپنے اس ہونے والے تاجدار سے ناواقف نہ تھے۔ واقعی تاج پوشی سے چھ مہینے پہلے:۔

"جس وقت شہزادے کی سواری نکلی تھی شہر کی خلقت دیکھنے بیچاری نکلی تھی۔ جو گھر سے باہر آیا جس کو سواری کا اہتمام نظر آیا رنج و الم دور ہوا بے ساختہ ہر لب سے یہ مذکور ہوا: "اے پروردگار عالم و چارہ ساز بیچارگاں، حاکموں کے حاکم، اس در دولت ابد مدت کو قیام قیامت تک برقرار رکھنا"، ہر چند اس روز کچھ سامان سواری کا نہ تھا، وہ معدودے چند جو در دولت پر مقیم ہیں وہی ہمراہ تھے اور خلف ظل اللہ تھے لیکن عجیب شان و شوکت تھی۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی"

آنے والے چند مہینوں میں برجیس قدر نے وہ سب کچھ دیکھا اور سنا ہوگا جس نے ساکنان اودھ کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا اور اگر برجیس قدر کے بزرگوں کی تدبر آمیز بے حسی حیرت افزا تھی تو برجیس قدر کے سرفروشانہ اقدام پر حیرت کیسی؟ انگریز ناعاقبت اندیش تھے جنھوں نے واجد علی شاہ کی کھلے عام نیابت کرنے والے کو بیلی گارد میں محصور نہیں کیا اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس دفعہ بھی وہی نسخہ اپنایا جو اس سے پہلے وزیر علی خاں اور مرزا فریدوں بخت (مناجان) کے موقعے پر آزما چکے تھے۔ یعنی برجیس قدر واجد علی شاہ کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ ہمیں اس کا مسکت جواب بھی اخبار ٹائمس (لندن) کے نامہ نگار سر ڈبلیو ایچ رسل کی معرفت مہیا ہے:۔

"ہمیں اسے (برجیس قدر کو) بادشاہ کا بیٹا تسلیم کرنے میں تکلف محسوس ہوتا ہے لیکن اودھ کے وہ تعلقہ دار اور سرداران کو اس حقیقت کا بہتر علم ہونا چاہئے اس پر کوئی شبہ نہیں کرتے اور اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے پر ہمہ وقت تیار ہیں"

آئین سیاست کا دوسرا اصول اس واقعے کا تعین ہے جس سے مختلف نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ برجیس قدر عوام کے منتخب حکمراں تھے۔ اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں۔ اختلاف اگر ممکن ہے تو اس میں کہ وہ صوبے دار تھے مثل برہان الملک کے یا نواب وزیر مثل صفدر جنگ کے۔ یا بادشاہ مثل غازی الدین حیدر کے۔ یا کسی ایسی حیثیت کے جوان سب سے الگ ہو۔ جواب کے لیے حاکم و محکوم کے درمیان معاہدۂ اہل خرد کی تشفی کا سبب بن سکتا ہے ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو فوجی افسروں کے نمائندے شہاب الدین اور برکات احمد نے مندیل شاہی مرزا برجیس قدر کے سر پر رکھی اور یہ طے پایا کہ اس کی اطلاع بادشاہ دلی کو دی جائے۔ عرض داشت لکھی گئی تو جواب بھی مرحمت ہوا:۔

"فرزند ارجمند مرزا برجیس قدر بہادر، شاہ اودھ، آفریں ہو کہ چھوٹے سے سن میں تم نے بڑا کام کیا۔ آئندہ سے تمہارے واسطے مہر خطاب بھی بھیجی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ جو ملک قدیم تمہارا تھا اس سے زیادہ عطا ہوگا۔

اس دستاویز کے دو فقرے خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ بہادر شاہ کا برجیس قدر کو فرزند ارجمند لکھنا نہ صرف ان کی بزرگانہ شفقت کا ترجمان ہے بلکہ اس سے سو سال پہلے کے سمدھیانہ تعلقات کی یاد تازہ ہوتی ہے جب محمد شاہ نے اپنی بیٹی امتہ الزہرا (بہو بیگم صاحبہ) کو وزیر الممالک صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ سے منسوب کیا اور ایسی یک جہتی کی داغ بیل ڈالی جو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت غازی الدین حیدر کی شاہی کے اعلان سے ختم ہوگئی۔ بہادر شاہ نے انھیں دیرینہ تعلقات کی تجدید کرتے ہوئے نہ صرف اپنے قلم سے برجیس قدر کو شاہ اودھ لکھا بلکہ سفیر کو سفیر الدولہ خطاب عطا کیا اور فرمایا میں نے تاج بخشی کی۔ اس توثیق کے بعد برجیس قدر کی تاجپوشی میں اگر کوئی کسر باقی تھی تو خاندان اجتہاد کے رکن اعظم سلطان العلما کے تاج پہنانے سے وہ بھی دور ہوگئی۔ ۶ر اگست ۱۸۵۷ء کو آداب شاہی کا لحاظ رکھتے ہوئے شاہی کا اعلان ایک ایسی دستاویز تھی جس پر واجب التعظیم مذہبی پیشوا اور ہر دلعزیز قومی رہبر دونوں کی مہریں ثبت تھیں اور یہ تاج وہ تاج تھا جو اس سے پہلے اودھ کے کسی فرمانروا نے نہیں پہنا تھا۔

۵ر جولائی کو مسند نشینی اور ۶ر اگست کو تاج پوشی؛ بادی النظر میں یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اتنی عجیب بھی نہیں اگر یہ ملحوظ رکھا

جائے کہ ہندوستان ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا۔ اور اس نے ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنی جمہوریت کا اعلان کیا۔ ۵ جولائی درحقیقت برجیس قدر اور عوام کے درمیان عہد و میثاق کی تاریخ ہے اور ۶؍اگست ۵۷ء ایک مخصوص طرز حکومت اختیار کرلینے کی تاریخ۔[۳۹] فرمانروایان اودھ کو تاریخ کی کتابوں میں مختلف عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے اور کوئی ایک حیثیت دوسرے پر صادق نہیں آتی۔ نوابین اودھ کہا جائے تو سلاطین اس زمرے سے خارج اور سلاطین اودھ کہا جائے تو جو نواب وزیر تھے ان کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی اور بانی خاندان برہان الملک نہ نواب تھے نہ سلطان صرف صوبے دار تھے جس کے بعد صوبے داری کا خاندان میں باقی رہنا ضروری نہ تھا لیکن ان کا ذکر تمام شجروں میں متوازی ہے۔ ایسی حالت میں اس خاندان کے آخری فرد کو جو پہلے فرد کی طرح امتیازی حیثیت کا حامل ہے ایسے لقب سے یاد کرنا جو اس کے بزرگوں کی میراث رہا ہے ایک تسلیم شدہ روایت کا اتباع ہے۔ برہان الملک نواب کہے جاتے ہیں تو اس لیے کہ ان کے اخلاف نواب تھے۔ برجیس قدر بادشاہ لکھے جاتے ہیں تو اس لیے کہ ان کے اسلاف بادشاہ تھے۔[۴۰]

آئین سیاست کا تیسرا اصول ان متعلقات کی تدقیق اور تنقیح ہے۔ جن سے کسی عمل کی تشکیل مکمل ہوتی ہے۔ کاروبار سلطنت کے ذیل میں اگر کوئی طاقت و گروہ کسی حق دار کو حاکم بنادے اور اس کو تاج پہنادے تو اس کی حکومت اس وقت تک قرین اعتبار نہ ہوگی جب تک بیرونی طاقتوں سے اس کے تعلقات استوار نہ ہوں اور اندرون ملک اس کے احکام کی تعمیل نہ ہو۔

سرکار برجیس کی رتبہ شناسی وہ تمام طاقتیں تھیں جن کا اس وقت دور دورہ تھا اور سوائے انگریزوں کے کوئی ایک ایسا نہ تھا جو اس خودمختاری کا معترف نہ ہو۔ مغلیہ تاجدار بہادر شاہ نے سفارت قبول کرکے مہر خطاب سے نوازا۔ پیشواؤں کے رہبر نانا راؤ نے پہلے وکیل بھیجا پھر خود تشریف لائے ۷، ارپارچہ خلعت ملا، قبول کیا۔ فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان جنرل بخت خاں روہیلہ، شفیع اللہ خاں رئیس نجیب آباد، ولی داد خاں رئیس بالاگڑھ، مظہر علی خاں رئیس موانہ، عنایت اللہ خاں رئیس پیلی بھیت، غلام قادر خاں رئیس شاہ جہاں پور، بالاراؤ پیشوا، تانتیا توپی اپنے اپنے علاقوں کے رئیس و حاکم یہ وہ افراد تھے جو توسل کے خواستگار بنے اور حسب مراتب سرکار برجیسی نے سب کا خیال کیا۔ انگریزوں کا برجیس قدر کو حکمراں تسلیم نہ کرنا اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اودھ کی خودمختاری خود ان کے مفادات پر ضرب کاری تھی اور یہ فعل بعینہ ایسا تھا جیسے پاکستان کا شروع میں بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنا۔ مصالحت کی صورت میں انگریز آمادہ تھے کہ برجیس قدر کو بھی وہی پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جائے جو واجد علی شاہ کو پیش کیا گیا تھا اور یہ گویا معاندانہ اقرار تھا اس شاہی کا جسے دوستانہ قبول کرلینا ان کیلیے محال تھا۔ اندرون ملک قطع نظر اس خلفشار کے جس کا زمانہ کارزار میں پایا جانا قدرتی ہے۔ کوئی ایک فرد ایسا نہ تھا جو سرتابی کی جرأت رکھتا ہو۔ زرتحصیل اظہار ہوتا ہے۔ عوام کی اطاعت اور خیرسگالی کا:-

"تعلق داروں نے بے طلب زرتحصیل بھیجنا شروع کردیا۔
ایسی صورت بے منت کسی تسلط سلطنت میں نہ ہوئی تھی۔
اس زرتحصیل کی عدم رسی پر کیا کیا لڑائی اکثر ضلعے میں رہا
کرتی تھی۔"

فوجوں کو استقرار سلطنت سے وہی نسبت ہے جو ریڑھ کی ہڈی کو انسان کے جسم سے:-

"بعض راجہ اپنی فوج کو لے کر لکھنؤ آئے، اپنے پاس سے
خوراک دیتے تھے، بعض کو سرکار سے بھی ملتی تھی اور یہ سب
فوج ممالک محروسہ زمین دار، تعلق دار راجہ کی ایک لاکھ
پچاس ہزار پانچ سے تھی۔

سکہ علامت ہے اختیارات کی وسعت کا ؎

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر
نیر دین مرزا برجیس قدر[۴۱]

شعراء کے قصیدے عوام کے جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں برجیس قدر کے جرأت آزما اقدام پر محمد جان شاذ پیرو میر کے قصیدے کا مطلع ہے۔

ہوئی جو مریم پیماں شکن کو خواہش زر
اودھ کے شاہ کا عیسائیوں نے موسا گھر[۴۲]

حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر کی شاہی جو ۵ جولائی ۵۷ء سے ۱۶؍مارچ ۵۸ء تک خاص لکھنؤ میں جملہ لوازم شہریاری کے ساتھ اور پا ہونے کے بیس ماہ بعد تک اضلاع اودھ میں بصورت کشمکش باقی رہی اس قابل نہ تھی کہ اسے نظر انداز کردیا جاتا اور اگر ایسا ہوا تو اس کا سبب حکومت برطانیہ کی

خوشنودی تھا جو ۱۹۴۷ء تک باقی رہی۔ برجیس قدر جیسی تاریخ ساز ہستیاں صفحۂ عالم پر بار بار نہیں ابھرتیں اور جب ابھرتی ہیں تو ان کے پیچھے نارش روزگار افراد کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں کو قلق تھا کہ جب اودھ کا الحاق ہوا تو کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹی۔ کوئی مؤرخ بتا سکتا ہو تو بتا دے کہ جب اودھ فتح ہوا تو ملک کے طول و عرض میں مقتولین کی تعداد کیا ان افراد کی مجموعی تعداد سے کم تھی جو برہان الملک سے واجد علی شاہ تک استحکام سلطنت میں کام آئے ؟ مرنے والوں کی تعداد کا تعین دشوار ہو تو ان جیالوں کی تلاش کر لینا کیا دشوار جو خون کے دریا میں بھی رہنما میناروں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ برجیس قدر کے فدائیوں میں شاہ آباد کے ایک مولوی محمد صاحب معرکۂ سندیلہ پر یہ طے کر کے گئے تھے کہ

"یا فتح کرونگا یا مارا جاؤنگا۔ چنانچہ اس معرکے سے منہ نہ پھیرا، پانچ ہزار مرنے والے سرفروش ساتھ تھے۔ داد مردانگی دے کر خوب لڑ بھڑ کر نام کر گئے۔"

ہردوئی کے راجہ کنور سنگھ نے انگریزی فوجوں کے نرغے میں آنے کے بعد اپنی فوج کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دیں لیکن بجائے خود ہتھیار حوالے کرنے کے انگریز کمانڈر کو جواب دیا:۔

"یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے اور انھیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں خود برجیس قدر کے ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں"۔

اور تن تنہا شمشیر بکف گولیوں کی باڑھ میں آناً فاناً مارا گیا۔

شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ نے اپنا قلعہ بغیر مزاحمت جنرل ہوپ گرانٹ کے حوالے کیا تو وہ سمجھے مصالحت پر آمادہ ہے۔ رانا نے جواب دیا۔

"میں اپنے قلعے کی مدافعت سے معذور تھا۔ آپ کے حوالے کر دیا لیکن میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے"۔

نیپال کی ترائی میں سرگباشی رانا نے اپنے ناموس کو حضرت محل کی سرپرستی میں دیدیا اور اپنا مال و متاع اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھ کر اجازت دی کہ جس کا جو جی چاہے لے اور چلا جائے اور مردانہ وار مرنے کی آرزو رکھتا ہو ساتھ آئے:۔

"ڈھائی سو جوانوں میں سے صرف دو نے راہ فرار اختیار کی۔ باقی سب رانا کے ساتھ اسی گھاٹی میں جان پر کھیل گیے۔"

حیات مستعار کے چند روز جو رانا نے اپنی عورتوں کو بخش دئے وہ بھی اسی دل لگاؤ کا مظہر ہیں جو رانا کو اپنے جوان سال بادشاہ اور راج ماتا سے رہی ہوگی۔ ورنہ غیرت دار راجپوتوں کی رسم سے کون واقف نہیں کہ جب وہ مرنے پر کمر باندھتے ہیں تو ان کی عورتیں ان سے پہلے جوہر ہوتی ہیں۔ رانا جانتا تھا۔ اور خوب جانتا تھا کہ جن کی سرپرستی میں چھوڑ رہا ہے وہ وہ ہیں جنھوں نے راجہ مان سنگھ کو اپنی فرزندی میں لیا اور ملبوس خاص انعام دیا تھا۔ اگر کوئی آنچ آئی تو ان پر پہلے آئے گی۔ پھر کوئی راجپوت عورتوں کا بال بیکا کر سکے گا۔

سرفروشی اور حب الوطنی کی ایسی درخشاں مثالیں۔ یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے یہ انمول رتن اپنی نسل کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونۂ عمل۔ یہ انھیں مجاہدوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صرف گیارہ دن کے اندر انگریزی عملداری کے سارے تانے بانے توڑ کر اودھ انگریزوں کے شکنجے سے آزاد ہوگیا۔ اور اگر انھیں شکست نصیب ہوئی تو اس سے ان کی پامردی پر حرف نہیں آتا کیونکہ جس فوج نے ان پر یورش کی تعداد اور اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج کبھی صف آرا نہیں کی تھی۔ ایسی عظیم فوج کی لشکر کشی پر شاہی فوجیں فوراً سپر ڈال دیتیں جب بھی تعجب نہ ہوتا لیکن:۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملے کا رخ چولکھی کی جانب ہے حضرت محل کسی طرح چولکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

حملہ آوروں کا بیان ہے کہ:۔

"ایک ایک انچ زمین پر سخت لڑائی ہوئی اور اہم مقامات بیگم کوٹھی، سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ وغیرہ پر سپاہیوں کی لاشوں پر سے گذر کر قبضہ ہو سکا"۔

سکندر باغ کے ایک مقام پر زخمیوں اور مقتولین کا:

"یہ بھیانک ڈھیر تقریباً ایک گز یا اس سے بھی کچھ زیادہ اونچا تھا"۔

انگریز سپہ سالار کولن کیمپبل کے الفاظ میں :

"اس سے زیادہ بہادری کبھی نہیں دیکھی گئی"

خوش نصیب اس آخری تاجدار کے جس پر نچھاور ہونے والے وفاداری اور جوانمردی کے ایسے نقش یادگار چھوڑ گیے جو خفتہ صلاحیتوں کو بیدار اور مردہ دلوں کو آمادۂ پیکار کرتے رہیں گے۔ ان جیالوں کی آرزو تو یہ تھی کہ بیلی گارد کی گڑھی جو اودھ کی پاکدامنی پر ایک کلنک کا داغ بنی ہوئی تھی اس کو زمین کے برابر کر کے وہاں تالاب بنائیں اور برجیس گڑھ اس کا نام رکھیں۔ ان کی یہ حسرت تو پوری نہ ہوئی لیکن لارڈ کیننگ کا یہ قول انھیں کا طرۂ افتخار بنا کہ دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت سے ہی دوچار تھی

خون میں ڈوبی ہوئی کہہ رہی ہے بیلی گارد کی زمین
ملک میں پہلے ہوئی تنظیم آزادی یہیں — فضل

عہد برجیس کی تاریخ پر پانی پھیرنے کی خاطر لوگ طرح طرح کی موشگافیاں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک برجیس قدر خورد سال تھے۔ ان کو زبردستی تخت پر بٹھایا گیا۔ ان کو اعتراض ہے کہ وہ حکومت چند روزہ تھی۔ ان کو فخر ہے کہ انگریزوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کو فکر ہے کہ اگر اس حکومت کو تسلیم کر لیا جائے تو واجد علی شاہ کی معزولی سے برجیس قدر کی تخت نشینی تک ایک خلا رہا جاتا ہے۔ ان سادہ لوح معترضین کے اطمینان کی خاطر ان تمام ایرادات کا جواب اسی اودھ کی تاریخ میں موجود ہے۔ فریدوں بخت عرف مناجان کو جب بادشاہ بیگم نے زبردستی تخت نشیں کیا تو وہ بھی نابالغ تھے اور ان کو بھی انگریزوں نے تسلیم نہیں کیا اور ان کی شاہی کی مدت چند ساعت سے زیادہ نہ تھی لیکن اودھ کے سرکاری کاغذات میں ان کا نام اپنے باپ کے پانام ہے۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ ہزیمت خوردہ اودھ سے دوبار اسی طرح بے سر و سامان رخصت ہوئے جیسے ہمایوں عہد شیر شاہ سوری میں ہندوستان سے لیکن ان دونوں ریاستوں کی تقویم میں اجمالی بیان کے موقعے پر اس خلا کی نشاندہی نہیں کی جاتی۔

توتی خامن، یازدہ سالہ فرعون مصر، سے سرزمین ہند کی چھوٹی بڑی لاتعداد ریاستوں کے نابالغ حکمرانوں تک ہندوستانی مورخین کا طریق کار تاریخ نویسی کے اصولوں سے کچھ بھی مختلف نہیں اور اگر اتباع کے لیے تاریخ انگلستان ہی سند ہے تو ایڈورڈ پنجم گیارہ برس کی عمر میں تخت نشیں ہوا اور صرف گیارہ ہفتے اپنے چچا کے حراست میں بسر کر کے پر اسرار حالات میں ہلاک ہوا۔ ایڈورڈ ہشتم نو برس کا تھا جب تخت و تاج کا وارث بنا اور پندرہواں سال بھی ختم نہیں ہوا تھا جو موت نے سایہ ڈالا۔ دم مرگ اپنی عزیز لیڈی جین گرے کو اپنا جانشین نامزد کیا لیکن یہ حکومت دس دن سے زیادہ آگے نہ بڑھی مستند کتب تواریخ میں یہ تینوں افراد بہت ساری بے ضابطگیوں کے باوجود اسی انگریز قوم کے حکمراں درج ہیں جو ہندوستان میں یہ حق ہندوستانیوں سے چھین لینے کے لیے برسر پیکار رہی اور ہم آج بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے اس پرچم کو فراموش کرنے کے لیے آمادہ ہیں جس کو سربلند رکھتے ہوئے ہمارے اسلاف نے انگریزی سامراج کا مقابلہ کیا اور اپنا سب کچھ تج دیا۔

خورد سالی اور زبردستی تخت پر بیٹھا دینا! یہ باتیں اس لیے بھی کچھ اور تشریح کی محتاج ہیں کہ ممتاز محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے تخت نشینی کے وقت برجیس قدر کی عمر دس برس بتائی ہے اور اسے خود واجد علی شاہ کی "سلطنت کا سلسلہ" بیان کیا ہے۔ سلسلے کے بارے میں کچھ کہنا ایک طویل بحث کو دعوت دینا ہے لیکن عمر کا فیصلہ خود واجد علی شاہ کے تین بیانات سے دو جملوں میں ہو جاتا ہے۔ مرحوم ان تینوں بیانات اور ان کے سنہ تصنیف سے بخوبی واقف تھے۔

ہوئے شاد جنت کا مکاں سن کے حال۔ الخ — مثنوی عشق نامہ
تیرہ چودہ برس کا ہے خوش تر — مثنوی بحر مختلف
وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں — مثنوی حزن اختری

"نواب رمضان علی" برجیس قدر کا تاریخی نام (۱۲۶۰ھ) ہے۔ رمضان ۵۹ = ۱۰۹۱ ۱۱۰ =

۱۲۷۳ھ میں سن تیرہ برس ہو یا دس؟ اور جب ۱۲، ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو تخت نشیں ہوئے تو سن چودہ برس ہوا یا کچھ اور؟ برجیس قدر کے سن کے تعین کا ایک دوسرا راستہ وہ خطابی نام "مرزا برجیس قدر بہادر" ہے جو امجد علی شاہ نے عطا کیا تھا اور جس کا ذکر واجد علی شاہ نے عشق نامہ میں کیا۔ اور اس پورے نام "برجیس قدر مرزا محمد رمضان علی" ۱۲۶۰ھ کا ہے نقشی یشب مع انگشتری کے خاندان میں آج بھی موجود ہے۔

سن کی بابت ایسی واضح شہادت کے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سن کیا تھا۔ رہا یہ امر کہ ایسا کم عمر شہزادہ ایسے پرآشوب زمانے میں حکمراں بنایا بھی جاسکتا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ اسی مجلس شوری نے غور وخوض کے بعد کیا جسے حضرت محل کے ایما پر اسی مقصد کے لیے طلب کیا گیا تھا۔

"افسروں نے باتیں شروع کیں، کوئی کہتا تھا لڑکا بہت چھوٹا ہے۔ کوئی کہتا تھا خوبصورت ہے۔ اس سے کام کیا ہوگا۔ کوئی آواز کرنے لگا کہ تم عیش وعشرت سے محو ہوکر غافل نہ ہوجانا ہم تم کو سلطنت دیتے ہیں"

شہنشاہ اکبر کی عمر بھی تخت نشینی کے وقت تقریباً چودہ برس تھی۔ ہاتھی پر فوج کا معائنہ کرتے

"سپہ سالار بیرم خاں ان کے پشت پناہ تھے"

برجیس قدر اتنے بے دست و پا بھی نہ تھے کہ محل سے باہر قدم نہ نکالیں۔

"ایک دن سب افسروں اور تلنگوں کو بلوایا۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ ۲۱ توپ سلامی کی چلی۔ آہستہ آہستہ سمجھانے لگے کہ اے بہادرو! ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ خوب لڑتے ہو۔ مگر ہمیں ایک بات کا رنج ہے کہ تم شہر کو لوٹ رہے ہو اسے موقوف کردو ورنہ سب رعایا بد دعا کرے گی۔ افسروں نے دست بستہ عرض کی جناب عالی اب شہر نہ لٹے گا"

واجد علی شاہ نے اس واقعے سے چند ماہ پہلے اپنے اسی کم سن شہزادے کو اپنی نیابت تفویض کی تھی:

"۱۳، ربیع الآخر ۱۲۷۳ھ جمعہ کے دن صبح دم صاحب عالم مرزا برجیس قدر بہادر حسب الحکم حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ جناب محمد العصر کے مکان پر تشریف فرما ہوئے۔ رسم تعزیت بآئین شائستہ ادا کی۔ ورثا جناب میرن صاحب کی دل جوئی فرمائی۔ خلعت عطا ہوئی"

رزم وبزم دونوں موقعوں پر اپنے اور غیر سب کی نظریں اسی خورد سال شہزادے کو تلاش کرتی رہیں اور یہ موقعے وہ تھے جب بادشاہ کے پھوپھا چچا، بھائی، بیٹے بھتیجے سب موجود تھے۔

نپولین نے اپنی شہرت اور عظمت کو اپنی ماں کا رہین منت بنایا تھا۔ برجیس قدر اپنی ماں کے نپولین سے کہیں زیادہ رہین منت تھے۔ جو پندرہویں صدی کے فرانس کی جون آف آرک کی طرح انگریزوں کے تسلط کو للکارتی اور پژمردہ دلوں کو گرماتی مثل شہاب ثاقب کے پردۂ گمنامی سے نمودار ہوئی اور اودھ کے طول وعرض میں آزادی کی روح پھونک گئی۔ گرڈیٹے کی سترہ سالہ لڑکی جون آف آرک کو انگریزوں نے ڈائن قرار دیتے ہوئے زندہ جلادیا تھا حضرت محل انکے بس میں آجاتیں تو وہ بھی شاید دیوار میں چن دی جاتیں لیکن جب ایسا ممکن نہ ہوا تو کردار کشی کی خاطر ایسی من گھڑت باتوں کو رواج دیا گیا کہ لوگ ایسی بدکار عورت کو راج ماتا، حضور عالیہ اور ملکۂ اودھ کہتے ہوئے شرم محسوس کریں۔ برٹش انٹلی جنس کی رپورٹ میں کہ حضرت محل کون تھیں، کیا تھیں ان کا گھر کہاں تھا، اصلی نام کیا تھا؟ آج بھی صیغۂ راز میں ہیں۔ وہ تصویر جسے آزاد ہندوستان کی حکومت نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ سرکاری مطبوعات اور ڈاک کے ٹکٹ پر شایع کیا اس کے بارے میں بھی شک کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ واقعی حضرت محل کی تصویر ہے کیونکہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے وہی معشوق ہے جو خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد رکھتا ہے۔

ہم حضرت محل کے اولین قرین اعتبار تعارف کے واجد علی کو ہی زحمت دیتے ہیں کہ حضرت محل نے اپنے شباب کے تقریباً ۱۰ سال اسی تلون مزاج تاجدار کی شریک حیات کی حیثیت سے بسر کرکے اپنی رفاقت کا ایسا نقش یادگار چھوڑا کہ بادشاہ مدت العمر فراموش نہ کرسکے۔ تخت نشینی کے حضرت محل کا شمار خاص محل کے فوراً بعد دوسرے نمبر پر کیا گیا تھا۔ حضرت محل کے میدان کارزار گرم کرنے کے بعد کہ اس سے بادشاہ کے مفاد کو ٹھیس پہنچی تھی وہ پچیسویں نمبر پر آ رہیں

زوجۂ پچیسویں جو میری ہے وہ بت مہ جبیں جو میری ہے
اسے انگریز فوج گھیرے ہے خنجر غم جگر پہ پھیرے ہے

اتار چڑھاؤ کی اس عارضی کیفیت سے قطع نظر بادشاہ نے جس طرح سبطین آباد، رہین منزل، عشق منزل اور مطیع سلطانی نامی عمارتیں عہد شاہی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کلکتہ میں دوبارہ تعمیر کرائیں اسیطرح حضرت محل کی دائمی مفارقت کا یقین ہوجانے کے بعد ایک شریف النسل خاتون کو جو حضرت محل سے یقیناً کچھ مشابہت اور مماثلت رکھتی ہوں گی اپنی زوجیت کا شرف بخشا اور حضرت محل

خطاب عطا کیا۔ بیگمات کی صورت اور سیرت نگاری میں جو غزلیں شیوع فیض کا جزو ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محل نے شمشیر و سناں کی جھنکار سے قبل طاؤس و رباب کی منزل کم سے کم دو خط ایسے بھیجے تھے جن کے منظوم جواب بھی مرحمت ہوئے بادشاہ کے جواب سے چند کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

میری جان ہیں یار حضرت محلؑ حسینہ طرح دار حضرت محل
شہ حسن بندہ بنا ناز کا مری ہے سزاوار حضرت محل
لکھا وصف جسم طلا فام کا ہوئے ہم بھی زر دار حضرت محل
حلب صدقے رخ پر ختن زلف پر فدا منھ بہ تا تار حضرت محل
حمیدہ خصائل، ستودہ صفات پری روخوش اطوار حضرت محل
مرے خط کے ہمراہ ہوں واہ واہ تری رات کے ہار حضرت محل
گھروں پر تباہی پڑی شہر میں کھدے میرے بازار حضرت محل
تو ہی باعث عیش و آرام ہے غریبوں کی غم خوار حضرت محل

شروع کے چار شعروں سے ان کے کندنی رنگ، تابناک چہرے، کھڑے ناک نقشے، سیاہ بال اور حسن و جمال کا علم ہوتا ہے۔ پانچواں اور چھٹا شعر ان کی سیرت اور ذہانت کا ترجمان ہے خصوصاً رات کے باسی پھولوں کا تحفہ جو ایک طرف ان کے قدیمی نام مہک پری اور دوسری بیگمات کے تحائف دولائی، دوپٹہ، مسی، ناخن اور زلفوں کے بال کے مقابل ان کی نفاست طبع پر دال، آخری دو شعر ۵۷ء کی ہنگامہ آرائی سے قبل لکھنو کی تباہی کی خبر دیتے ہیں جس کی شکایت کی گئی ہوگی اور بجز غریبوں کی غم خوار کہنے کے، قہر درویش بر جان درویش، واجد علی شاہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

شیوع فیض کی وہ دوسری غزل بھی اس مزاج کی عکاس ہے۔

جان عالم محمدی بیگم رہو خرم محمدی بیگمؔ
مونس شب کی خلوتوں کی جلیس میری ہمدم محمدی بیگمؔ
جو چھپانا تھا وہ کھولا ہے لکھتے ہیں ہم محمدی بیگمؔ

اس غزل کا تیسرا شعر اس لیے قابل ذکر ہے کہ جس نام کی سند دوسرے دوسرے ماخذ میں تلاش کی جاتی رہی وہ اس اقرار کے ساتھ یہاں موجود ہے کہ لکھنے والے نے یہ نام اور کہیں کبھی نہیں لکھا۔ چوتھا حضرت محل کی شعر گوئی کی اطلاع دیتا ہے اور ہم اگر حضرت محل کو بھی واجد علی شاہ کی ناخواندہ بیگمات کے زمرے میں شامل سمجھیں تو ان اشعار کا کیا کریں جو مٹیا برج میں کہے گئے۔ وہاں کے لوگوں کے پاس موجود ہیں اور اسی صفت سے متصف ہیں جس کی یہاں داد دی گئی ہے، یعنی غم انگیز بیان، مزاج آشنا، بیگم نے یہ خط بھانے اور کلکتہ بلائے جانے کے لیے نہیں اختر نگری کی حالت زار پر متوجہ کرنے اور لکھنو واپس چلے آنے کے لیے لکھے ہونگے لیکن جب نتیجہ برعکس نکلا تو، تن بہ تقدیر بیگم نے اپنے کو اسی آگ میں جھونک دیا جو چاروں طرف لپک رہی تھی اور وہ انقلاب ظہور میں آیا جس نے قیصر باغ کی صورت ہی بدل دی۔

دلیری اور دلاوری کی اس خونچکاں تاریخ میں جو کسی شاعر بادشاہ نے نہیں ہندوستانی اور انگریز جہاں دیدہ اہل قلم نے رقم کی ہے ہمیں حضرت محل کے عزم و استقلال اور جاہ و جلال کے وہ مرقعے نظر آتے ہیں جو ان کے حسن و جمال کے تذکرے سے زیادہ دلکش ہیں اور یہی سبب ہے کہ طبقۂ نسواں میں ان کی شخصیت نہایت پرکشش سمجھی جاتی ہے[۱۱] لکھنو کا چونکھی دروازہ جو حضرت محل کا مستقر تھا ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء تک کھنڈر بن گیا جب وہ اس سے دست بردار ہوئیں۔ کبھی فینس کبھی ہاتھی، کبھی گھوڑے پر برجیس قدر کو ساتھ لیے فوجوں کی کمان کرنا، انعام و اکرام سے ان کے حوصلے بڑھانا، ایک مورچا ہے تو دوسرا مورچہ اور ایک شہر نکل جائے تو دوسرے شہر میں اپنی پسپا سپاہ کو پھر صف آرا کرنا معمولی تنظیم اور جرأت کا کام نہ تھا۔ ہر تصادم کے ساتھ ان کی طاقت میں کمی اور انگریزوں کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن حضرت محل نے جنگ ہاری تھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ نہ صرف انگریزوں کے وظیفے اور احترام شاہانہ کی پیشکش کو ٹھکراتی رہیں۔ بلکہ ملکۂ وکٹوریہ کے فرمان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے جواب میں اپنے تدبر اور فراست کی آخری دستاویز بصورت فرمان فراہم کرنا[۱۲] اور نومبر ۱۸۵۹ء تک ہمالیہ کی ترائی میں اودھ کی ہی شمالی سرحد کے اندر انگریزوں کی فوجی چھاونیوں پر چھاپہ مار دستوں کا انتظام کرنا[۱۳] اس جدوجہد کا پیش خیمہ تھا جو ۱۹۴۷ء میں آزاد ہندوستان کی صورت میں نمودار ہوئی کہنے کو کوئی اسے واجد علی شاہ کی سلطنت کا ہی "سلسلہ" کہے یہ اس عہد برہان الملک کی توسیع اور مملکت اودھ کی سمٹتی ہوئی بساط تھی جسے برہانؒ الملک کی اولاد نے دلوں کو تسخیر کرتے ہوئے بچھایا اور کھویا تھا۔ واجد علی شاہ تو اس کے بعد بھی اپنی ذاتی جائیداد، وظیفے اور خزانے پر متمکن او متصرف رہے۔ "نابالغ" برجیس قدر ہی باغی قرار پائے ان کو ان کی اولاد میت زہر سے

سے ہلاک کرنے کی ناپاک سازش کی گئی جو ہلاک ہونے سے بچ گیے۔ وہ باپ کی جائیداد، جاگیراور گورنمنٹ میں جمع لاکھوں روپیے کے پرامیسری نوٹ سے بے حق ہوئے اور ان کی حریت پسند غیرت دار ماں ـــــ یہ مرثیہ اپنی زندگی کا خلاصہ چھوڑ گئی ہے

حکومت جو اپنی تھی اب ہے پرائی　اجل کی طلب تھی اجل بھی نہ آئی
نہ تخت اور تختہ، اسیری نہ شاہی　مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی
وہ رتبہ جو پایا تھا ہم نے وطن میں　اسی کی بدولت ہوئی یہ لڑائی
عدو بن کے آئے جو تھے دوست اپنے　نہ تھی جس کی امید کی وہ برائی
گھڑی دو گھڑی کے جھگڑے ہیں سارے　ابھی ہو گی قید الم سے رہائی
زمانہ رکھے گا پر اپنی نظر میں　میری سرفروشی میری نارسائی
اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا　پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی

لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی فلک کی ستائی عـ۱۱

□□

اس مضمون میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

تاریخ اودھ، جلد ۵ ـ نجم الغنی ـ اخبار الصنادید ـ قیصر التواریخ جلد ۲ ـ مثنوی عشق نامہ داستان ـ تاریخ اقتداریہ، قلمی کتب خانۂ آصفیہ، مثنوی عشق نامہ ـ واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات ـ اخبار طلسم ـ مائی ڈائری آف انڈین میوٹنی ـ سر ڈبلیو ایچ رسل ـ نظارہ لکھنؤ حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء اے ٹین ففٹی سیون ـ عروج عہد انگلشیہ ـ تاریخی شہ پارے ـ ۵۷ء کے ہیرو ـ سیدہ انیس فاطمہ ـ تاریخی شہ پارے، مرزا اظہر علی برلاس ـ فریڈم اسٹرگل اِن اتر پردیش، جلد ۱، ص ۳۵۳ ـ واجد علی شاہ کی مٹیا برج کی اولاد کا سپاسنامہ بنام صدر جمہوریہ ہند ۱۹۶۲ء ـ تقویم سلطانی ۱۲۶۵ھ ص ۶۵ ـ دی آکسفورڈ اینڈ کیمبرج برٹش ہسٹری ـ سلطان عالم واجد علی شاہ ـ تقویم سلطانی ۱۲۶۵ھ ص ۵۴ ـ اخبار طلسم (لکھنؤ) مورخہ ۱۹، دسمبر ۱۸۵۶ء ـ تقویم سلطانی ـ مثنوی بحر مختلف ـ اودھ پنشن پیپرز ـ حزن اختر (شرر کا مقدمہ) اودھ اخبار (لکھنؤ) ۲۸، نومبر ۱۸۵۹ء ـ

حواشی

عـ۱ یہ درحقیقت موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں والی گجرات کی صاحبزادی تھیں. موتمن الدولہ کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی اس لیے محمد شاہ نے اپنی لڑکی بنایا اور اپنے محل میں پرورش کی. خود ہی نسبت طے کی اور خود ہی جہیز بھی دیا. باپ نے اپنی لڑکی کو جو کچھ دیا بطور تحفہ دیا ـ اور جب ایک صوبے دار نے اتنا کچھ تحفے میں دیا تو باقی بیس صوبوں کے صوبیدار سب اسی طرح ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے. یہ ابتداء تھی اودھ کے اس ضرب المثل خزانے کی جو شجاع الدولہ سے برجیس قدر تک ہر برے وقت میں کام آیا ـ

عـ۲ برجیس قدر کی منکوحہ جنہیں نیپال کے کسی رئیس کی لڑکی بتایا گیا ہے (ملاحظہ ہو نئی قدریں خاص نمبر، حیدر آباد (پاک) اپریل ۱۹۵۷ء ص ۱۸۰) نکاح نامے کی رو سے ایک ترکی النسل پناہ گزیں مرزا داؤد بیگ کی بیٹی اور بہادر شاہ کی نواسی تھیں. صاحب النسا بیگم نام تھا. حضرت محل نے اپنی بہو بنا کر مہتاب آرا نواب اختر بہو بیگم صاحبہ خطاب دیا اور دلی کے شاہی خاندان سے سمدھیانے تک از سر نو تجدید کی. مہتاب آرا بیگم بادشاہ کے سلام کو مٹیا برج بھی گئی تھیں (دیکھیے نیا دور، لکھنؤ اگست ۱۹۵۷ء ص ۴۳-۳۸) ـــ ۱۹۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا. امام باڑہ سبطین آباد مبارک مٹیا برج میں اپنے شوہر کے سرہانے دفن ہوئیں. مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں انکی ایک طبعزاد داستان کا ناقص الآخر نسخہ محفوظ ہے ـ

بہادر شاہ ظفر اگر تاج بخشی نہ کرتے جب بھی ان کا انجام اس سے مختلف نہ ہوتا. جو ہوا لیکن مظفر الدولہ جنھوں نے دلی میں برجیس قدر کے سفیر کو مہمان رکھا تھا اسی خطا پر لقمۂ اجل ہوئے ـ (قیصر التواریخ، جلد ۲ ص ۴۹-۴۴۸) اور سلطان العلماء کی تیس لاکھ معافی کی جاگیر ضبط ہوئی (نظارہ حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء، ص ۶ (اور ص ۷۳)

عـ۳ برجیس قدر کے ان دونوں ادوار کی مہروں میں بھی فرق ہے ۱۲۷۳ء کی تقریباً چوکور مہر میں صرف نام کندہ ہے، دوسری مہر اگر وہ مہر نہیں ہے جس کا بہادر شاہ نے اپنے شقہ میں وعدہ کیا تھا تو یقیناً وہ یہ مہر ہے جس کا تواریخ نادر العصر ص ۱۲۵ پر ذکر ہے. اس مہر کی پیشانی پر مچھلیاں تاج

اٹھائے ہیں جس میں "نصر من اللہ و فتح قریب" درج ہے اور اندرون مہر یہ عبارت کندہ ہے۔ "برجیس قدر محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ ۱۲۷۴ھ"

ع۴ جن چند کتابوں میں برجیس قدر کا نام آخری فرمانروا کی حیثیت سے درج ہے۔ ان میں "دت رائے چودھری اور مجمدار" کی تالیف "این ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا" آزادی سے چند سال قبل شایع ہوئی اور برٹش میوزیم کے نیشنل ہیرٹیج کے شعبہ میں صرف اسی کتاب کو ہندوستان کی نمائندہ تاریخ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میوزیم کا کیٹ لاگ "دی کوئنس آف دی کنگس آف اودھ" حکومت برطانیہ کا مرتب کردہ ہے اور ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس نام کو نظر انداز کریں۔ جس کے سکے اگرچہ نایاب ہیں لیکن موجود ہیں۔ قیصر التواریخ کے مؤلف نے بوجوہ اس بادشاہی کو جبری اور مصنوعی بتایا ہے لیکن اس نام کو وہ بھی نظر انداز نہ کر سکے۔ قدیم ترین ماخذ میں قیصر التواریخ سے زیادہ معتبر اور جامع کوئی کتاب نہیں ہے۔

ع۵ علاوہ گنج شائگاں جلد ۱ ص ۱۱ کے جہاں صرف تین شعر اور مختلف برجیسی سکوں کے درج ہیں اسٹنڈرڈ کیٹلاگ آف ورلڈ کوائنس (مرتبہ آر۔ بروس مطبوعہ کروز پبلیکیشن، وس کونسن، امریکہ، ایڈیشن ۱۹۸۸ء صفحہ ۴۷) پر تانبے، چاندی اور سونے کے ۶ سکوں کی تفصیل اور ایک کی تصویر مع اوزان درج ہے۔

ع۶ تذکرہ آب بقا ص ۵، پر صرف ۴ شعر مزید اس قصیدے کے درج ہیں۔

ع۷ مزید تفصیل کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ملاحظہ فرمائیے۔

ع۸ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کاغذات چند سال پہلے تک لکھنؤ کے مال خانے میں تھے بمبئی کے ایک پروڈیوسر جو حضرت محل پر کوئی فلم بنانا چاہتے تھے اور اخبارات میں بھی اس فائل کا چرچا ہوا تھا انھوں نے کسی طرح وہ کاغذات اپنی تحویل میں لے لیے۔ حضرت محل کے اصلی نام محمدی کی اس ذریعے سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ باپ کا نام میر غلام حسین اور وطن فیض آباد درج تھا۔

ع۹ یہ تصویر ۱۸۵۷ء میں ہی اخبار ٹائمس، لندن، میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں صد سالہ یادگار کے موقعے پر حکومت ہند کے کارندوں نے اس کی زیریں عبارت سے بے نیاز اسے "۱۸۵۷ء پکٹوریل" میں جگہ دی اور حضرت محل کو واجد علی شاہ کی پہلی بیوی قرار دیا۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" (لاہور، ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء ص ۳۷) نے اس تصویر سے مختلف تصویر شایع کی اور ان دونوں قلمی تصویروں کا ایک تیسری قلمی تصویر سے موازنہ کیجئے جس نے واجد علی شاہ کے ذاتی نسخے عشق نامہ (مصور) میں جگہ پائی تو یہ اختلاف اور بھی نمایاں نظر آئیں گے۔

ع۱۰

زن و فرزند و اسباب و ریاست لوٹ لے ظالم
رکھے گی روز محشر تک زمیں ایک تار تار اپنا

دیگر فارسی۔

ہجر یار و غم و فرزند و زن و مال و منال
چند داغ اند کہ در پردہ نہاں سوختہ اند

ع۱۱ اجالا (ہفتہ وار، کلکتہ) ۲۹ ستمبر ۱۹۵۷ء، اجالا ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء، نظارہ (حضرت محل نمبر، لکھنؤ) ۱۹۶۲ء

ع۱۲ ملاحظہ ہو: انیس فاطمہ بریلوی کی ۱۸۵۷ء کے ہیرو (۱۹۴۹ء) ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" (۱۹۹۰ء) اور این سی آر ٹی کی درسی کتاب "اردو کی نئی کتاب (۱۹۹۰ء) آٹھویں جماعت کے لیے جس میں مضمون "حضرت محل" ایڈیٹر پروفیسر ثریا حسین صاحبہ نے راقم الحروف سے لکھوایا۔

ع۱۳ یہ فرمان انگریزی دور میں ہی وی ڈی ساورکر کی کتاب "دی انڈین وار آف انڈی پنڈنس" میں شایع ہو گیا تھا (انگریزی ترجمہ) لیکن کتاب شایع ہوتے ہی ضبط ہو گئی۔ اب اردو ہندی انگریزی مختلف زبانوں، رسالوں اور اخباروں میں اس کا صحیح متن موجود ہے

ع۱۴ حضرت محل کی یہ آرام گاہ ان کی اپنی تعمیر کردہ ہندوستانی مسجد چوک کٹھمنڈو کے صحن میں واقع ہے اور نیپال ہی وہ ملک ہے جہاں انھوں نے اپنی جلاوطنی کے تقریباً بیس برس گزارے۔

تفصیل کے لیے نظارہ لکھنؤ کا حضرت محل نمبر ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۷۹ء آج کل مارچ ۱۹۵۹ء علی گڑھ میگزین ۴۳، ۱۹۴۲ء ملاحظہ فرمائیے۔

عرفان عباسی
۹۱۔ باغ منو، نیا گاؤں، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۱

چند شاعراتِ اودھ

اجمالی تذکرے

شاعری بادرِ فطرت کا وہ حسین و دلچسپ تحفہ ہے جو بلا تفریق ہر ملک ہر قوم، ہر صنف اور ہر زبان کو عطا ہوا ہے۔ اقوامِ عالم کی طرح ہندستان اور ہندستان کے مختلف گوشوں کی طرح اودھ میں بھی ابتدا سے ہی فارسی و اردو شاعری کا بڑا چرچا رہا ہے۔ اگر شعراء نے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھا کر شہرت و ناموری حاصل کی ہے تو شاعراتِ اودھ نے بھی ہر دور میں شعری کارنامے انجام دیے ہیں۔ ابتدا میں خواتین کی شاعری پر مذہبی رنگ نمایاں تھا وہ تسکین ذوق کے لیے عقیدت و احترام کے ساتھ حمد، مناجات، قصیدہ، منقبت، سلام اور نوحہ وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی کرتی تھیں لیکن رواج زمانہ، سماجی حالات، پردہ، باقاعدہ تعلیم، شعری محفلوں و مشاعروں میں شرکت اور نام و کلام کی اشاعت وغیرہ پر سخت پابندیوں کی وجہ سے ان کی دل کش تخلیقات گھروں کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل پاتی تھیں۔ نتیجتہً لاتعداد و خوش کلام شاعرات کا نام و کلام نظروں سے اوجھل رہا اور وقت کے ساتھ معدوم ہوگیا۔ بتدریج معمولی سماجی تبدیلیوں کے ساتھ بعض شاعرات نے مذہبی شاعری کے علاوہ غزل، نظم اور مثنوی وغیرہ اصناف کو بھی ذریعۂ اظہار خیال تو بنالیا لیکن فطری شرم و حیا اور رسمی و سماجی پابندیاں بہر حال حائل و مائل رہیں اور وہ قابلِ قدر شعری اثاثہ بھی عموماً گھروں کی چہار دیواری میں ہی محصور رہا۔

سرزمینِ اودھ نے فنونِ لطیفہ کی تخلیق و تشہیر میں ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے اس کے نوابوں اور حکمرانوں نے شعری، ادبی اور تفریحی زندگی کو فروغ دینے کے لئے طرح طرح کے مشاغل اختیار کرکے اودھ کی ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیئے تھے۔ ان کے دور میں شاعروں اور فن کاروں کی جھولیاں زر و جواہر سے بھر گئیں۔ لاتعداد باکمال اساتذہ سخن کی انجمن ان کی فیاضی و دریا دلی کی شہرت سن کر اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ کی طرف کھنچ آئی جس نے طرزِ لکھنؤ کو آسمانِ کمال تک پہنچا کر گویا آبِ حیات پلادیا۔ ان اثرات نے سرزمین اودھ پر ایسی شعر انگیز فضا طاری کردی کہ در و دیوار سے نغمے پھوٹنے لگے۔۔۔!

اودھ کے اس ادبی، تہذیبی و ثقافتی عروج کے زمانے میں شرفاء و رؤسائے اودھ کے درباروں میں طوائفوں کی پذیرائی ہوئی۔ معاشرے میں رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ شاہدانِ بازاری کا عشق بطور فیشن داخل ہوگیا۔ امراء و رؤساء کے حرموں میں ان کی بڑی تعداد داخل ہوگئی اور انھیں ایسی اہمیت حاصل ہوئی کہ شرفاء و امراء کے بچے تربیت کے لئے ان کے سپرد کیے جانے لگے۔ ان میں سے بعض اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ اور خوش گو شاعرات ابھر کر سامنے آئیں اور بحیثیت شاعرہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئیں۔ وہ اپنے کلام کی تشہیر کر سکتی تھیں اس لئے ان کا کلام عوام تک پہونچنے لگا اور داد و تحسین سے نوازا جانے لگا۔ ان ماہ جبینوں اور زہرہ جبینوں کی شہرت و مقبولیت کے ساتھ اہم عصمت مآب شاعرات کے ناموں کے بھی انکشافات ہوئے جو تاریخ کے سینے میں پنہاں تھے اور جنھیں پیٹ کی ہلکی تاریخ راز نہیں رکھ سکی۔ اس طرح چند عصمت مآب پردہ نشین شاعرات کے کارنامے بھی سامنے آگئے، لیکن وہ شاعراتِ اودھ کی اصل تعداد کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

جہاں تک شاعرات کے کلام کا سوال ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

دبیز پردوں اور بلند و بالا فصیلوں کے اندر پنپنے والی شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔ بعض شاعرات کے اشعار اساتذۂ سخن کے زبان زد اشعار سے آنکھیں ملانے کی سکت رکھتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ اگر وہ سماجی پابندیوں میں جکڑی نہ ہوتیں اور اپنے جذبات کا کھُل کر اظہار کر سکتیں تو بیشتر شاعرات کے لیے صفِ اساتذہ میں جگہ پانے میں کوئی دُشواری نہ ہوتی۔

چند تقدس مآب اور عصمت مآب شاعرات کی شخصیت، شعری صلاحیتوں اور لیاقتوں کا ذکر اودھ کی ماہ جبینوں اور زُہرہ جبینوں کے تذکروں کے ساتھ ضرورتاً اور مجبوراً کر رہا ہوں ــ خدا مجھے معاف کرے۔ متعین و محدود صفحات ضخامت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے صرف چند شاعرات کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ تفصیلی تذکرہ انشاء اللہ پھر کبھی۔

اختر جائسی

وقار فاطمہ۔ مولوی سید اصغر حسین کے گھر نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۴۳ء میں ممتاز شاعر و ادیب اور اپنے زمانے کی فعال ادبی شخصیت سید آل محمد مہر جائسی سے شادی ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں بیوہ ہو گئیں۔ انھوں نے طویل عرصہ مہر جائسی کی رفاقت میں گزارا اور بھرپور فنی استفادہ کیا۔ بیشتر اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔

امیر لکھنوی

لکھنؤ کی نہایت ذہین و طباع طوائف۔ ۱۲۷۰ھ تک بقید حیات تھی۔ خوش فکر شاعرہ۔ صاحبِ تذکرہ "سخنِ شعراء" عبدالغفور نساخ اس سے ملے تھے۔ اپنے تذکرہ میں اس سے ملاقات کا ذکر کیا ہے ؎

جدھر کو دیکھنے سے جانِ زار جاتی ہے
اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے

انیس لکھنوی (انیس بانو)

اپنی وحشت کی ترقی حد سے گزری اے جنوں ؎
ہاتھ کو جنبش ہوئی اور چاک داماں ہو گیا

بہتر رائے بریلوی: سیدہ خیر النساء بہتر۔ علم و فضل، عبادت و ریاضت شرافت و نجابت اور دینی خدمات کی بنا پر مشہور خاندان کے فرد سید ضیاء النبی مرحوم کے گھر ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں۔ عربی، فارسی اور اُردو کی اعلیٰ تعلیم خانگی طور پر حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا حکیم سید عبدالحیٔ ناظم ندوۃ العلماء مصنف "گلِ رعنا" سے شادی ہوئی۔ فطری و وہبی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے حمد، نعت اور مناجات کے لئے اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ان کے مجموعے "بابِ رحمت"، "کلید بابِ رحمت" اور نثری تصنیفات "حسنِ معاشرت" اور "ذائقہ" وغیرہ مطبوعہ ہیں۔ ۳۱ اگست ۱۹۶۸ء کو انتقال ہوا۔

تیری رحمت، کبھی ہم پر نظر ہو گی ضرور
نہ رہے گی شبِ تاریک سحر ہو گی ضرور

بنتِ نیّر خیر آبادی، سیدہ خاتون

بنتِ نیّر اور دُخترِ نیّر تخلص ؎

مشکل مری آساں ہو جائے اے دُخترِ نیّر محشر میں
گر ان کی نگاہ لطف و کرم مائل پہ اشارا ہو جائے

پارسا لکھنوی۔ دُختر مرزا محمد تقی ہوس ؎

چلتا نہیں ہے ابلقِ ایام ایک چال
اکثر یہ بدرکاب بنا اور بگڑ گیا

تاجدار لکھنوی ۔ تاجدار بہو۔

ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ بعض تحریروں کے مطابق زبان و بیان پر قادر خوش فکر شاعرہ تھیں۔ مرثیہ نگاری سے خاص شغف تھا۔ ان کا مخطوطہ مراثی کتب خانہ محمود آباد میں محفوظ ہے ؎

یہ جنگ بھی جہاں کے لئے یادگار ہے ۔۔۔ یہ معرکہ بھی قدرتِ پروردگار ہے
حمزہؓ کی اور علیؑ کی بہم کارزار ہے ۔۔۔ فوج عدو میں رعب سے اب انتشار ہے
لشکر میں ساتھ شہ کے علمدار آتے ہیں
ہمرہ علیؑ کے جعفر طیارؓ آتے ہیں

تسنیم جون پوری ۔ معصومہ تسنیم زیدی

خان بہادر محمد مصطفےٰ گنج گاؤں ضلع جون پور کی دختر اور ممتاز شاعر وامق جون پوری کی بہن ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے۔ مرثیہ، قصیدہ اور سلام وغیرہ کہتی ہیں ؎

ہالے میں گیسوؤں کے ہے مہتاب سی جبیں　　خم دار ابروؤں پہ مہِ نو کا ہے یقیں
سایہ ہر ذوالفقار کا ہے چشمِ سرمگیں　　باریک جلد عارضِ تاباں کی آتشیں

دو پھول ہیں بہار یہ سارے چمن کی ہے
رنگت گلاب کی ہے مہک یاسمن کی ہے

تسنیم رائے بریلوی۔ امۃ اللہ

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ وخیر النساء بہتر کی صاحبزادی، مولانا علی میاں کی ہمشیرہ اور مولانا سید ابوالخیر حسنی کی شریکِ حیات تھیں۔ ۱۸؍جون ۱۹۰۸ء کو تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ حفظِ قرآن پاک کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ معلمہ، شاعرہ اور مصنفہ کی حیثیت سے خاصی شہرت کی مالک تھیں۔ زادِ سفر۔ ہمارے حضورؐ۔ موجِ تسنیم (شعری مجموعہ)، دیارِ حبیبؐ اور بچوں کی قصص الانبیاء وغیرہ مطبوعہ ہیں۔
۲۸؍جنوری ۱۹۷۶ء کو انتقال ہوا۔

تمہاری آل میں اک خاکسار ہم بھی ہیں
چمن میں اک شجرِ خار دار ہم بھی ہیں

تسنیم ملیح آبادی۔ جمیلہ خاتون

ابرار حسن خاں اثرؔ ملیح آبادی کی دختر، اعجاز احمد خاں کی شریکِ حیات جوشؔ ملیح آبادی کی بھانجی۔ تعلیم خانگی طور پر حاصل کی، ذوقِ سخن ورثہ میں پایا۔ خاندان میں متعدد نامور شعراء گزرے ہیں۔ اثرؔ بھی اپنے زمانے میں اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے ؎

دلِ افسردہ کیوں کھِلا رہا ہے
ٹھہر جا کوئی شاید آ رہا ہے

جانی۔ بیگم جان المعروف بہو بیگم

دخترِ نواب قمرالدین خاں۔ حرم نواب آصف الدولہ اپنے دور کی مشہور و معروف شاعرہ تھیں ؎

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمنِ جانیؔ
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

جعفری لکھنوی

لکھنؤ کی مشہور طوائف، منشی فدا حسین فداؔ کی شاگردہ۔ ۱۲۸۹ھ تک بقیدِ حیات تھی۔ ؎

منہ کو آجائے کلیجہ، ضبط کی طاقت نہ ہو
گر ہمارا دل رہے دم بھر کسی کے دل کے پاس

چھمام لکھنوی۔ امیر جان (طوائف)

غالباً نازؔ تخلص بھی کرتی تھی ؎

اپنے پہلو میں جگہ دی سرِ محفل مجھ کو　　دلدہی یار نے کی دیکھ کے بیدل مجھ کو

حاجی لکھنوی۔ زیب النساء بیگم

محمد علی شاہ فرماں روائے اودھ کی دختر، نواب اقتدار الدولہ کو منسوب تھیں، خوش فکر شاعرہ تھیں۔ عموماً سلام کہتی تھیں اور مرزا دبیرؔ سے اصلاح لیتی تھیں۔ بڑی مخیر خاتون تھیں ؎

قبرِ اصغر کھودتے تھے اور فرماتے تھے شاہ
یہ بھی لکھا تھا سیدِ مظلوم کی تقدیر کا

حجاب بارہ بنکوی۔ حشمت آرا

نواب گنج بارہ بنکی کے ایک معزز گھرانے میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئیں۔ ذوقِ شاعری فطری تھا۔ دورانِ تعلیم مشقِ سخن کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ لاہور میں قیام ہے ؎

دو گھڑی کے لیے آجا کر لبوں پر دم ہے
کون جانے شبِ ہجراں کی سحر ہو کہ نہ ہو

حجاب لکھنوی۔ عسکری بیگم

مُلّا محمد زماں اصفہانی کی پوتی۔ محمد علی خاں مسیحاؔ کی شاگرد۔ باذوق شاعرہ تھیں، اکثر اپنی رہائش گاہ پر مشاعرے منعقد کرتی تھیں ؎

رات کو آئیں گے وہ صاف معمّہ ہے　　وعدۂ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

حجاب لکھنوی۔ نواب بیگم عرف چھوٹی بہو

نواب اعظم علی خاں کی دختر، ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئیں۔ واجد علی شاہ اختر کے نکاح میں آئیں۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد بحالتِ نظر بندی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔

دامنِ محبوب تک پہنچا نہ جب دستِ جنوں
بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

حرماں خیرآبادی۔ سعید النساء

علامہ فضلِ حق کی صاحبزادی، مضطرؔ خیرآبادی کی والدہ۔ علم و فضل

اور شعر و سخن میں شہرت رکھتی تھیں ۔ ذکاوت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ خود علامہ نے کہا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم کیا کہ یہ مرد نہ ہوئیں ورنہ میری قدر ختم ہو جاتی ؎

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

میری برگشتگیٔ بخت کو لکھتے لکھتے
آخرش کاتبِ تقدیر کو چکر آیا

حزیں نیوتنوی ثم لکھنوی ۔ حسن جہاں بیگم

حکیم سید اصغر حسین کی دختر۔ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئیں ۔ مشرقی طرز پر تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں ممتاز ادیب و محقق سید مسعود حسن رضوی ادیب سے شادی ہوئی اور تقریباً ۴۲ سال اُن کی رفاقت میں گزارے ، فطری ذوق علم و ادب اور شعر و سخن ادبی ماحول میں پروان چڑھا اُردو امثال پر بڑا کام کیا تھا جو مکمل اور شائع نہیں ہو سکا۔ اچھی شاعرہ بھی تھیں ۔ ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا ؎

جانبِ میداں ہمکتے تھے جو اصغر بار بار
ماں لگا لیتی تھی سینے سے تڑپ کر بار بار

اک غمِ شہ کے سوا دنیا میں کوئی غم نہ ہو
یہ حزیں تجھ سے دُعا کرتی ہے داور بار بار

حسن لکھنوی ۔ وزیر جان (طوائف)

محلہ بابا نالہ میں رہتی تھی ۔ اچھی شاعرہ تھی ؎

نالۂ سوزاں جو کھینچے میں نے رو کے ہجر میں
رشک سے بجلی جلی شرمندہ اشکِ تر ہوا

وہ مریضِ غم ہوں میں جس کو دوا آئی نہ راس
سر پہ جب صندل لگایا اور دردِ سر ہوا

حسین فیض آبادی ۔ حشمت جان (طوائف) ؎

فکرِ انجامِ محبت ہو گئی آغاز میں
ہم سے بھی کم لوگ دیکھے ہوں گے دیوانہ مزاج

اے حسینؔ ! ہم کو تو دل سے خاکساری ہے پسند
ہو مبارک اس پری پیکر کو شاہانہ مزاج

حنا لکھنوی ۔ عزیز بانو

احقر حسین کے گھر ۱۵؍ اگست ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئیں ۔ زمانۂ حال کی شاعرہ ہیں۔ ہزار لکھنوی اور سلیم شاہد کلکتوی کی شاگرد ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں ؎

وفا تو ان سے ہوئی ہے نہ عمر بھر ہوگی
تو پھر حنا تجھے کیوں اعتبار آج بھی ہے

حور لکھنوی ۔ منا جان (طوائف)

شاگرد محمد رضا طور لکھنوی ؎

بدی کی جس نے ہم سے ہم نے اس کے ساتھ نیکی کی
ہماری خُو یہ ہے ہم دوستی کرتے ہیں دشمن سے

حیا بارہ بنکوی ثم لکھنوی ۔ کنیز فاطمہ

چودھری نعمت اللہ کی دختر، چودھری عبد الرحمٰن سندیلوی کی شریکِ حیات مشہور ادیبہ، شاعرہ اور صحافی ۔ علمی، ادبی و سماجی کاموں میں پیش پیش رہتی تھیں ۔ وہ عرصہ تک ماہنامہ "حیا" نکالتی رہیں جو ادبی حلقوں میں مقبول تھا ان کا کلام نو تر اخبار و رسائل میں چھپتا تھا ۔ ۱۹۸۰ء کے قریب پاکستان میں موجود تھیں ؎

شرابِ ناب میں اب رنگ و بو نہیں باقی — وہ ربطِ شیشہ و جام و سبو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیا اب بھی — مگر دلوں میں صداقت کی بُو نہیں باقی

خورشید لکھنوی ۔ خورشید جان (طوائف)

جان لینے کو ہے اک جنبشِ ابرو کافی
قتلِ عاشق کے لئے باندھی ہے شمشیر عبث

دُلھن فیض آبادی ۔ شمس النساء بیگم

۱۷۶۶ء میں نواب آصف الدولہ سے عقد ہوا تو سسرال سے "نواب بہو" اور "دُلھن بیگم" کے خطابات ملے ۔ شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتی تھیں اور صاحبِ دیوان تھیں ؎

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

دھرم لکھنوی دھرم دیوی

آپ ہی دردِ محبت دل میں پیدا کیجئے — آپ ہی سامانِ تسلی کا مہیا کیجئے

رابعہ جہانگیرآبادی۔ رابعہ سلطان

رانی جہانگیرآباد۔ نعت ومناجات اچھی کہتی تھیں ؎

آقائے دوعالم مرے سرکار مدینہ　　للہ دکھا دیجئے گلزارِ مدینہ

زاہدہ لکھنوی۔ زاہدہ خاتون

(زاہدہ خلیق الزماں) بنت محمد مرتضیٰ خاں۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئیں والد مشہور عطرساز فرم اصغر علی محمد علی کے مالکان میں تھے۔ اس تجارت پیشہ خوش حال ورئیس گھرانے میں شعروادب کا بڑا چرچا تھا۔ کئی بزرگ خوش فکر اور صاحب دیوان شعرا تھے جن کی وجہ سے شعر وسخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ زاہدہ نے ۱۲ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی۔ اس کے بعد غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی بہت کہیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ حیا لکھنوی، عصمت لکھنوی اور عظمت لکھنوی سے پردے کی موافقت اور مخالفت میں ان کے منظوم مباحثوں کی بڑی دھوم تھی۔ وہ مباحثے کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے تھے۔ ۸ر جنوری ۱۹۸۲ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

ترجمانِ دل ہے اک اک شعر اپنا زاہدہ
کون پاسکتا ہے یہ گوہر تمہارے بغیر

زہرا خیرآبادی۔ امراؤجان عرف چھٹن

امام باندی طوائف کی بیٹی اور ڈیرے دار طوائف تھیں۔ خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئیں لیکن آپ و دانہ لکھنؤ لے آیا اور پھر لکھنؤ ہی کی ہوگئیں میرآغا علی شمس کی تربیت یافتہ تھیں، انھیں کی سرپرستی میں فارسی اور اردو شاعری میں مہارت حاصل کی۔ زہرا اور ان کی بہن مشتری مرزاغالب کی حریف تھیں۔ ان کے تنقیدی مضامین اخبار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ دونوں بہنیں فارسی و اردو زبانوں پر عبور رکھنے والی اپنے دور کی ممتاز شاعرہ، انشاپرداز اور ماہر رقاصہ تھیں۔ انھیں نظم ونثر پر یکساں قدرت حاصل تھی ؎

میں نے واللہ دی دعا تجھ کو
تو خدا جانے دل میں کیا سمجھا

زیب النسا۔ سیدین جون پوری

سید علی امام کی دختر اور ڈاکٹر غلام السیدین کی شریک حیات۔ قصیدہ، مرثیہ اور نوحہ کہتی ہیں۔ شروع میں کلام پر اصلاح اپنے چچا غلام امام نامی مرحوم سے لیتی تھیں ؎

مدت کی دعاؤں کا صلہ آج ملا ہے
احمدؐ کے گلستاں میں نیا پھول کھلا ہے

زیبا کاکوروی۔ عفت بانو عباسی

مشہور ادبی خانوادے کے فرد رئیس احمد عباسی مرحوم کے گھر ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دوران طالب علمی شاعری کا آغاز ہوگیا تھا۔ معروف شاعر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شاگردی اختیار کرکے بھرپور فنی استفادہ کیا، پرگو اور صاحب دیوان شاعرہ ہیں غزل اور نظم دونوں اچھی کہتی ہیں۔ کلام اخبارات ورسائل میں بہت چھپا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "حرفِ زہراب" بھی شائع ہوچکا ہے ؎

نظر نظر ہے جمال تیرا، نفس نفس ہے خیال تیرا
مگر یہ حسنِ سبک خرامی، کہیں بھی آوازِ پا نہیں ہے

زینت لکھنوی۔ بچن (طوائف)

میراصغر علی اصغر سے اصلاح لیتی تھی، آخر عمر میں کلکتہ چلی گئی تھی ؎

جنوں کے ہاتھ سے دامن بچاکے رکھا تھا
لپٹ کے دشت میں کانٹوں نے تار تار کیا

سردار لکھنوی۔ سردار بیگم

ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ غدر کے بعد بیوہ ہوکر کانپور، قنوج اس کے بعد اٹاوہ چلی گئی تھیں بقیہ عمر وہیں گزاری ؎

سردار روزِ حشر کو اُٹھ کر کہے گی یہ
عاشق کہاں سے سنگ کا اپنے بنائے دل

سلطان لکھنوی۔ سلطان بیگم

دختر معتمد الدولہ۔ قبل ۱۸۵۷ء بقید حیات تھیں ؎

قاتل نے کب کہا تھا کہ آنکھیں لڑائے دل
آخر یہ میری جان پہ آئی۔ بلائے دل

سلطان لکھنوی۔ نواب سلطان عالیہ بیگم

محمد علی شاہ کے پوتے نواب حسین علی خاں کی شریک حیات۔ اپنے زمانے کی پختہ مشق شاعرہ اور مرزا دبیر کی شاگرد تھیں ؎

نیزہ ہو دل میں، لاش ہو رن میں، سناں پہ سر
اکبر کو تھے شباب کے ارماں نئے نئے

سیدہ نیر آبادی

حالات دستیاب نہیں۔ کلام میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔

تا کجا یہ صورتِ تخریبِ ملت تا کجا
فکرِ مسلم کو کمالِ حسرتِ تعمیر دے

شرم لکھنوی۔ شمس النسا بیگم

حکیم قمرالدین خاں تلمیذ خواجہ وزیر کی دختر۔ مولد بنارس تھا۔ لیکن لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

جو تیری کاکلِ مشکیں کی بو صبا لائی
دماغ عرش پہ اس خاکسار کا پہنچا

شرم لکھنوی۔ امامی جان (طوائف)

اکبری دروازہ کے قریب لکھنؤ میں سکونت تھی۔

اثر خاکِ لحد یہ ہے کہ چھو جانے سے
مرضِ ہجر کے بیمار شفا پاتے ہیں

شرم لکھنوی۔ عصمت آرا مرتضیٰ بیگم

مرزا محمد قمرالدین حیدر عرف بڑے صاحب عالم کی دختر۔ باقر علی خاں راز لکھنوی کی اہلیہ تھیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ سلام و مرثیہ خوب کہتی تھیں۔ ان کا ایک مرثیہ کتابی شکل میں ۱۹۲۹ء میں شائع بھی ہوا تھا۔

شمع لکھنوی۔ عظمت اقبال

شمع اور عظمت تخلص کرتی تھیں۔ چودھری نعمت اللہ کی بیٹی، کنیز فاطمہ حیا کی بہن اور انھیں کی شاگرد۔ چند سال قبل تک پاکستان میں تھیں۔ کلام رسائل میں چھپتا تھا۔

کتنی لامحدود ہیں اس بیخودی کی وسعتیں
منزلِ ادراک سے آگے بڑھی جاتی ہوں میں

شمیم ملیح آبادی۔ صفیہ خاتون

بنتِ دیدار حسن خاں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ دورِ حاضر کی معروف شاعرہ ہیں۔ شعری مجموعے "آہنگِ شمیم" اور "گریہ و تبسم" مطبوعہ ہیں۔ راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

نقابِ شب میں جمالِ سحر تلاش کریں
چلو تبسمِ گل ہائے تر تلاش کریں

شمیم لکھنوی۔ انوار فاطمہ

پولیس انسپکٹر عبدالرشید کے گھر لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ عربی، فارسی و اردو تعلیم گھریلو طور پر حاصل کرنے کے بعد لاہور اور الہ آباد سے عربی فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں اور الہ آباد کراس ویٹ گرلس کالج میں اردو، فارسی استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ تصنیف تالیف اور شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ جملہ اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ کلام رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ ایک کتاب "انوار اسرار احمدیہ" (واقعاتِ حیاتِ نبویؐ) بھی چھپی تھی۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۰ء کو الہ آباد میں وفات پائی۔

مری تباہیاں مشہور ہیں زمانے میں
یقیں ہے آپ نے بھی کچھ نہ کچھ سنا ہوگا

شمیم لکھنوی۔ بی بیگم

تلمیذ نشتر سندیلوی۔ پردہ نشین شاعرہ۔

قول ہے شمشیرِ قاتل کا مجھے دل چاہیے
دل یہ کہتا ہے مجھے شمشیرِ قاتل چاہیے

شیدا لکھنوی۔ شیدا بیگم۔

کیوں ہم سے چھپانے لگے تم راز کی باتیں
ہم تم سے کسی بات کا پردا نہیں کرتے

شیریں لکھنوی۔ بیگا

محلہ چوک میں سکونت تھی۔ شعر و شاعری سے والہانہ لگاؤ تھا اور اچھے شعر کہتی تھیں۔ شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لیتی تھیں۔

پری زادوں میں تم مشہور میں مشہور دیوانہ
اگر تم شمعِ محفل ہو تو یہ بندہ ہے پروانہ

شیریں لکھنوی

چوک کی ایک شاہد رعنا تھی جو آخر میں کلکتہ چلی گئی تھی۔

دیر سے ہم سر جھکائے منتظر ہیں تیغ کے دست و بازو کو ترے اس وقت قاتل کیا ہوا

صاحب لکھنوی۔ امۃ الفاطمہ

حکیم مومن خاں مومن سے اصلاح لیتی تھیں۔

جو خط جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
دکھلانا مرا نامۂ اعمال الٰہی

صُغریٰ لکھنوی ۔ صغریٰ فاطمہ

دلِ غمگیں کو میرے یا الٰہی شادماں کر دے
مجھے بھی حاضرِ دربارِ سلطانِ جہاں کر دے

صدر لکھنوی ۔ نواب صدر محل

آخری تاجدارِ اودھ کی بیگمات میں تھیں ۔ اچھی شاعرہ اور صاحبِ دیوان ("بادشاہ نامہ" ۱۲۸۸ھ) تھیں ۔ ۱۲۹۲ھ تک بقیدِ حیات تھیں ۔

حسرت و آرزوئے وصل، درد و مصیبت و فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

صنوبر خیر آبادی ۔ وارث فاطمہ

معروف استاد وسیم خیر آبادی کی دختر اور اثیم خیر آبادی کی بڑی بہن، ذکی و فہیم اچھی شاعرہ تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد کہی گئی ایک جذباتی و تاثراتی نظم کا بند ہے

مٹ چکیں سب آرزوئیں خونِ ارماں ہو چکا
خانۂ آبادِ دل گنجِ شہیداں ہو چکا
بے سر و سامانیوں کا ابھی ساماں ہو چکا
شوقِ لطفِ نوجوانی بھی پریشاں ہو چکا

سخت جاں بیشک ہیں لیکن شوق کھو دیتے ہیں ہم
یاد جب آتی ہے تیری آہ رو دیتے ہیں ہم

ضیاء لکھنوی ۔ ضیائی بیگم

حکیم انور علی کی شریکِ حیات ۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر قادر اور تینوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں ۔

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

طاہرہ لکھنوی ۔ طاہرہ بیگم

سید اعجاز حسین اعجاز کی دختر اور سرفراز حسین خبیر کی بہن ۔ اچھی شاعرہ اور خطیب ۔ تلمیذ خبیر ۔ ان کا مجموعۂ قصائد "گوہر کعبہ" شائع ہو چکا ہے ۔

بربتِ کعبہ ہے ہر اک قصیدہ طاہرہ اپنا
لسان اللہ کے صدقے میں پائی ہے زباں دانی

عاطف خیر آبادی ۔ ریحانہ انصاری

الٰہی بخش انصاری کے گھر ۱۹۵۶ء میں خیر آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئیں ۔ جنبش خیر آبادی کی شاگرد ہیں ۔

غموں نے، مرحلوں نے، مسئلوں نے
مری جرأت بڑھائی مشکلوں نے

عالم لکھنوی ۔ عالم آرا بیگم

واجد علی شاہ کی بیاہتا بیوی ۔ صاحبِ دیوان "بیاضِ عشق" و مثنوی "مثنوی عالم" تھیں ۔ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں ۱۸۹۴ء میں انتقال ہوا ۔

گیسوئے خم دار اس کے رُخ پہ بل کھانے لگا
سینۂ عشاق پر بس سانپ لہرانے لگا

عشرت لکھنوی ۔ نواب عشرت محل

حرم واجد علی شاہ ۔ ان کے ساتھ کلکتہ چلی گئی تھیں آخر تک وہیں رہیں ۔

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ لگا اور جل گیا

عصمت لکھنوی ۔ عصمت آرا بیگم

لکھنؤ کے مشہور خانوادۂ اطبا کے فرد حکیم عبدالولی کے گھر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں ۔ تمام تر تعلیم بشمول انگریزی خانگی طور پر حاصل کی ۔ شاعری کا ذوق تھا غزلوں کے علاوہ ان کی وطنی و اصلاحی نظمیں بھی پسند کی جاتی تھیں ۔ زاہدہ خلیق الزماں سے ان کا منظوم مباحثہ مشہور ہے جو رسالہ کی شکل میں شائع بھی ہوا تھا ۔ تحریکِ خلافت و آزادی کی سرگرم کارکن تھیں ۔ اپنے بھائی حکیم محمد بشیر محمود سے اصلاح لیتی تھیں ۔ ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا ۔

ہر سانس زندگی کی کٹی یوں کسی کے ساتھ
جیسے کوئی سفر میں ہو اک اجنبی کے ساتھ

فاخرہ نقوی

مشہور شاعر و صحافی فضل نقوی ایڈیٹر "نظارہ" لکھنؤ کی شریکِ حیات، زیورِ علم سے آراستہ، خوش فکر شاعرہ تھیں غزل، قصیدہ، سلام اور نوحہ وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی کرتی تھیں ۔ نوحہ جات کے مجموعے "صبحِ کربلا"، "شفقِ کربلا" اور "شبابِ کربلا" وغیرہ شائع ہو چکے ہیں ۔ ۶ر جنوری ۱۹۹۰ء کو انتقال ہوا ۔

آنا تھا پُر درد افسانہ مرا
سننے والے ہر طرف سے آ گئے

فرحت فیض آبادی۔ فرحت بیگم

فن موسیقی میں دست گاہ رکھنے والی طوائف۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۸۵۷ء تک بقیدِ حیات تھی ؎

دل لگایا ہے تری زُلفِ رسا سے کچھ ہو
سانپ کو چھیڑ لیا اب تو بلا سے کچھ ہو

قمر بارہ بنکوی

متوطن دیوی شریف ضلع بارہ بنکی۔ سید حُسین کی دُختر اور اچھی شاعرہ ؎

اُٹھی انگڑائیاں لیتی جو گھٹا ساون کی
چلی بل کھاتی ہوئی بادِ صبا ساون کی

قمر لکھنوی۔ حیدری بیگم عُرف ماہ طلعت

مرزا ہمایوں بخت کی بیٹی اور واجد علی شاہ کی حرم تھیں۔ بے حد ذہین اور خوش مزاج۔ شعری سخن کا فطری ذوق تھا۔ فارسی و اُردو میں شعر کہتی تھیں۔ فن موسیقی میں بھی دست گاہ بہم پہونچائی تھی۔ ۱۲۸۱ھ میں کلکتہ میں انتقال ہوا ؎

دعویٰ تھا عبث یار مسیحائی کا تم کو
اچھا نہ ہوا ایک بھی بیمار تمھارا

کشن خیر آبادی ثم لکھنوی۔ کرشن پیاری

رائے پورن چند عاجز کی بیٹی۔ ۱۸۵۶ء کے قریب خیر آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئیں۔ آٹھ سال کی عمر میں معروف شاعر و ادیب منشی رام سہائے تمنا لکھنوی سے شادی ہوئی۔ تقریباً ۷ سال تمنا کی رفاقت اور مشہور محلہ نوبستہ لکھنؤ جیسے مرکز شعر و ادب میں گزارے۔ اردو و ہندی کی مشہور شاعرہ تھیں، ان کی غزلیں اور بھجن وغیرہ بہت مقبول تھے۔ ۱۹۳۴ء میں تمنا لکھنوی کی وفات کے ۲۵ دن بعد لکھنؤ میں انتقال ہوا ؎

یارب یگانۂ دو جہاں ہے تو ہی   بانیِ زمین و آسماں ہے تو ہی

کنیز لکھنوی۔ فاطمہ بیگم

دختر نصرت الدولہ کی لونڈی۔ بڑی طباع، شوخ اور حاضر جواب تھی

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے
جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائے گی

گنا لکھنوی ؎ بتایا مجھ کو زمانے نے آخرش چورنگ
کیا ہے کون سا یاروں نے مجھ پہ وار نہیں

گوہر لکھنوی۔ سیدہ گوہر بیگم

ڈاکٹر ہدایت حسین رضوی کی اہلیہ اور خبیر لکھنوی کی شاگرد۔ نوحوں کے مجموعے "بیاض گوہر"، "ریاض گوہر" اور "سراج گوہر" مطبوعہ ہیں ؎

قبر پر رو کے کہتی تھیں مادر گھر چلو پیارے اصغر یہاں سے
تم ڈرو گے اکیلے میں دلبر گھر چلو پیارے اصغر یہاں سے

گوہر لکھنوی۔ لال بی (رکشنی) ؎

حسرت و یاس و الم اور غمِ تنہائی ہے
اپنی قسمت میں یہی انجمن آرائی ہے

ماہ لکھنوی۔ منجھلی بیگم ؎

گر مقابل عارضِ جاناں کے اک دم آئے گل
شرم سے بلبل کو پھر ہرگز نہ منہ دکھلائے گل

محبوب لکھنوی۔ سلطان جہاں بیگم

واجد علی شاہ کی منکوحہ۔ اچھی شاعرہ تھیں ؎

ہے آرزو ترے ہاتھوں سے قتل ہوں میں بھی
لگی ہوئی ہے تری تیغِ آبدار میں رُوح

مخفی لکھنوی۔ امۃ الفاطمہ

آغا ہادی کے گھر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں۔ حصولِ علم کا شوق تھا، پردہ نشین رہ کر عربی، سنسکرت، ہندی، فارسی اور اُردو خانگی طور پر پڑھ کر ان سب زبانوں پر دست رس حاصل کی۔ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتی تھیں لیکن مشاعروں کی طرحوں پر غزلیں کہتی تھیں اور اگر طرح پہلے معلوم ہو جاتی تھی تو اپنی غزل بھیج بھی دیتی تھیں۔ جو مشاعرے میں کوئی پڑھ دیتا تھا۔ پُرگو و پختہ مشق شاعرہ تھیں۔ مجموعۂ کلام "تجلیاتِ مخفی" مطبوعہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال ہوا ؎

یہ سب باتیں ہیں کہنے کی نہ قاتل تھا نہ بسمل تھا
اُدھر سے تیر آتے تھے اِدھر سینہ مقابل تھا

مذنب لکھنوی۔ امین جان (طوائف)

یوسف لکھنوی کی شاگرد تھی ؎

ہوگئی ہے شام اب تو تیرے کوچے کے قریب
شب کی شب رہنے دے او ظالم ذرا منزل کے پاس

مستور لکھنوی۔ مستور بیگم

صاحبِ جائداد و لیاقت اور اچھی شاعرہ تھیں ؎

خزاں میں بھی نہ کسی سال کم ہوئی وحشت

رہا ہے اپنا گریبان بے رفو برسوں

مشتری خیرآبادی۔ قمر جان عرف منجھو

وطن خیرآباد ضلع سیتاپور تھا، لیکن ماں و خالہ کے ساتھ لکھنؤ آکر محلہ چوک میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ موسیقی میں درجہ کمال حاصل تھا۔ فارسی و اردو زبان و ادبیات پر عبور رکھنے والی فارسی و اردو کی نامور شاعرہ تھی۔ آغا علی شمس کی شاگرد و تربیت یافتہ، نظم و نثر پر قادر۔ مرزا غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ادبی محاذ قائم کرنے والی مشتری اور ان کی بہن زہرہ کو ناقدینِ غالب میں اوّلیت حاصل تھی اور ان کے تنقیدی مضامین بکثرت چھپتے تھے۔ دیوانِ فارسی اور نثری مجموعہ "خانہ خیال" مطبوعہ ہیں۔ آخر میں سید اعجاز حسین سے عقد شرعی کرلیا تھا۔ ؎

قاتل کے ہاتھ پاؤں سے سرخی نہ جائے گی

خونِ شہید ناز ہے رنگِ حنا نہیں

معشوق فیض آبادی۔ حیدری خانم ؎

پان کھا کر جو کہیں تھوک دیا اس گل نے

رشکِ یاقوت بنے باغ کے کنکر پتھر

مہک لکھنوی۔ گلشن جان (بگن جان)

امداد حسین رضا لکھنوی کی شاگرد تھی ؎

نے مزاج اپنا موافق ہے نہ بیگانہ مزاج

آج کل وحشی طبیعت ہے تو دیوانہ مزاج

ناز سیدن پوری۔ بیگم قاضی حماد حسین ؎

ہائے رے سادگی محبت کی — یہ نشیب و فراز کیا جانے

ناز سندیلوی۔ امراؤ جان (طوائف)

سندیلہ ضلع ہردوئی کی رہنے والی تھی، وہاں سے خیرآباد منتقل ہوگئی۔ شعر اچھے کہتی تھی ؎

جی بھر آیا بس اک آہ کے ساتھ

جوشِ حسرت اٹھا نگاہ کے ساتھ

ناز لکھنوی۔ اچھی بی

شاہد بازاری۔ مرزا فدا حسین فدا کی شاگرد تھی ؎

دل جل گیا حرارت داغِ فراق سے — اس آفتاب حشر کا ہوگا زوال کب

نازک فیض آبادی۔ زینت ؎

کوچے میں کوئی سسکے کوئی در پہ مرے ہے

انصاف بھی کچھ ہے تو یہ کیا ظلم کرے ہے

نشتر لکھنوی۔ قیصر بیگم ؎

کسی کے گیسوئے پرخم جو نشتر یاد آتے ہیں

مری آنکھوں میں پھرتی ہے سیاہی شام ہجراں کی

نظیرن لکھنوی

ایک پردہ نشین و عفت مآب خاتون کا تخلص تھا ؎

کیا کہیں تم سے ہم کہ کیا ہیں ہم — پاک دامن ہیں پارسا ہیں ہم

نکہت لکھنوی (نسیم نکہت)

نسیم آرا۔ سید مصطفےٰ حسین کی دختر اور زمانۂ حال کی شاعرہ۔ ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں۔ شعری مجموعہ مطبوعہ ہے ؎

ہم نوا، ہم نفس، ہم سفر زندگی — پھر بھی ہے کتنی نا معتبر زندگی

نہاں ردولوی۔ زاہدہ بیگم رزم

معروف شاعر جعفر مہدی رزم ردولوی کی شریکِ حیات اور انھیں کی تربیت یافتہ اچھی شاعرہ ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔ بیشتر کلام مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مرثیہ و سلام وغیرہ بھی خوب کہتی ہیں

ہالے میں گیسوؤں کے ہے مہتاب سی جبیں

خم دار ابروؤں پہ مہ نو کا ہے یقیں

سایہ ہے ذوالفقار کا، ہے چشم سرمگیں

باریک جلد عارضِ تاباں کی آتشیں

دو پھول ہیں بہار یہ سارے چمن کی ہے

رنگت گلاب کی ہے مہک یاسمن کی ہے

وزیرن خیرآبادی۔ وزیر بیگم (طوائف) ؎

نہیں جب ثباتِ دنیا تو مجھے ترا گلہ کیا — مرے ساتھ عہد کیونکر ترا استوار ہوتا

وصیہ جائسی۔ فاطمہ وصیہ نقوی

شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے خاندان میں ۱۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو سید وارث حسین نقوی کے گھر جائس ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ دوران طالب علمی سے ہی شاعری کا آغاز ہوگیا تھا۔ خاندان میں متعدد ممتاز شعرا موجود تھے۔ وصیہ نے مولانا کامل حسین کامل سے کلام پر اصلاح لی۔ زمانۂ حال کی خوش فکر شاعرہ ہیں ؎

دستِ طلب دراز ہو دنیا کو فکر تھی
لیکن نہ کھل سکی میری مٹھی بندھی ہوئی

وفا لکھنوی۔ عزیز بانو داراب

ڈاکٹر شریف الدین داراب کے گھر ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور اسی سے وابستہ رہیں۔ بحیثیت انگریزی لکچرر خدمات انجام دیکر تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج لکھنؤ سے سبک دوش ہوئیں۔ مقامی و غیر مقامی مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں۔

یاد۔ شاہجہاں بانو

اچھے شاعر محمد حفیظ حفیظ کے گھر ۲ فروری ۱۹۳۷ء کو گوالیار میں پیدا ہوئیں۔ عمر کا ابتدائی حصہ دہلی میں گزارا، اس کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ والد خوش فکر شاعر تھے، انھیں سے اصلاح لی اور جلد ہی ملک کے اہم مشاعروں میں شرکت کرکے ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خوش گو شاعرہ ہیں۔ شعری مجموعہ "یاد" کے نام سے شائع ہوچکا ہے ؎

آپ جب آتے ہیں لیکر کوئی غم آتے ہیں
رنج و راحت مرے نزدیک بہم آتے ہیں

ڈوبنے والوں میں اک اور اضافہ ہی سہی
ڈوبنے والو نہ گھبراؤ کہ ہم آتے ہیں

یاس فیض آبادی۔ آفتاب بیگم

اچھی شاعرہ تھیں۔ شعر خوب کہتی تھیں ؎

اُڑنے وہ بخیر یادِ شوق میں بے پر لگا
تیر تزا جس کسی کے لے پری پیکر لگا

□□

داستانِ لکھنؤ

راجندر بہادر موج

[illegible] ۱۹۶۱

آپسی اُلفت، رواداری تھی شانِ لکھنؤ
مل کے رہتے تھے سبھی باشندگانِ لکھنؤ

اللہ اللہ دیدنی تھی عز و شانِ لکھنؤ
کیا زمینِ لکھنؤ کیا آسمانِ لکھنؤ

عظمتِ ماضی کے ملتے ہیں نشاں آج بھی
کھنڈروں میں بھی لکھی ہے داستانِ لکھنؤ

لکھنوی تہذیب ملتی ہے ابھی تک جابجا
جس پہ نازاں ہیں ابھی تک ساکنانِ لکھنؤ

وہ اودھ کی شام، قیصر باغ کی بارہ دری
چوک اور نخاس سے قائم ہے شانِ لکھنؤ

ہے گورنر کے محل میں جس جگہ دربار ہال
تھی رہائش گاہِ شاہی خاندانِ لکھنؤ

مظہرِ شانِ سلف حضرت محل کا پارک ہے
آج بھی کہتے ہیں جس کو لوگ جانِ لکھنؤ

رٹ لگاتے تھے سحر دم اللہ اللہ رام رام
طائرانِ خوش نوا شیریں زبانِ لکھنؤ

لکھنؤ کا اپنا دسترخوان بھی تھا بے مثال
میہماں کے قدرداں تھے میزبانِ لکھنؤ

ٹوپی اور کرتے چکن کے پائجامے چوڑی دار
زیب تن کرتے تھے اگلے ساکنانِ لکھنؤ

عید ہو، ہولی دوالی ہو، کوئی تیوہار ہو
سب مناتے تھے انھیں پیر و جوانِ لکھنؤ

مندر و مسجد بنا کرتے تھے اکثر پاس پاس
تھی پیامِ امن ناقوس و اذانِ لکھنؤ

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی میں باہم پریم تھا
فرق کرتے ہی نہیں تھے ساکنانِ لکھنؤ

موج چند الفاظ میں وہ قید ہو سکتی نہیں
طول ہے اتنی زیادہ داستانِ لکھنؤ

سید امجد حسین
سوچنا بھون۔ لکھنؤ

اودھ کی غزل منتخبات

اودھ کی غزل کا امتیازی پہلو عام طور سے خارجیت تک محدود قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی لفظی صناعی کے ساتھ ایک طرف تو مرثیت کے اثر سے کفن، میت، کافور، گورِ غریباں، ماتم وغیرہ کی فضا اور دوسری طرف محبوب کے خارجی حسن کے تحت محض کنگھی چوٹی، مسّی، سُرمہ اور اسی طرح کے عناصر کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اگر اودھ کے منتخب شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کی غزل کے بنیادی عناصر میں سازِ طرب کے آہنگ کے ساتھ سوزِ عشق بھی تھا اور گدازِ قلب کی وہ کیفیت تھی جس سے اعلیٰ ترین شاعری عبارت ہے۔ اودھ کی غزل میں "ہزار رنگ" کا تنوع ہے اور اس میں "جلوۂ صد رنگ نہیں بلکہ شعر کے ہر رنگ میں کائناتِ رنگ و بو سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

——— لالہ موجی رام موجی

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

——— امیر ٹانڈوی

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی!

——— میر سوز

یہ وہ دور ہے کہ جس میں ہیں بزرگ خورد جتنے
انھیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا

——— مصحفی

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

——— انشا

شبِ فرقت کی حقیقت کوئی کیا جانے ہے
جس خرابی سے کٹی رات خدا جانے ہے

——— جرأت

پری ہونا ہے آساں اور پری سے حور ہو جانا
ولے مشکل ہے تجھ سا اور بُت مغرور ہو جانا

——— رنگین

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

——— عظیم بیگ

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

——— منتظر لکھنوی

آکے سجّادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

——— منور خاں غافل

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

——— میر تقی ہوس

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

——— ناسخ

موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

——— آتش

کوچۂ جاناں ہمارا اب تو مسکن ہو گیا
خار و خس اس رہ گزر کا فرشِ گلشن ہو گیا

——— میر خلیق

آنکھیں کھُلی ہوئی ہیں عجب خوابِ ناز ہے
فِتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

وزیر

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

صبا

دکھایا کُنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیّاد

رند

دُنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

رشک

عاشق ہوا زاہد بھی ترے چھوٹے سے قد کا
سچ کہتے ہیں انسان بڑا بول نہ بولے

امانت

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

آغا حجو شرف

یہ حُسن کے افشاں نظر اس مرنے جو کی تاروں پر
آسماں رشک سے لوٹا کیا انگاروں پر

انیس

وا حسرتا رہی یہ تمنّا تمام عمر
اپنا دبیر کہہ کے پُکارا نہ پیار سے

دبیر

ہم نے کیا مصالحہ اسلام و کُفر میں
پانی ملا دیا یہ زمزم میں گنگ کا

منیر شکوہ آبادی

شب کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ضامن علی جلال

ہر ایک سے یوں ربط بڑھانا نہیں اچھا مانو میرا کہنا یہ زمانہ نہیں اچھا

اسیر

کیوں کر کہیں کہ یار کی محفل اُداس ہے
کوئی نہیں اُداس میرا دل اُداس ہے

نادر آغا

تمھارے بعد یہ ہے حال ہم صفیروں کا
اِس آستاں پہ صدا دی اُدھر پُکار آئے

تعشق

لائے اس بُت کو التجا کر کے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

دیا شنکر نسیم

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا خونِ بے گنہ کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

امیر مینائی

حال سب میری سخت جانی کا باڑھ کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

سرشار

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

مضطر خیر آبادی

ہم ہیں گدائے میکدہ ہم کو کمی نہیں
سب کچھ ہمارے گھر ہے خدا کا دیا ہوا

ریاض خیر آبادی

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

صفی

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

عزیز لکھنوی

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ثاقب لکھنوی

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

حسرت موہانی

نشیمن پھُونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

بیخود

دُہائی ہے دلِ درد آشنا دُہائی ہے
کہ آہِ سرد یہ تہمت ہے دل دُکھانے کی

یگانہ چنگیزی

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
——— چکبست

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلّی رہنے دو
——— آرزو

کہہ کر کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا
——— اصغر گونڈوی

اُبھار کر مٹائے جا، بگاڑ کر بنائے جا
کہ میں ترا چراغ ہوں جلائے جا بجھائے جا
——— جوش ملیح آبادی

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
——— سراج لکھنوی

نعرۂ گرم انقلاب ہاں سُنا ہے ہم نے بھی
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دُور
——— آنند نرائن مُلّا

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ!
چند سکّے مرے ہاتھوں پہ ہیں چھالوں کی طرح
——— جاں نثار اختر

اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے
——— مجاز ردولوی

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
——— مجروح سلطانپوری

راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا بس دل کے سوا
——— علی سردار جعفری

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے
——— بہزاد

دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں ملنے والے
شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے
——— مرزا محمد ہادی رسوا

یہاں ہے تخریب زندگی میں حیاتِ تعمیرِ عشق لے دل
جہاں جہاں بجلیاں گریں گی وہیں نشیمن بنا کریں گے
——— اقبال صفی پوری

ہمیں سے سلیقے محبّت کے سیکھے
ہمیں سے چلے آج کرنے بہانہ
——— دل لکھنوی

یہ ہنگامے، یہ بزم آرائیاں کیا
نہیں ہوں یہ تو پھر تنہائیاں کیا
——— بیکل اتساہی

مہربانی، خلوص، ہمدردی
ہم نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
——— خمار بارہ بنکوی

تہذیب

"لکھنؤ میں جس تہذیب کا ارتقاء ہوا اس میں نفاست، دل کشی اور صناعت کمال کے درجے کو پہونچ گئی تھی۔

یہاں کے آداب و اسالیب میں ایسی جادوگرانہ تاثیر تھی کہ پڑھ کر اس سے عقیدت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ان آداب کی کہیں جھلک دکھائی دے جاتی ہے تو بے ساختہ تقلید کو جی چاہتا ہے، اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ شائستگی کا ایسا انداز ہے جس کو زندگی کا جزو ہونا چاہیئے"۔

——— رشید حسن خاں
(تعارف گذشتہ لکھنؤ - عبدالحلیم شرر)

فرماں روایانِ اودھ کے دور میں

تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اُردو ۔ گورکھپور یونیورسٹی ۔ گورکھپور

فرماں روایانِ اودھ کے دور سے مراد وہ عہد ہے جو اودھ میں اٹھارہویں صدی کے ربع اول میں سعادت خاں برہان الملک کی صوبے داری سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط میں واجد علی شاہ کی سلطنت کے انتزاع پر ختم ہوا۔

تقریباً ایک سو چونتیس سال کی مدت پر مشتمل، فرماں روایانِ اودھ کا یہ دور کئی اعتبار سے تاریخ ساز ہے۔ اس نے ہندوستان کو کچھ انتہائی قیمتی تحفے عطا کیے ہیں، جن میں سب سے بیش قیمت چیز وہ تہذیب ہے جسے ہم "اودھ کی تہذیب" کہتے ہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب ہے جس میں ان دونوں کے معاشرتی اجزا نے تحلیل ہو کر ایک دلکش گنگا جمنی صورت اختیار کر لی ہے۔ اودھ کی تہذیب متعدد صفات کی حامل ہے، لیکن اس کی سب سے نمایاں اور سب سے جاندار صفت اس کا مشترکہ تمدنی پہلو ہی ہے۔ یہ مشترکہ تہذیب اودھ کے حکمرانوں کے دور میں اس صوبے کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔

اودھ کے علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہار ہمیشہ بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے رہے ہیں۔ فرماں روایانِ اودھ کے دَور میں تیوہاروں کی دھوم دھام اور شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ثقافتی پہلوؤں کو بھی زبردست تاب و توانائی ملی۔ اس عہد میں تیوہاروں کے منانے کے انداز میں ایک بہت ہی اہم خوبی یہ نمایاں ہوئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے تیوہاروں کے طور طریقے اودھ کی گنگا جمنی تہذیب کے رنگ میں بھرپور طور پر رنگ گئے، اور ان کی مشترکہ تہذیبی نوعیت بہت ہی نکھر گئی۔

اودھ کے فرماں رواؤں کے زمانے میں تیوہار صرف عوام کی سطح ہی پر نہیں منائے جاتے تھے بلکہ حکومت کی جانب سے بھی انھیں منانے کا زوردار اہتمام ہوتا تھا۔ تمام اہم تیوہاروں کے مواقع پر دربار میں بھی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں اور حکومت ان پر کثیر رقم خرچ کرتی تھی۔ فرمانروایانِ سلطنت خود ان میں شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں تفریق سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ جس طرح مسلمانوں کے تیوہاروں پر حکومت کی طرف سے تقریبات کا انعقاد ہوتا تھا اسی طرح ہندوؤں کے تیوہاروں پر بھی ہوا کرتا تھا۔ چونکہ حکمرانانِ اودھ مسلمان تھے اس لیے مسلمانوں کے تیوہاروں کا حکومت کی سطح پر منایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن مسلم حکمرانوں کا ہندوؤں کے تیوہاروں کو دربار میں منانا اور سرکاری خزانے سے ان کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنا ایک بہت ہی اہم بات تھی۔ یہ مذہبی وسیع النظری اور رواداری کی شاندار مثال تھی۔

اس دور میں تیوہاروں کے موقع پر ان سے متعلق مذہبی رسوم بھی ادا کی جاتی تھیں، لیکن ان کے منانے کا عام طرز مذہبی سے زیادہ ثقافتی ہوگیا تھا۔ تمام تیوہاروں میں ہر طرف رنگ و سرود کا سماں چھا جاتا تھا۔ شہر کی آرائش و زیبائش ہوتی تھی۔ اور چراغاں و آتش بازی کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ امرا، عمائدین اور شرفا کے طبقے کے افراد ایک دوسرے کے یہاں جاتے اور مبارکباد دیتے تھے۔ اور ان کے اثر سے عوام میں بھی یہ طریقہ بڑے پیمانے پر رائج تھا۔

مذکورہ دَور میں تیوہاروں کو منانے کے سلسلے میں ایک خصوصی اہمیت کی بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ تیوہاروں کے ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی پہلو میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک کی صورتیں فروغ پذیر ہوئیں۔ ہندوؤں کے بعض تیوہار ایسے تھے جن کی کچھ مذہبی رسموں کو مسلمان بھی اپنے طور پر ادا کرتے تھے اور مسلمانوں کے کچھ تیوہاروں کی مذہبی رسوم کو ادا کرنے کا چلن ہندوؤں میں بھی تھا۔

تیوہاروں میں ہولی، مذکورہ دَور میں بڑے ہی ولولے اور جوش و خروش

کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ دربار میں بھی ہولی کے جشن کا زبردست اہتمام ہوتا تھا۔ حکمرانانِ اودھ خود ہولی کھیلتے تھے۔ آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر میر تقی میر کی "مثنوی دربیانِ ہولی" میں بھی ملتا ہے ؎

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

آصف الدولہ اور سعادت علی خاں ہولی کا جشن مناتے تھے اور اس جشن پر لاکھوں روپے صَرف کرتے تھے۔ اس میں رنگارنگ تقریبات ہوتی تھیں اور درباریوں کو قیمتی خلعت تقسیم کیے جاتے تھے۔ اودھ کے دوسرے حکمرانوں کے دربار میں بھی ہولی کے موقع پر جشن کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور کسبیوں، طوائفوں اور دوسرے فنکاروں کو نقد اور قیمتی زیورات کے انعامات دیے جاتے تھے۔ عوامی سطح پر "ہولیکا دہن" (ہولی جلنے) کے دوسرے دن صبح گلال، عبیر، زعفران اور کُم کُمے اور پچکاریوں میں رنگ بھر کر ہولی کھیلی جاتی تھی۔ طرح طرح کے سوانگ بھرے جاتے تھے اور کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔ شام کو چراغاں اور آتش بازی کی بہار ہوتی تھی۔

ہولی ہی کی طرح بسنت کا تیوہار بھی اس عہد میں ہندو اور مسلمان یکساں جوش اور جذبے سے مناتے تھے۔ فرماں روایانِ اودھ بسنت کے جشن کے سلسلے میں بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ آصف الدولہ کے دربار میں اس تیوہار کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور اس پر بھی وہ ہولی کے جشن کی طرح لاکھوں روپے خرچ کیا کرتے تھے۔ دیگر حکمرانانِ اودھ بھی بسنت کے جشن کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس روز لوگ زرد لباس پہنتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں شہر کے باہر جمع ہو کر زرد کاغذ کی پتنگ زرد رنگ کی ڈور سے اڑاتے تھے۔ اس تیوہار کے دن مسلمان گانے والے، دیگر لوگوں کے ساتھ، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے، مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور "گل شریف" ڈال کر کسی بزرگ کے مزار پر جاکر بسنت کی تہنیت اور اس بزرگ کی مدح میں اشعار گاتے تھے۔

دسہرے کی بھی، اودھ کے فرمانرواؤں کے دَور میں بڑی دھوم ہوتی تھی۔ اس تیوہار میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی "نیل کنٹھ" کے درشن کے لیے مختلف مندروں میں اور دیگر مقامات پر جاتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شہر کا حاکم اپنے گھوڑے اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگوا کر، نقرئی اور طلائی ساز و سامان اور زرنگار جھول اور عماریاں لگا کر، اپنے فوجی دستے اور ذی مرتبہ مصاحبوں کے ساتھ "نیل کنٹھ" کے درشن کرتا تھا۔ شام کے وقت رقص و سرود کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ دسہرے کے ایام میں مسلم بچے بھی ہندو بچوں کی طرح ٹیسو رائے کی مورت بنا کر اور اسے لکڑی پر لٹکا کر شام کے وقت روزانہ ہندی کے اشعار پڑھتے ہوئے دروازے دروازے جاکر پیسہ مانگتے تھے اور جو رقم جمع ہوتی تھی اس سے خاص دسہرے کے دن مٹھائی خرید کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔

دیوالی بھی فرمانروایانِ اودھ کے زمانے میں بڑی رونق اور چہل پہل کا تیوہار ہوا کرتا تھا۔ شہر کی زور دار آرائش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں سارے بڑے محلے دلھن کی طرح سجائے جاتے تھے۔ لکشمی اور گنیش کی پوجا ہوتی تھی۔ "چوک پورا" جاتا تھا اور "دیوالی بھری" جاتی تھی۔ گھر کے آنگن میں مختلف رنگ کے چاول وغیرہ سے خوبصورت نقش و نگار بنانے کو "چوک پورنا" کہا جاتا تھا۔ دیوالی کی شب کو عورتیں بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتی تھیں اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھانڈ کے کھلونے ان کے ساتھ رکھ کے، پہلے سارے گھر میں چراغاں کرتی تھیں اور پھر مکان کے اس حصے کو جہاں کھلونے مٹھائیوں کے ساتھ رکھے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ دیئوں سے سجاتی تھیں۔ اس کو "دیوالی بھرنا" کہتے تھے۔ اور بچوں کی حفاظت کے لیے اسے اچھا شگون مانا جاتا تھا۔ دیوالی کے تیوہار میں چراغاں اور آتش بازی سب سے اہم اور خاص چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ تمام گھروں میں چراغاں ہوتا تھا اور ہر طرف آتش بازیاں چھوٹتی تھیں۔ شام کو ہندو مسلمان خواص اور عوام گھر سے نکل کر روشنی دیکھنے جاتے تھے۔ دیوالی کے موقع پر قماربازی کا رواج عام تھا۔

کرشن جی کی پیدائش کا تیوہار جنم اشٹمی بھی ان تیوہاروں میں شامل تھا جنھیں اودھ کے حکمرانوں کے دَور میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ جنم اشٹمی کے دن لوگ گھر گھر کنھیا جی کے جنم کا جشن مناتے تھے۔ جگہ جگہ "رہس" کھیلے جاتے تھے۔ جن میں کرشن جی کے حالات، رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں اوپیرا کے انداز میں پیش کیے جاتے تھے۔ انھیں دیکھنے کے لیے جو لوگ اکٹھا ہوتے تھے ان میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہوا کرتے تھے۔ اور یہی نہیں بلکہ ان میں پارٹ ادا کرنے والوں میں مسلمان بھی شامل ہوتے تھے۔ اس تیوہار کے موقع پر ہندوؤں کی تقلید میں مسلمان کنس کا مجسمہ بنا کر

اس کے پیٹ میں شہد بھر دیتے تھے اور پھر اسے چاک کر کے شہد کو اس کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔

ہندوؤں کے تیوہاروں کی طرح مسلمانوں کے تیوہار بھی فرمانروایانِ اودھ کے دور میں بڑی آن بان اور بڑے ہی ولولے کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے بھی زور دار اہتمام ہوتا تھا اور عوام بھی زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تیوہاروں کی بھی مشترکہ تہذیبی نوعیت اس عہد میں بے حد روشن تھی۔

اسلامی تیوہاروں میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو جنھیں عرفِ عام میں عید اور بقرعید کہا جاتا ہے، مذکورہ دَور میں شاندار جشنِ مسرت کے طور پر منایا جاتا تھا۔ عید کے چاند کا اعلان کرنے کے لیے بندوقیں داغی جاتی تھیں۔ اور فرطِ مسرت میں بگل اور نقارے بجائے جاتے تھے۔ عید کے دن اودھ کے حکمراں ایک پُرشکوہ جلوس کے ہمراہ نماز عید ادا کرنے کے لیے عیدگاہ جاتے تھے۔ اسی جلوس میں قیمتی لباس میں ملبوس امرا، گھوڑسوار اور پیدل فوجی، اونٹوں پر بیٹھے ہوئے بندوقچی، توپ خانے اور نجیبوں کے دستے ہوتے تھے اور ان کے پیچھے کئی ہاتھی گاڑیوں کے درمیان چار ہاتھیوں والی ایک گاڑی میں فرماں روائے اودھ کی سواری ہوتی تھی۔ نماز کے بعد اسی طمطراق اور کرّوفر سے اس جلوس کی واپسی ہوا کرتی تھی۔ عیدگاہ سے واپس ہونے کے بعد دربار ہوتا تھا جس میں امرا مبارکباد اور نذریں پیش کرتے تھے اور شعرا تہنیت نامے سُناتے تھے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی "تہنیتِ عید" میں (جو انھوں نے فیض آباد میں کہی تھی اور جس میں آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کے ناظر جواہر خاں کی تعریف شامل ہے) اس عہد کی ایک عید کا حال بیان کرتے ہوئے "تیاریٔ عید" "ہنگامِ عید" اور عید کی "جاہ اور حشمت" کا تذکرہ، اور عید کے دن خوشی کے "ہر طرف" "ترقی میں" ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ ہے آج دن عید کا میری جاں — خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
....
یہ تیاریٔ عید و ہنگامِ عید — یہ جاہ اور حشمت یہ اکرامِ عید

عید کے دن امرا، خواص اور عوام سب آپس میں گلے ملتے تھے اور ایک دوسرے کے گھر جاتے تھے اور سب کے گھروں پر مہمانوں کی ضیافت سوّیوں سے کی جاتی تھی اور انھیں عطر اور پان پیش کیا جاتا تھا۔ گلے ملنے، مبارکباد دینے، لوگوں کے گھروں پر جانے، سوّیاں کھانے اور دیگر قسم کی ضیافتوں میں ہندو حضرات بھی شامل ہوتے تھے۔ عید کے دن کی کئی رسمیں ہندوؤں کے اثر سے رائج ہوئی تھیں۔ مثلاً سوّیں کا چلن ہندوؤں ہی کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ہندو لوگ "شراونی" اور "اننت چتردشی" کو سوّیں کھاتے ہیں۔ یہ دونوں تیوہار خوشی کے ہیں، عید کے روز ایک دوسرے کے گھر جانے اور کچھ کھانے کھلانے کا رواج بھی بعض محققین کی رائے کے مطابق ہندوؤں ہی کے اثر کا عطا کردہ تھا۔ یہ دونوں رسمیں ہندوؤں کے تیوہار ہولی میں عرصۂ دراز سے مروج تھیں اور عید میں ان کا چلن اسی کے اثر سے ہوا تھا۔ عہدِ مذکور میں بقرعید کا جشن بھی عید ہی کے طرز کا ہوتا تھا۔ اس روز بھی عید کے دن کی طرح شاندار جلوس کے ساتھ اودھ کے حکمراں کی سواری عیدگاہ جاتی تھی اور نماز ادا کر کے اسی انداز میں واپس ہوتی تھی۔ نماز کے بعد عیدگاہ میں حکمرانِ اودھ اونٹ کی قربانی کرتے تھے۔ اور اس کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا۔ عیدگاہ سے واپس آ کر عید ہی کی طرح دربار ہوتا تھا اور اس دربار میں بھی نذریں پیش کی جاتی تھیں اور تہنیت نامے پڑھے جاتے تھے۔ اس روز لوگوں کے گھروں پر بھی قربانی ہوتی تھی جس کا گوشت بھی بٹتا تھا اور اس گوشت سے تیار کی ہوئی لذیز غذاؤں کے تورے بھی اعزا و احباب میں بانٹے جاتے تھے۔ گھر گھر دعوتوں کا انتظام ہوتا تھا۔ عید ہی کی طرح آپس میں گلے ملنے، مبارکباد دینے، اور ایک دوسرے کے گھر جانے کے سلسلے چلتے تھے۔ جن میں ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔

مسلمانوں کا تیوہار شب برات بھی اودھ کے فرمانرواؤں کے زمانے میں بہت ہی اہم تیوہار تصوّر کیا جاتا تھا۔ یوں تو یہ ایک ایسا تیوہار ہے جس کا تعلق تاریخ اسلام کے مختلف واقعات اور مختلف اسلامی عقائد سے جوڑا جاتا ہے، مثلاً کچھ لوگ اس کا سلسلہ جنگِ احد میں پیغمبرِ اسلامؐ کے دندانِ مبارک کے شہید ہونے سے اور کچھ اشخاص، حضرت امیر حمزہ کی شہادت سے جوڑتے ہیں، اور بعض حضرات اس کو ان عقائد سے منسلک کرتے ہیں کہ اس رات کو حکمِ الٰہی سے ملائکہ رزق کی تقسیم اور عمر کا حساب لگاتے ہیں اور ہر شخص کا اعمال نامہ کھولا جاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تیوہار کے ہندوستان میں رائج ہونے کے سلسلے میں بعض لوگوں نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے

کہ اکبر اعظم نے جب اپنی ملکہ جودھا بائی کو اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو کھانا دیتے ہوئے دیکھا تو وہ اس رسم سے بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اسلام میں بھی اسی طرح کی کوئی رسم ڈھونڈی جائے، اور اس کے نتیجے میں ایک مُشیر نے شبِ برات کی بنیاد قائم کی جو مسلمانوں میں سارے ہندوستان میں رواج پاگئی۔ اودھ میں مذکورہ دَور میں شبِ برات کا تیوہار بڑے اہتمام اور بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ اس روز لوگ میٹھی چیزوں پر اپنے اپنے مردوں کے نام فاتحہ دلاتے تھے۔ حلوا پکانے اور اس پر فاتحہ دلانے کا عام چلن تھا۔ یہ حلوا عزیزوں اور دوستوں میں تحفے کے طور پر بھی بانٹا جاتا تھا۔ حلوے کے علاوہ مختلف قسم کی روٹیاں، میٹھے چاول اور دوسرے کھانے پکانے کا بھی رواج تھا جن پر مرحومین کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ ہوتا تھا۔ غربا و مساکین میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ شبِ برات کے سلسلے میں پکنے والے کھانوں میں گوشت کسی بھی صورت میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس تیوہار کے موقع پر دن میں لوگ فاتحہ دلانے اور حلوے وغیرہ کو احباب و اعزا اور غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کرنے میں مصروف ہوتے تھے اور شام کو جوق در جوق قبرستانوں میں جاکر اپنے بزرگوں کی قبروں پر روشنی کرتے تھے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ چونکہ اثنا عشری فرقے کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق یہ امام مہدی کی ولادت کا دن بھی ہوتا تھا اس لیے اودھ میں اس کی اور بھی دھوم ہوتی تھی اور اس تیوہار کو خوشی کے ایک جشن کا روپ مل گیا تھا۔ گھر گھر میں چراغاں ہوتا تھا اور طرح طرح کی آتشبازیاں چھڑائی جاتی تھیں۔

شبِ برات میں چراغاں کرنے اور آتشبازی چھڑانے کا دستور ہندوؤں کے زیرِ اثر رائج ہوا تھا۔ یہ دونوں باتیں ہندوؤں کے تیوہار دیوالی کے اثر سے مسلمانوں کے اس تیوہار میں آئی تھیں۔ اس روز کھانے پینے، چراغاں دیکھنے اور آتشبازی چھوڑنے اور اس کا نظارہ کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہوتے تھے۔ شبِ برات کے ساتھ ہی نیمہ شعبان کا جشن بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں لکڑی کی ایک کشتی بنائی جاتی تھی جسے رنگین ململ یا ریشمی زربفت کے ایسے سنہرے اور نقرئی کپڑوں سے جن کے کنارے پر زری کے کام کے کاغذی گوٹ لگی ہوتی تھی، ڈھک دیا جاتا تھا اور اس کشتی میں مٹی کے دیے جلائے جاتے تھے۔ اسے "الیاس کی کشتی" کہا جاتا تھا اور اس کو ایک بڑے جلوس کے ہمراہ، جس میں ہر مرتبے اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے تھے، باجے گاجے کے ساتھ دریا تک لے جایا جاتا تھا۔ جیسے جیسے یہ جلوس دریا کے نزدیک پہنچتا جاتا تھا اس میں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جاتی تھی۔ اس کشتی کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ پانی میں چھوڑا جاتا تھا اور اس کے ساتھ منت کی عرضیاں بھی ڈالی جاتی تھیں نیمہ شعبان کے اس جشن میں کئی باتیں، بالخصوص مٹی کے دیے جلانے اور جلوس میں باجے گاجے کی شمولیت کی رسمیں، ہندوؤں کے اثر کی دین تھیں، اور اس جشن میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھرپور طور سے شریک ہوتے تھے۔

فرماں روایانِ اودھ کے دور میں سب سے زیادہ شان و شوکت اور زور شور سے جس کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ تھا امام حسین کی شہادت کی یادگار کے طور پر منایا جانے والا محرم۔ یوں تو اس علاقے میں محرم اس دَور سے پہلے بھی منایا جاتا تھا لیکن اودھ کے فرماں رواؤں کے زمانے میں اس کو جو وسعت ملی اور اس میں جو تزک و احتشام اور جوش و خروش پیدا ہوا اس سے قبل کبھی نہیں تھا۔ حکمرانانِ اودھ چونکہ شیعہ تھے، اور شیعوں میں محرم کو بے حد اہمیت حاصل ہے، اس لیے ان کی حکمرانی کے عہد میں اس کی دھوم دھام نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ لیکن متذکرہ دور میں اسے منانے والوں میں صرف شیعہ فرقے کے لوگ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ سنی اور ہندو بھی اس کو اتنے ہی جوش اور جذبے سے مناتے تھے۔ جس طرح ہندوؤں کے تیوہار ہولی اور بسنت، اس عہد میں ہندوؤں کے تیوہار صرف ہندوؤں ہی کے تیوہار نہیں رہ گئے تھے بلکہ سب کے تیوہار بن گئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا محرم بھی ہر مذہب اور ہر فرقے سے تعلق رکھنے والوں کا ہو گیا تھا ــــ دورِ مذکور میں امام باڑوں کی تعمیر بڑے پیمانے پر ہوئی۔ مختلف فرماں رواؤں نے بھی متعدد امام باڑے بنوائے اور روسا و عمائدین نے بھی بہت سے امام باڑوں کی تعمیر کروائی۔ ان تمام امام باڑوں میں محرم کا جو اہتمام ہوتا تھا اس سے اس کو اودھ میں بے حد فروغ حاصل ہوا۔ مذکورہ عہد میں محرم کی دھوم دھام کا سلسلہ ماہِ محرم کی پہلی تاریخ سے شروع ہو جاتا تھا اور دسویں تاریخ تک چلتا رہتا تھا۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی خواتین چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیورات اُتار دیا کرتی تھیں۔ لوگ سبز اور سیاہ رنگ کے لباس پہن لیتے تھے۔ جگہ جگہ مجالسِ عزا منعقد ہوتی تھیں۔ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے جلوس نکلتے تھے۔ مجلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے اور تعزیوں کی زیارت کرنے کے لیے ماتمی لباس پہنے ہوئے لوگوں کی

بھیڑ ہر طرف رواں دواں نظر آتی تھی۔ ہندو اور مسلمان عورتیں یکجا ہو کر پُرسوز آواز میں "دہے" گاتی تھیں۔ عزاداری اور ماتم کرنے والوں کے لیے ہر فرقے کے لوگ سبیلیں لگاتے تھے اور شربت اور سبزے وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ محرم کے دنوں میں امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ قندیلیں اور لال ہری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ اور روشنی اور کارچوبی کے کام کی چمک دمک، سونے اور چاندی کے علموں اور پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے پٹکوں کی سجاوٹ، زردوزی کے کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور در و دیوار کی آب و تاب سے امام باڑے بقعۂ نور بن جاتے تھے۔ خصوصاً شب عاشور کو امام باڑوں کی آرائش اور روشنی کا اہتمام اتنا شاندار ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ محرم کے ایام میں امام باڑوں میں روزانہ دو مرتبہ مجالس عزا منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں اودھ کے حکمراں بھی ماتمی لباس پہن کر اور سر پر طاؤس کے پروں کا تاج رکھ کر بیٹھتے تھے۔ تمام فرمانروایانِ اودھ محرم کی مختلف تقریبات میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ شجاع الدولہ بڑی عقیدت اور بڑے احترام کے ساتھ عزاداری کیا کرتے تھے۔ آصف الدولہ نہایت دھوم دھام سے تعزیہ داری کرتے تھے۔ اور اکثر ماتم کرتے کرتے لہولہان ہو جاتے تھے۔ وہ کم سے کم پانچ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار رُپے سربازار تعزیے کی زیارت کے وقت نذر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد سبز لباس پہن لیتے تھے۔ اور تمام مراسم عزا بھرپور طور پر ادا کرتے تھے۔ عاشور کی شب کو وہ عوام کے گھروں میں جا کر تعزیے خانوں کی زیارت کرتے تھے اور ہر ہر جگہ کچھ چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ محرم کے جلوس میں وہ خود تاشہ بجاتے تھے ـــــ یوں تو اس دور میں محرم کے موقع پر عزاداری اس ماہ کے ابتدائی دس دنوں میں برابر جاری رہتی تھی، لیکن یکم سے دہم تک کی تاریخوں میں سے بعض تاریخیں کچھ خاص رسوم اور جلوسوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مثلاً پانچویں تاریخ کو بچوں کو امام حسینؑ کے نام پر فقیر بنایا جاتا تھا۔ یہ رسم کافی عام تھی اور بہت سے گھروں میں اسے ادا کیا جاتا تھا۔ محرم میں اس رسم کی شمولیت ہندوؤں کے اثر کی بنا پر ہوئی تھی، کیونکہ بچوں کو فقیر اور جوگی بنانا بنیادی طور پر ہندوانہ رواج ہے۔ ساتویں محرم کو حضرت قاسم کی شادی کے جشن کا جلوس اٹھتا تھا جو "مہندی کا جلوس" کہلاتا تھا۔ فرمانروانِ اودھ کے عہد میں مہندی کا جلوس شاہانہ شان سے اٹھتا تھا۔ اس میں آگے ہاتھیوں اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ جنھیں امام باڑے کے باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ سپاہی جلوس بردار اور باجے والے، امام باڑے کے صحن میں بائیں طرف سمٹنے سے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے کہ بیچ میں راستہ بن جاتا تھا۔ پہلے اندر داخل ہونے والے سامان میں چاندی کی کشتیوں میں مٹھائیاں، خشک میوے اور پھولوں کے ہار ہوتے تھے۔ اس کے بعد جھل جھل کرتے لباس پہنے ہوئے چند ملازمین شرل پر سہرے رکھے اور کچھ لوگ ہاتھوں میں گل دستے لیے ہوئے آتے تھے۔ ان کے پیچھے دلھن کی نقرئی پالکی ہوتی تھی، جس کے ہمراہ خوبصورت وردیوں میں ملبوس مشعلچی قمقموں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے چلتے تھے۔ اور ان کے ساتھ قرنا اور نفیری بجانے والوں کی چوکیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس پالکی پر سے روپے اور چاندی کے دیگر سکے نچھاور کیے جاتے رہتے تھے۔ پیچھے پیچھے ماتمی لباس پہنے عزاداروں کی ایک جماعت آتی تھی۔ کچھ لوگ حضرت قاسم کا تابوت کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے اور کچھ اشخاص ماتم کرتے جاتے تھے۔ اس تابوت کے ہمراہ زری کے چتر کے نیچے گھوڑا ہوتا تھا، جس پر حضرت قاسم کا عمامہ، خنجر، کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش رکھا رہتا تھا۔ جب یہ گھوڑا امام باڑے کے صحن میں داخل ہوتا تھا تو اس پر سونے اور چاندی کے پھول نچھاور ہوتے تھے جن کو غربا لوٹ لیتے تھے آخر میں مجلس عزا منعقد کی جاتی تھی۔ محرم میں مہندی کا جلوس اٹھانے کی رسم بھی ہندوؤں اور ہندوستان کے اثر کی مرہونِ منت تھی، کیونکہ شادی کے سلسلے میں مہندی کا رواج خالص ہندوستانی تھا۔ جس طرح محرم کی ساتویں تاریخ کو حضرت قاسم سے منسوب کیا گیا تھا اُسی طرح آٹھویں تاریخ حضرت عباسؑ سے منسوب ہو گئی تھی۔ اس تاریخ کو حضرت عباسؑ کا علم نکلتا تھا، اور اس میں خاص بات یہ ہوتی تھی کہ امرا، رؤسا اور عوام، سب کے جلوس میں حضرت عباس کا علم تانبے کا ہوتا تھا۔ دسویں محرم کو تعزیے اٹھتے تھے۔ تعزیہ ہندوستانی چیز ہے۔ اس کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی اور اسی ملک میں اس کو مقبولیت ملی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ تیمور ہر سال محرم کے موقع پر امام حسینؑ کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا۔ جب اُس نے ہندوستان پر حملہ کیا تو جنگ کے دوران ہی محرم کا چاند نمودار ہوا، اور چونکہ اُس وقت اس کے لیے مرقدِ حسینؑ پر پہنچنا ناممکن تھا اس لیے اس نے اپنے مشیروں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے امام حسینؑ کے روضہ کی شبیہ

بنوائی اور اُس کے سامنے سوگ مناکر اپنی عقیدت مندی کو تسکین دی۔ وہی شبیہ تعزیے کی بنیاد بنی۔ تیمور نے جو شبیہ بنوائی تھی وہ روضۂ حسینؑ کی ہو بہو نقل رہی ہوگی، لیکن آگے چل کر تعزیے کی شکل وصورت میں تبدیلی آئی اور اس کی ساخت میں ہندوانہ طرز نمایاں ہوا۔ لکھنؤ میں عہدِ قدیم میں جو تعزیے مروج تھے ان کا اوپری حصہ یعنی قُبّہ، مندر سے ملتا جلتا ہوتا تھا اور نیچے کی منزل میں تربت کی شکل کا ایک نمونہ الگ سے بناکر رکھ دیا جاتا تھا۔ تعزیے کی اس شکل کے وجود میں آنے کے سبب کے متعلق یہ قیاس ہے کہ جب ہندوؤں نے محرم منانا شروع کیا ہوگا تو انھوں نے پہلے پہل اسی قسم کا تعزیہ بنایا ہوگا اور پھر اسی کا عام طور سے چلن ہوگیا۔ اودھ کے حکمرانوں کے زمانے میں بالعموم اسی شباہت کے تعزیوں کا رواج تھا۔ اس دور میں مختلف حیثیت کے لوگ مختلف چیزوں کے تعزیے بنواتے تھے۔ چاندی سے لے کر لکڑی اور کاغذ تک کے تعزیے بنتے تھے۔ کچھ لوگ ہاتھی دانت اور صندل اور صنوبر کی لکڑی کے تعزیے بھی بنوایا کرتے تھے۔ دسویں محرم یعنی یوم عاشورہ کو طلوعِ آفتاب ہی سے تعزیے اٹھنے لگتے تھے۔ ہر طبقے کے افراد تعزیہ داری کرتے تھے اور تعزیے اٹھاتے تھے۔ ہندوؤں کے تعزیے بھی بکثرت ہوتے تھے۔ طوائفیں بھی تعزیے کا جلوس نکالتی تھیں جس میں وہ خود مرثیے اور نوحے پڑھتی تھیں اور انھیں کے لیے لوگ بڑی تعداد میں اُن کے جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ تعزیوں کے تمام جلوسوں میں زبردست بھیڑ ہوتی تھی۔ شیعہ، سنّی، مسلمان ہندو، امیر غریب، عورت مرد، چھوٹے بڑے، سب کا ہجوم تعزیوں کے جلوسوں کو دیکھنے اور ان میں شامل ہونے کے لیے اُمنڈ پڑتا تھا۔ سارے تعزیوں کو بڑی دھوم دھام سے ڈھول، تاشے، جھانجھ کے ساتھ کربلا لے جایا جاتا تھا۔ معمولی تعزیے کربلا میں دفن کردیے جاتے تھے اور دولت مندوں کے قیمتی تعزیوں کو واپس لاکر امام باڑوں میں محفوظ کردیا جاتا تھا۔ کربلا میں تعزیے دفن کرتے وقت تجہیز و تکفین کی تمام رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ وہاں سے واپس اپنے گھروں پر آکر تعزیہ دار بلا امتیاز مذہب وملت غربا و مساکین میں خیرات تقسیم کیا کرتے تھے ــ مذکورہ عہد میں محرم کے تیوہار میں ہندوستانی عناصر اور ہندوؤں کے اثرات کی جلوہ سامانیوں، اور اس کی تمام مذہبی اور دیگر نوع کی رسوم میں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کی بھرپور شرکت کی بنا پر اس کا مشترکہ تہذیبی رنگ روپ روز روشن کی طرح عیاں تھا۔

فرماں روایانِ اودھ کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام اہم تیوہاروں کے منانے کا جو انداز تھا اس نے ایک طرف تو خود ان تیوہاروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت کو زبردست نکھار بخشا اور دوسری جانب اس سے اودھ کی مشترکہ تہذیب کو بھی بڑی آب وتاب ملی۔

□□

ملیح آباد تہذیب وثقافت کے آئینے میں ص۱۲۸ کا بقیہ

کتنے شاعر چھپے ہوئے ہیں۔ محتاج تعارف نہیں۔

۴۔ چوتھی جلیل القدر ہستی مولانا عبدالرزاق معروف مولانا ملیح آبادی کی ہے۔ جنھوں نے مصر سے واپسی پر اڑتیس سال مولانا آزاد کے ساتھ گزارے ان کے الہلال و البلاغ میں کام بھی کیا۔ مگر ان کا انداز تحریر قطعی اختیار نہیں کیا بلکہ اردو صحافت کو عرش سے فرش پر لے آئے اور عوام کی زبان میں آسان وسادہ انداز اختیار کرکے جدید اردو صحافت کی بنیاد رکھی اور اپنے ہر اخبار کا نام ھند، ہفتہ وار ھند، روزانہ ھند اور آزادی کے بعد آزاد ھند اور پھر انھیں کی ادارت میں انڈین کلچرل کونسل سے نکلنے والا عربی خبرنامہ ثقافت الہند نکلا تو عربی دنیا میں بھی دھوم مچادی۔ عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کرکے بائبل کے ترجمے کے معیار کو برقرار رکھنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ آزاد ھند آج بھی ان کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے نکل رہا ہے۔

مگر ملیح آباد کی اصل شہرت کے مالک پھل ثمرِ بہشت یعنی آم کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے ــــ موجودہ قلمی آموں کو رواج دینے کا سہرا عبدالحمید خاں قندھاری کو ہے۔ جنھوں نے دسہری کو عالمگیر شہرت دی اور ۱۸۸۰ء میں دوسو بیگھا بختہ پر دسہری کے باغات تیار کیے۔ اس وقت کے دسہری کے درخت اب تک موجود ہیں۔ پھر نئی نئی آم کی اقسام پیدا کرنے کے طریقے ایجاد کرکے سو سے زیادہ اقسام خود پیدا کیں اور پورے ملک سے اعلیٰ درجے کے آموں کے قلم منگوائے۔ نوابینِ بنگال جنھوں نے آم کی اعلیٰ قسمیں تیار کی تھیں مرشد آباد سے سب قسمیں ملیح آباد منگالیں اور رحمٰن کھیڑا کو گلزار رحمانی کے نام سے شہرت دے دی جو انھوں نے اپنے پیر فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے نام پر رکھا تھا۔ انہی کے نام کی برکت سے آج رحمان کھیڑا اسوائل کنزرویشن اور مینگو ریسرچ کا بڑا مرکز ہے جس کا تعلق مرکزی سرکار سے ہے

□□
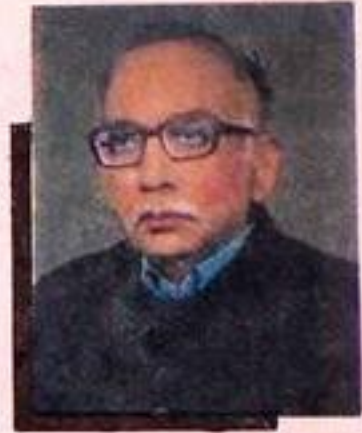
محمد اسحٰق صدیقی

بی ۱۳۹/۱- رویندر گارڈن، علی گنج سیکڑ ای
لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰

لکھنؤ کے اِمامباڑے

لکھنؤ ان شہروں میں سے ہے جن کی اپنی الگ ایک پہچان ہے۔ زمانۂ شاہی کے سیاح لکھنؤ کو باغات کا شہر کہتے تھے۔ وہ لکھنؤ کے امام باڑوں اور محرم کے مدّاح تھے۔ باغات تو باقی نہ رہے۔ امام باڑے البتہ باقی ہیں۔ اس لیے اگر لکھنؤ کو امام باڑوں کا شہر کہا جائے تو بجا ہے۔

زمانۂ شاہی میں لکھنؤ کا شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جہاں دو چار قابلِ ذکر امام باڑے موجود نہ ہوں لیکن ان میں سے بیشتر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شہید ہو گئے۔ جو بچ رہے ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوابینِ اودھ کو عزاداری سے کتنا شغف تھا۔ اسلامی فنِ تعمیر میں مسجدوں اور مقبروں کے بعد امام باڑوں کا ایک اہم مقام ہے اور یہ اضافہ نوابینِ اودھ کے مذہبی انہماک اور سرپرستی کا نتیجہ ہے۔

اگر امام باڑوں کی آرائش اور رونق دیکھنا ہے تو محرم میں دیکھیے۔ سال کے گیارہ مہینے تو ان کے آرام کا زمانہ ہے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی وہ جاگ اٹھتے ہیں۔ جس نے محرم میں بڑے امام باڑے، چھوٹے امام باڑے اور شاہ نجف کی روشنی دیکھی ہے۔ موم کی ضریح اور تعزیوں کے شاندار جلوس دیکھے ہیں وہ محرم کی تمدنی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ (یہ جلوس جن میں زمانۂ شاہی کی عزاداری کی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی تھی ۱۹۷۶ء سے بند ہیں۔)

لکھنؤ کے محرم کا مقابلہ اگر کسی تہوار سے کیا جا سکتا ہے تو وہ میسور کا دسہرہ ہے۔ دونوں کی بنیاد حق و باطل کی جنگ پر ہے۔ دسہرے کا اختتام "وِجے دشمی" پر ہوتا ہے اور محرم کا عشرہ پر۔ دونوں دس دن منائے جاتے ہیں۔ رام (خیر مجسّم) راون (پیکرِ شر و فساد) پر فتح یاب ہوتے ہیں اور امام حسین یزید کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو کر فتح مبین حاصل کرتے ہیں۔ زمانۂ شاہی میں لکھنؤ کی عزاداری میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ شاید اس کی وجہ تاریخ کے دو اہم واقعات کی مماثلت اور یکساں انجام تھا یعنی باطل پر حق کی فتح۔

امام باڑہ اس عمارت کو کہتے ہیں جو عزاداری کے لیے مخصوص ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ عزاداری کے لیے امام باڑہ بنایا ہی جائے۔ ایک غریب آدمی تخت یا چوکی پر چاندنی بچھا کر تعزیہ رکھ سکتا ہے۔ دیوار کی الماری یا طاق میں چھوٹا سا تعزیہ سجا سکتا ہے۔ اگر مکان میں کئی کمرے ہوں تو ایک کمرہ تعزیے کے لیے وقف کیا جا سکتا ہے جیسے شمالی ہند میں "تعزیہ خانہ" اور دکن میں "عاشور خانہ" اور "امام بارگاہ" کہتے ہیں۔ جو عمارت عزاداری کے لیے وقف ہوا سے ایران میں "حُسینیہ" کہا جاتا ہے، گنگا جمنی تہذیب کے حامل اہلِ لکھنؤ نے اسے امام باڑہ کہا۔

محرم کے علاوہ سال کے دوسرے ایام میں بھی امام باڑوں میں مجلسیں ہوتی ہیں عام طور پر جمعرات کو۔ چہاردہ معصومین کے یومِ ولادت کے موقع پر محافل منعقد ہوتی ہیں اور یومِ وفات پر مجالس۔ بعض مجلسیں کسی کے مرنے پر ایصالِ ثواب کے لیے ہوتی ہیں۔ انتقال کے بعد پہلے یومِ وفات پر برسی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر سال دبیہ ہوتا ہے۔

بعض امام باڑوں میں قبریں نظر آتی ہیں۔ یہ وہ امام باڑے ہیں جہاں بنوانے والے اپنی وصیت کے مطابق دفن کیے گئے۔ بعض امام باڑے بطور مقبرہ تعمیر کیے گئے۔ بعض امام باڑے افرادِ خاندان کا مدفن ہیں اور بعض میں معاوضہ یا قیمت دے کر قبریں میسر ہو سکتی ہیں۔

عام طور پر امام باڑے کے تین حصّے ہوتے ہیں: شہ نشین، جہاں ضریح تعزیے اور علم آراستہ کیے جاتے ہیں۔ یہ حصہ بہ لحاظِ ادب اتنا اونچا ہوتا ہے کہ حاجت مند ہاتھ آسانی سے اندر پہنچ سکتے ہیں، سر نیاز خم کیا جا سکتا ہے، آنکھیں بچھائی جا سکتی ہیں اور لب بوسہ لے سکتے ہیں۔

شہ نشین کے آگے دالان ہوتا ہے جو مجلس کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس میں فرش پر دری، چاندنی یا قالین بچھے ہوتے ہیں۔ خاص چیز منبر ہے۔

یہ ایک خاص وضع کا لکڑی کا زینہ ہوتا ہے جس پر بیٹھ کر مرثیہ گو یا ذاکر اس انداز سے واقعۂ کربلا کی تفصیل بیان کرتا ہے کہ اگر انسان کا ضمیر زندہ ہو، حق و باطل میں امتیاز کر سکے اور سینے میں دل کی جگہ پتھر نہ ہو تو آنکھوں میں آنسو آہی جاتے ہیں۔ یہ آنسو سوگوارانِ حسین کی نگاہ میں موتیوں سے زیادہ قیمتی اور انسانیت کی دلیل اور وسیلۂ نجات ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجلس میں شریک ہونے والے اتنے زیادہ ہوں کہ ایک دالان میں نہ سما سکیں۔ اس لیے ایک دالان کے سامنے دوسرا دالان یا برآمدہ ہوتا ہے اور جب وہ بھی بھر جاتا ہے تو بعد میں آنے والے صحن میں بیٹھتے ہیں، حفاظت کے لیے امام باڑے کے گرد چہار دیواری ہوتی ہے جس میں آمد و رفت کے لیے ایک یا دو پھاٹک ہوتے ہیں۔

امام باڑے کی عمارت میں سامنے کے رُخ پر پانچ در ہوتے ہیں جو پنجتن پاک (محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حُسینؑ) کی یاد دلاتے ہیں۔ امام باڑے کے دونوں طرف صحنچیاں ہوتی ہیں جن میں بارہ امام کے لحاظ سے بارہ در ہوتے ہیں۔

امام باڑے دو طرح کے ہوتے ہیں: عوامی اور نجی۔ عوامی سے مراد وہ امام باڑہ ہے جہاں ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملّت شریکِ مجلس ہو سکتا ہے یا امام باڑے کی زیارت کر سکتا ہے۔ نجی سے مراد وہ امام باڑہ ہے جو مکان کا ایک حصّہ ہو۔ جہاں صاحبِ خانہ کی اجازت یا مدعو کیے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ امام باڑے کے مردانہ اور زنانہ دو حصّے بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے لکھنؤ اور دہلی کی تاریخی عمارتوں میں خاص فرق یہ ہے کہ دہلی کی عمارتیں پتھر کی بنی ہیں۔ لکھنؤ میں پتھر نہ ہونے اور بار برداری کے مصارف سے بچنے کے لیے عمارتیں (جن میں امام باڑے بھی شامل ہیں۔) لکھوری، اینٹوں اور لال چونے سے بنائی گئیں۔ مضبوطی کے لیے گارے میں پسی ہوئی سیپیں، ماش کی دال، شیرہ (راب) اور گڑ ملایا گیا۔ دہلی کے سنگ تراش پتھر کاٹ کر مختلف وضع کے ستون اور محرابیں بناتے اور گُل بوٹے تراشتے تھے۔ لکھنؤ کے معماروں نے محرابوں کی آرائش کے لیے مسالے سے گُل بوٹے، بیلیں اور مچھلیاں بنائیں۔ بیرونی دیواروں کو سپاٹ چھوڑنے کے بجائے مسالے سے خاص وضع کی کھڑکیوں (VENETIAN-BLIND) کی نقلیں بنائیں۔ اس اُبھری ہوئی آرائش کو مُنبت کاری (STUCCO — WORK) کہتے ہیں۔ اسے آپ مختلف امام باڑوں اور مسجدوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ لکھنؤ کی چکن میں اس کام کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس تمہید کے بعد لکھنؤ کے موجودہ امام باڑوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) امام باڑۂ آصفی

یہ شہرۂ آفاق امام باڑہ نواب آصف الدولہ (زمانۂ حکومت ۱۷۷۵ء – ۱۷۹۷ء) نے بنوایا تھا۔ اسے عام طور پر بڑا امام باڑہ کہتے ہیں۔ یہ حسین آباد کے چھوٹے امام باڑے سے کچھ دور سڑک کے کنارے واقع ہے۔ دونوں کے درمیان ایک نہایت عالیشان پھاٹک نظر آتا ہے جسے رومی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں عمارتیں لکھنؤ کی شان ہیں۔ بڑا امام باڑہ ہندوستان میں اسلامی فنِ تعمیر کا آخری شاہکار ہے۔

اس امام باڑے کی تعمیر کا آغاز ۱۷۸۴ء میں دورانِ قحط رعایا پروری کے لیے ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قلعے جیسی یہ عمارت برسوں میں تیار ہوئی ہوگی۔ تاریخِ تعمیر یہ ہے ؎

آستانِ شہید ابنِ شہید (۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء)

اس حیرت انگیز عمارت کا نقشہ کفایت اللہ شاہ جہاں آبادی نے بنایا تھا، لیکن افسوس کہ اب یہ نقشہ موجود نہیں ہے ــــ اگر ہوتا تو امام باڑے کی بھول بھلیاں کا بھید کُھلتا اور زمین دوز راستوں کے راز معلوم ہوتے۔ امام باڑے کی تعمیر کی لاگت کا اندازہ اس زمانے کے ڈیڑھ کروڑ روپے کیا جاتا ہے۔ کام کرنے والوں کی تعداد ... ۲۲ بیان کی جاتی ہے۔

حسین آباد سے بڑے امام باڑے کی طرف آنے پر رومی دروازے کا سامنے کا رُخ نظر آتا ہے۔ یہ بڑے امام باڑے میں داخلے کا خاص دروازہ ہے۔ اس میں تین بلند و بالا در ہیں۔ بڑے بڑے ٹرک سامان سے لدے درمیانی در سے بہ آسانی گزرتے ہیں۔ چھوٹی سواریاں اور پیدل چلنے والے اطراف کے دروں سے آتے جاتے ہیں۔

رومی دروازہ پار کرنے کے بعد دائیں جانب امام باڑے کا پہلا پھاٹک نظر آتا ہے جس میں تین دَر ہیں، سڑک کے پار اس کے مقابل بائیں جانب کا پھاٹک اس کا جواب ہے جسے نوبت خانہ کہتے ہیں۔ پھاٹک میں جانے کے بعد ایک کشادہ صحن نظر آتا ہے جس کے بیچ میں گول سبزہ زار ہے اور دونوں جانب راستے ہیں۔ اس صحن کے سرے پر پتھر کے ۱۹ زینے ہیں جن پر چڑھ کر ایک دوسرا پھاٹک ملتا ہے۔ اس میں بھی تین در ہیں۔ بیچ کا در آمد و رفت کے لیے کھُلا ہے۔ (اطراف کے در بند ہیں۔ ان کے سامنے اور زینوں پر خوش نما پودوں کے گملے سجے ہیں۔) اس پھاٹک سے گزرنے کے بعد دوسرا باغ و بہار صحن ملتا ہے جس کے دائیں طرف آصفی مسجد اور بائیں جانب باؤلی ہے۔ سامنے امام باڑے کی عالیشان عمارت ایک بلند چبوترے پر بنی ہے۔ اس چبوترے کے سامنے پتھر کے ۱۸ زینے ہیں۔ سامنے کے رُخ صحنچیوں کے دروازے ملا کر کل ۱۳ در ہیں (۳ + ۷ + ۳) جن میں جالی دار لکڑی کے دروازے انگریزی دورِ حکومت کا اضافہ ہیں۔

امام باڑہ بظاہر ایک لیکن درحقیقت تین منزلہ عمارت ہے جس کے تین درجے ہیں: پشت پر نیرہ دروں والی شہ نشین اور سامنے والا دالان۔ شہ نشین کی زینت بیش قیمت تعزیے اور عَلم ہیں۔ مرکزی دالان کی اندرونی لمبائی ۱۶۳ فٹ، چوڑائی ۵۳ فٹ اور بلندی ۵۰ فٹ ہے۔ اس کی دیواریں ۱۶ فٹ موٹی ہیں۔ اتنے بڑے ہال کی چھت میں سہارے کے لیے کہیں بھی لوہے یا لکڑی کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ چھت قالب دار ہے یعنی اس کا وزن کمان دار ڈاٹوں پر بانٹا گیا ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ہال ہے۔ اور اس کی چھت کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شہ نشین اور دالانوں کے دونوں جانب جو صحنچیاں ہیں، ان کی اونچائی ۵۲ فٹ اور دیواروں کی موٹائی ۱۶ فٹ ہے) مرکزی دالان کے وسط میں نواب آصف الدولہ کی قبر ہے۔ اور ان کے پہلو میں ان کی زوجہ شمس النساء بیگم دفن ہیں۔ اس دالان کے سامنے ایک دوسرا دالان ہے۔ یہ دونوں دالان جو مجالس کے لیے وقف ہیں نہایت خوش نما اور بیش قیمت جھاڑ فانوس سے آراستہ ہیں، بعض چھت سے لٹک رہے ہیں اور بعض فرش پر رکھے ہیں۔ یہ بلجیم اور انگلستان کے بنے ہیں۔ ان کے علاوہ شہ نشین کے سامنے چند بہت بڑے آئینے آراستہ ہیں جن کے فریم سنہری ہیں۔ جو شیشہ آلات موجود ہیں وہ برائے نام ہیں۔ بیشتر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہو گئے۔ محرم میں جب یہ روشن کیے جاتے ہیں تو امام باڑے میں رنگ و نور کا سیلاب آ جاتا ہے۔

آٹھویں اور نویں محرم کو اس امام باڑے میں روشنی کی جاتی ہے (انھیں تاریخوں میں چھوٹے امام باڑے اور شاہ نجف میں بھی روشنی ہوتی ہے) ۶ محرم کو آگ کا ماتم ہوتا ہے۔ روشنی اور آگ کا ماتم دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔

آصفی امام باڑے میں پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل کی چھت تک بھول بھلیاں ہے جس کے راستے اور دَر یکساں ہیں۔ دروں کی اونچائی اور راستوں کی چوڑائی اتنی ہے کہ بہ یک وقت ایک تندرست انسان گزر سکتا ہے۔ دَروں کی تعداد ۴۸۹ اور راستے ہزار بیان کیے جاتے ہیں۔ روشنی اور ہوا کی رسائی کے لیے دیواروں میں جا بجا روشن دان ہیں۔ راستے میں کہیں زینوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کہیں اُترنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راستے مختلف بلندیوں پر ہیں۔

بھُول بھُلیاں میں جانے کا راستہ امام باڑے کے باہر بائیں جانب ہے (باہر سے اندر آنے کے لحاظ سے) اگر گائڈ ساتھ نہ ہو تو انسان گھنٹوں بھٹکتا رہے۔ اور باہر نہ نکل سکے۔ کہا جاتا ہے کہ امام باڑے کی موٹی موٹی دیواریں اور محرابوں کے پائے بھی کچھ کھلے ہیں۔ ان میں بھی بھُول بھلیاں کا کچھ حصّہ ہے۔ اسی طرح فرش کے نیچے تہ خانے اور پُر پیچ راستے ہیں۔ ان میں جو گیا کبھی واپس نہ آیا۔ اسی لیے انھیں احتیاطاً انگریزی دورِ حکومت میں بند کر دیا گیا۔

امام باڑہ، بھُول بھُلیاں، باؤلی اور رومی دروازہ دیکھنے کے لیے دن بھر لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ بھیڑ میں مقامی، ملکی اور غیر ملکی ہر طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ یہ لکھنؤ کی واحد عمارت ہے جسے دیکھنے کے لیے بیرونی سیاح خاص طور سے آتے ہیں۔

آصفی امام باڑہ اور اس سے متعلقہ عمارتیں محکمۂ آثارِ قدیمہ اور حسین آباد ٹرسٹ کی نگرانی میں ہیں۔

(۲) امام باڑہ حسین آباد

اسے عام طور پر چھوٹا امام باڑہ کہتے ہیں۔ اسے اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ نے ۱۸۳۷ء میں بنوایا تھا۔ یہ بڑے امام باڑے سے کچھ دور اس سڑک پر واقع ہے جو حسین آباد سے ٹھاکر گنج جاتی ہے۔ اس کے شروع اور آخر میں سڑک پر تین دروں والے دو پھاٹک ہیں۔ امام باڑہ سڑک کے بائیں جانب ہے۔ اندر جانے کے لیے سہ درہ پھاٹک ہے۔ اس پھاٹک کا جواب سڑک کے داہنی جانب ہے۔ اُسے نوبت خانہ کہتے ہیں۔

پھاٹک میں داخل ہونے پر ایک لوہے کا گیٹ ملتا ہے جس کے اوپر ایک سُنہری مچھلی نصب ہے جو ہَوا کا رُخ بتاتی ہے۔ اس پھاٹک کے دونوں جانب دو حسین عورتوں کے سنہری مجسّے نصب ہیں جن کا لباس یونانی ہے۔ ہر عورت لوہے کی ایک لمبی زنجیر تھامے ہے جس کا دوسرا سرا پھاٹک کے بالائی حصّے سے بندھا ہے۔

مچھلی والے پھاٹک کے آگے ایک وسیع صحن کے دونوں جانب باغ ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک نہر (مستطیل حوض) ہے جو فوّاروں سے آراستہ ہے درمیان میں لوہے کا آرائشی پل ہے۔ اس پُل کے آگے پہلے ایک کشتی پر دُلدُل کا مجسمہ تھا جو عرصہ ہوا آندھی طوفان میں ٹوٹ گیا۔ اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔

امام باڑے کے صحن کے داہنی گوشے میں ایک خوشنما چھوٹی مسجد اور بائیں جانب شاہی حمام ہے۔ (آصفی امام باڑے میں داہنی جانب ایک بڑی مسجد اور بائیں جانب باؤلی ہے۔) امام باڑے کے دونوں جانب غلام گردش ہے جس کے داہنی طرف کے ایک حجرے میں دُلدُل کا اصطبل ہے۔

نہر کے دونوں جانب تاج محل سے مشابہ دو چھوٹی عمارتیں ہیں۔ داہنی جانب والی عمارت کو شہزادی کا مقبرہ کہتے ہیں۔ اس میں محمد علی شاہ کی بیٹی دفن ہیں جن کا صغر سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ بائیں جانب اس مقبرے کا جواب ہے۔

صحن کے سامنے دوسرے سرے پر امام باڑے کی عمارت ایک قد آدم اونچے چبوترے پر بنی ہے جس کے دونوں جانب زینے بنے ہیں اور بیچ میں ایک خوشنما حوض ہے۔

امام باڑے کی عمارت کے تین درجے ہیں: شہ نشین، مرکزی دالان اور اگلا دالان (یا کمرہ) جو آگے کو نکلا ہوا ہے۔ اگلے دالان میں سامنے کے رُخ پانچ در ہیں۔ اس کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں جن میں اوپر نیچے پانچ پانچ دَر ہیں۔ عمارت کی پیشانی اور محرابوں پر خطِ نسخ میں کتبے ہیں۔ مرکز میں تاریخِ تعمیر درج ہے ؎

شہِ زمانہ محمد علی بنا فرمود　　امام باڑہ پئے ذکرِ مجلسِ حسنین
ندوئے آہ دلم خواند نوحہ تاریخ　　بنارِ تعزیہ و ماتمِ امامِ حُسین ۱۲۵۳ھ

دھوپ میں چمکتا سنہرا گنبد امام باڑہ کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اس میں کمرخ کی جیسی پھانکیں ہیں۔ تاج محل سے مشابہ عمارتوں کے کلس کے نیچے کے حصّے بادشاہ کے تاج کی نقل ہیں۔ اُن کی سنہری چمک ماند پڑ گئی ہے اور بعض حصّے مرمت طلب ہیں۔

شہ نشین میں (بائیں سے داہنی کو) موم کی ضریح، صندل کا تعزیہ، چھوٹے منھ کی بوتل میں ہاتھی دانت کی ضریح، درمیانی در میں چاندی کا روضۂ امام حسین، صندل اور ہاتھی دانت کے بنے امام رضا کے روضے اور قیمتی عَلَم قابلِ دید ہیں۔

شہ نشین کے سامنے مرکزی دالان کے وسط میں داہنی طرف محمد علی شاہ کی قبر ہے اور بائیں طرف ان کی والدہ (ملکۂ عالیہ) کی۔ کچھ دور پر زیرِ شامیانہ چاندی کا منبر نظر آتا ہے۔ فرش نہایت خوشنما سنگِ مرمر (سفید) سنگِ موسیٰ (سیاہ) اور سنگِ عیسیٰ (زرد) کا بنا ہے۔ دیواریں خطاطی کے بہترین نمونوں اور طغروں سے آراستہ ہیں۔ سنہری فریم والے آئینے بھی قابلِ دید ہیں۔

درگاہ
حضرت عباسؑ
لکھنؤ

بارہ دری
قیصر باغ
لکھنؤ

دار العلوم
ندوۃ العلماء
لکھنؤ

△ مسجد ارشاد حسین (موسومہ مسجد چودھری صاحب) رُدولی
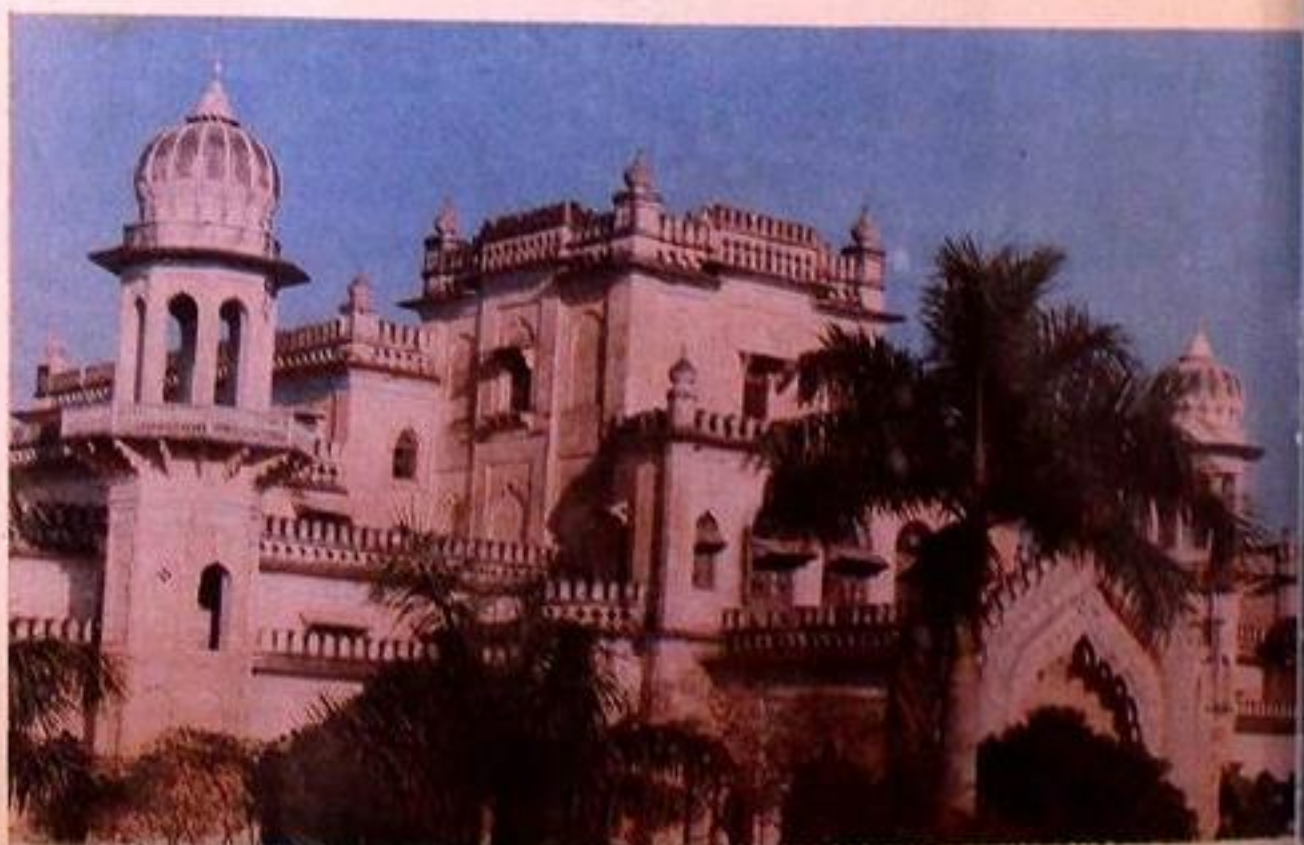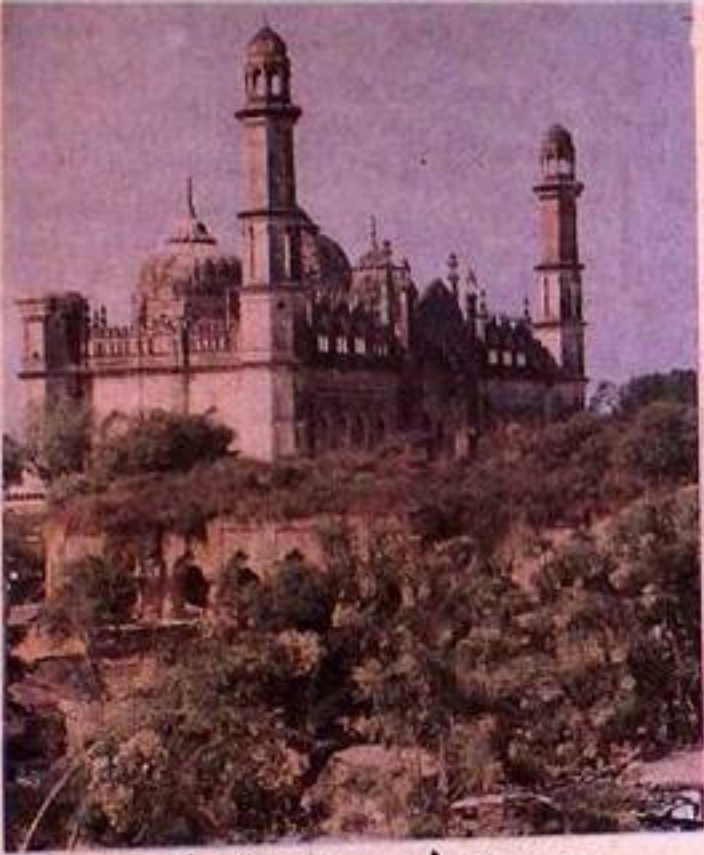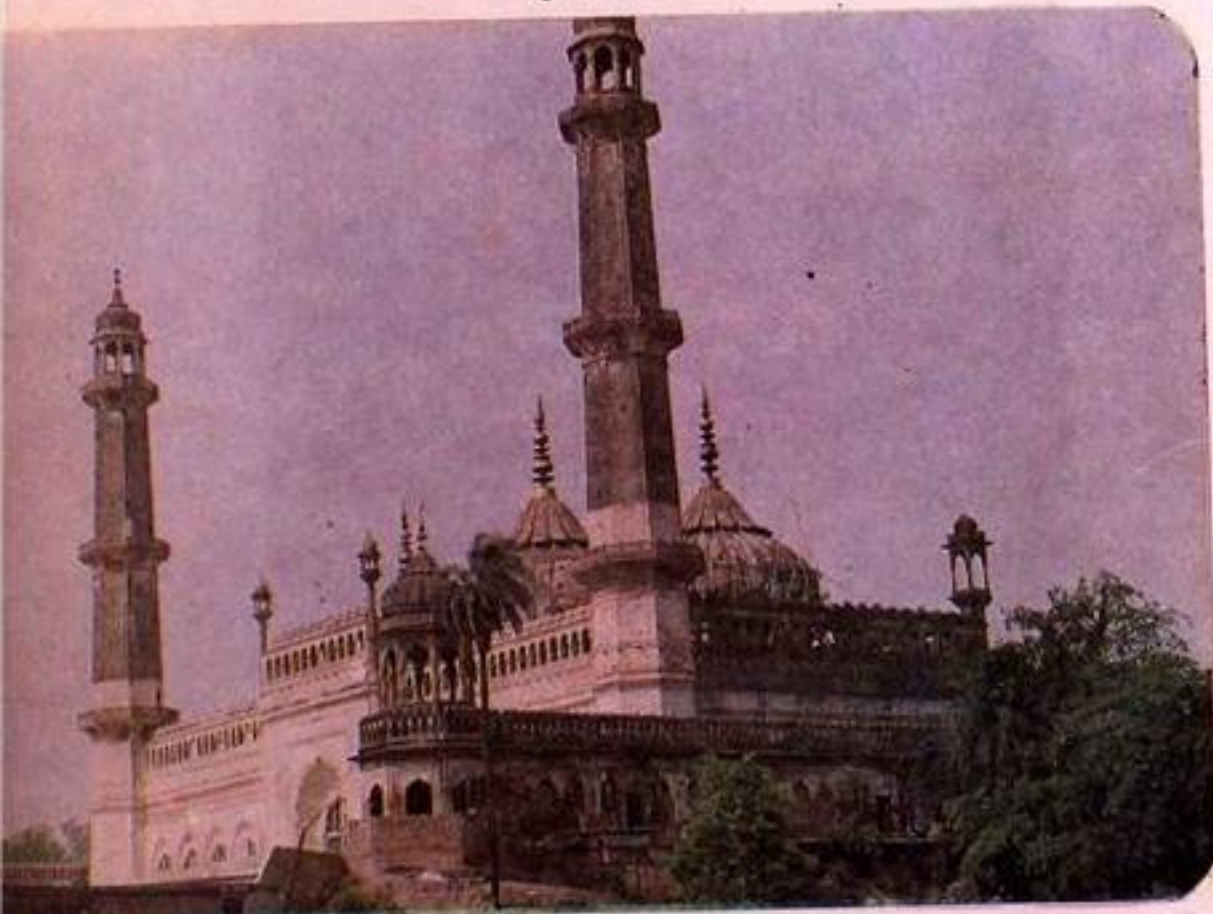
△ شاہی مسجد حسین آباد لکھنؤ

مسجد آصفی
اندرون امامباڑہ
آصفُ الدولہ
لکھنؤ ◀

گھنٹہ گھر
حُسین آباد
لکھنؤ
▽

▽ لال بارہ دری متصل لکھنؤ ہائی کورٹ
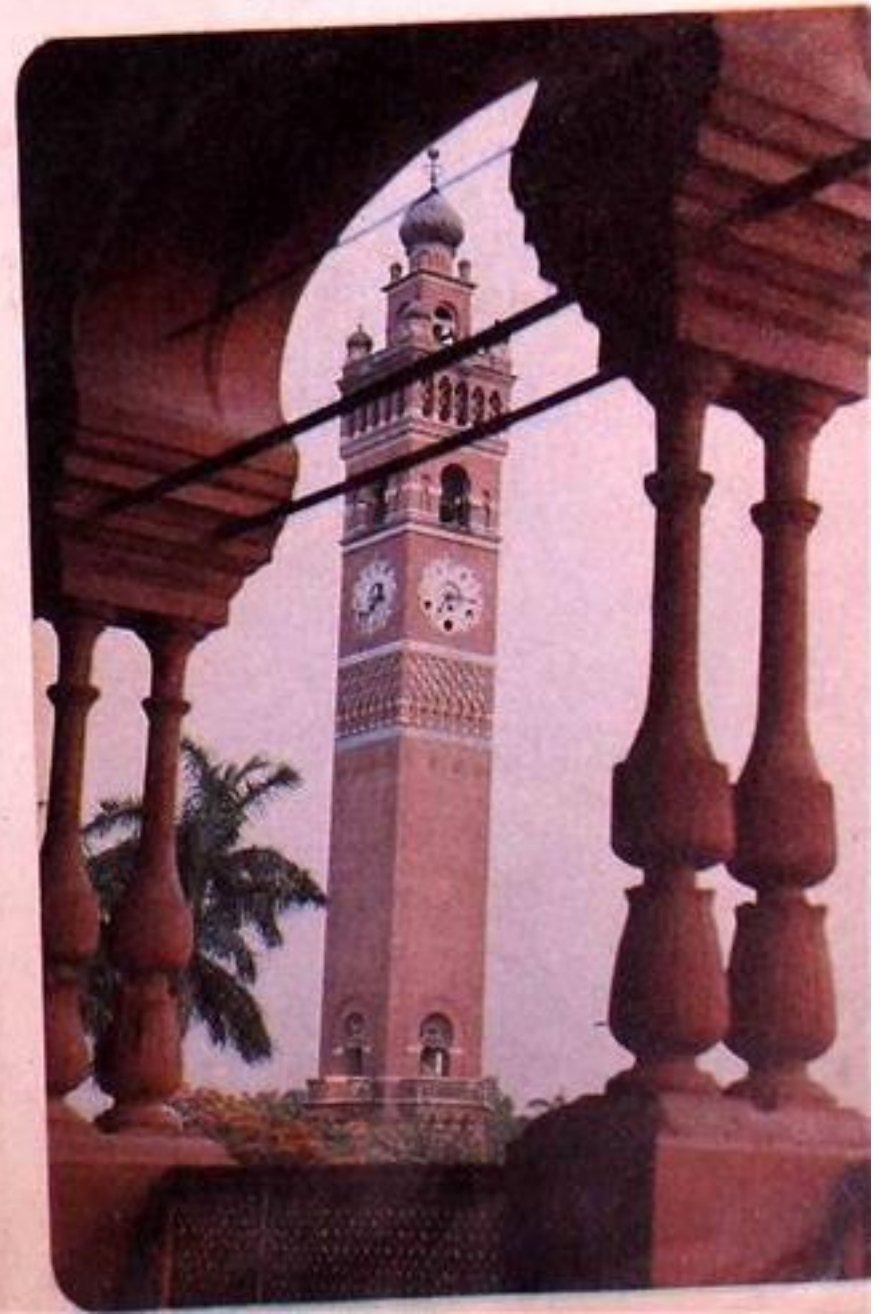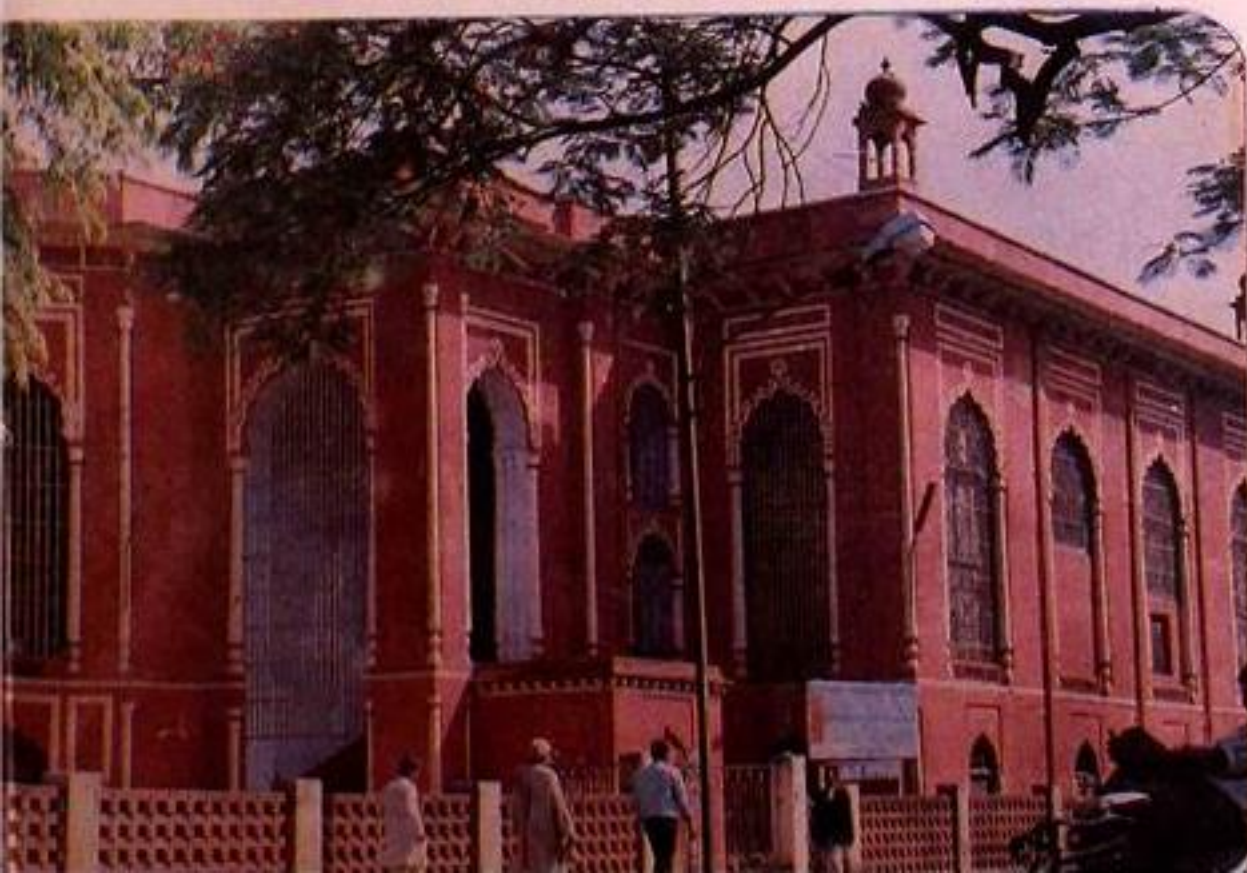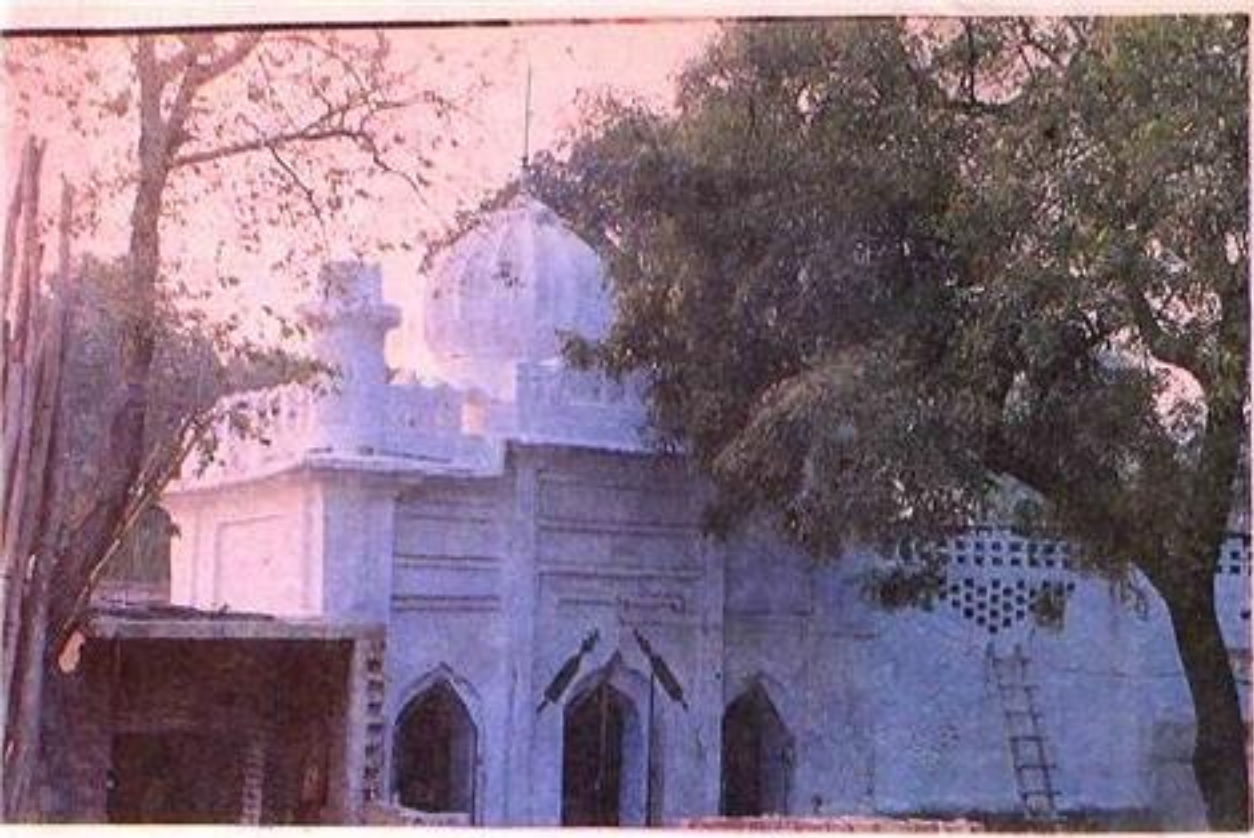
مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ لکھنؤ

مسجد راجہ ٹکیت رائے ٹکیت گنج لکھنؤ

ریلوے اسٹیشن
چارباغ لکھنؤ

فولادی ستون
لامارٹینیر کالج
لکھنؤ
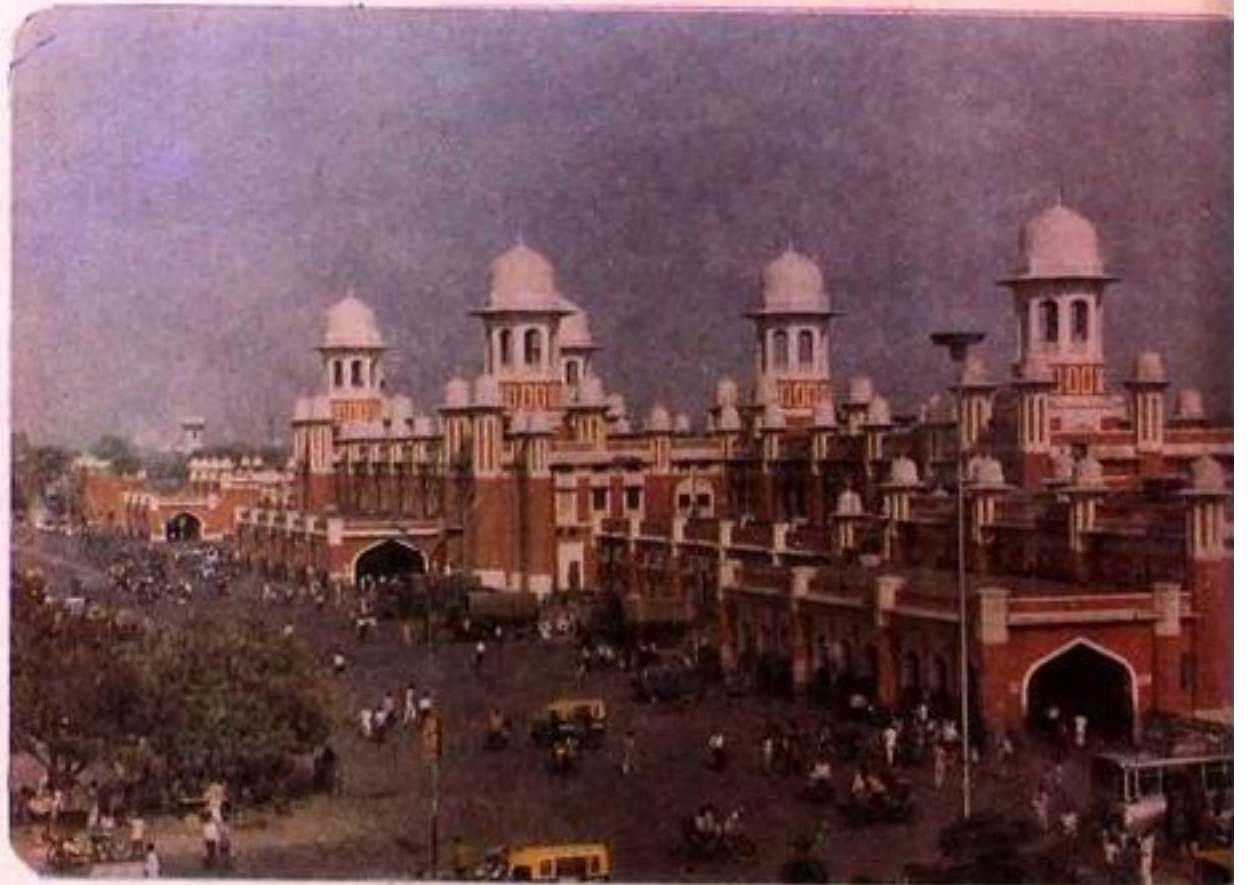
عمارت لامارٹینیر کالج لکھنؤ
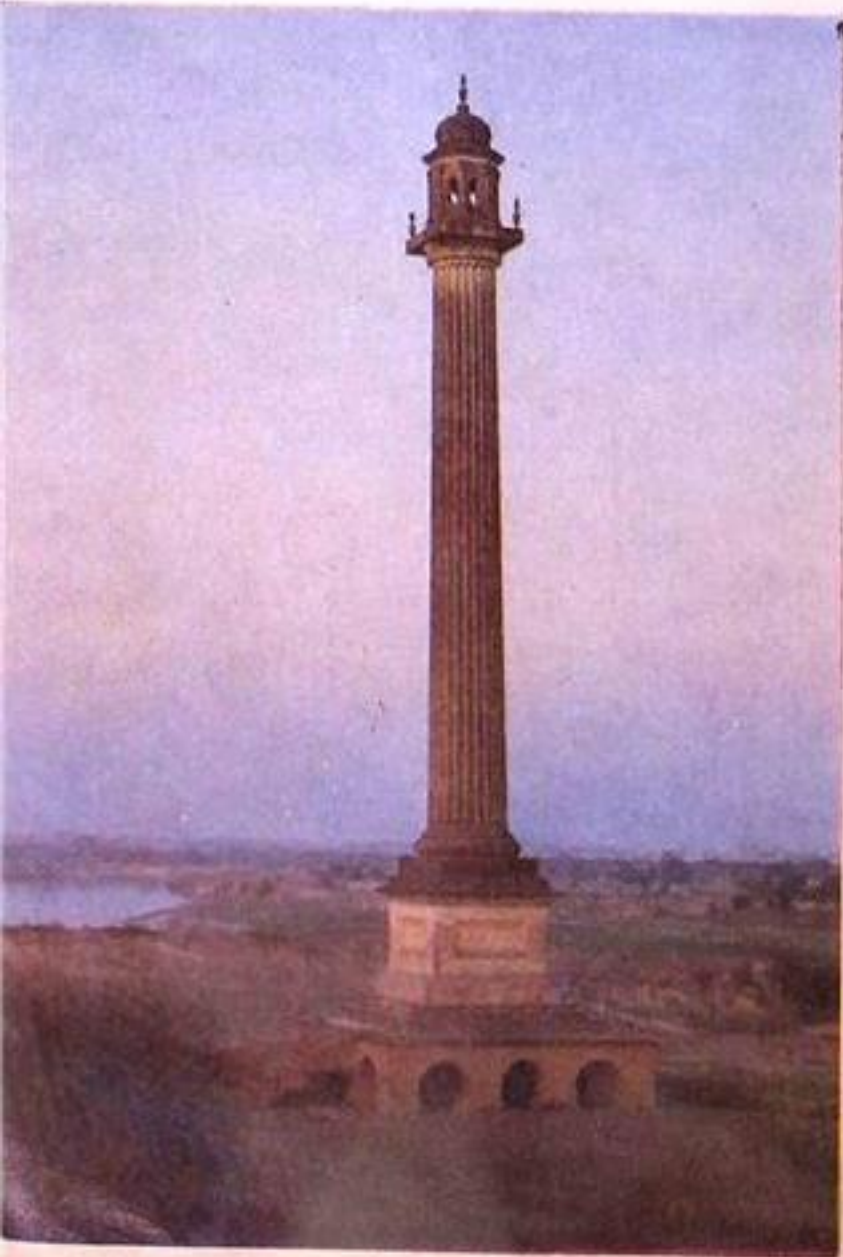
نواب
واجد علی شاہ
اختر

میر محمد امین نواب سعادت خاں برہان الملک

انجمن انصارِ عباسیہ کی
جانب سے ۳۰ جنوری ۱۹۹۴ء
کو جشنِ ولادت حضرت عباسؑ
کے موقع پر حسن لکھنوی کی
تصنیف کردہ کتاب ـــ
"درگاہ حضرت عباس لکھنؤ"
کی رسمِ اجرا عزت مآب
جسٹس حیدر عباس رضا
کے ہاتھوں انجام پائی۔
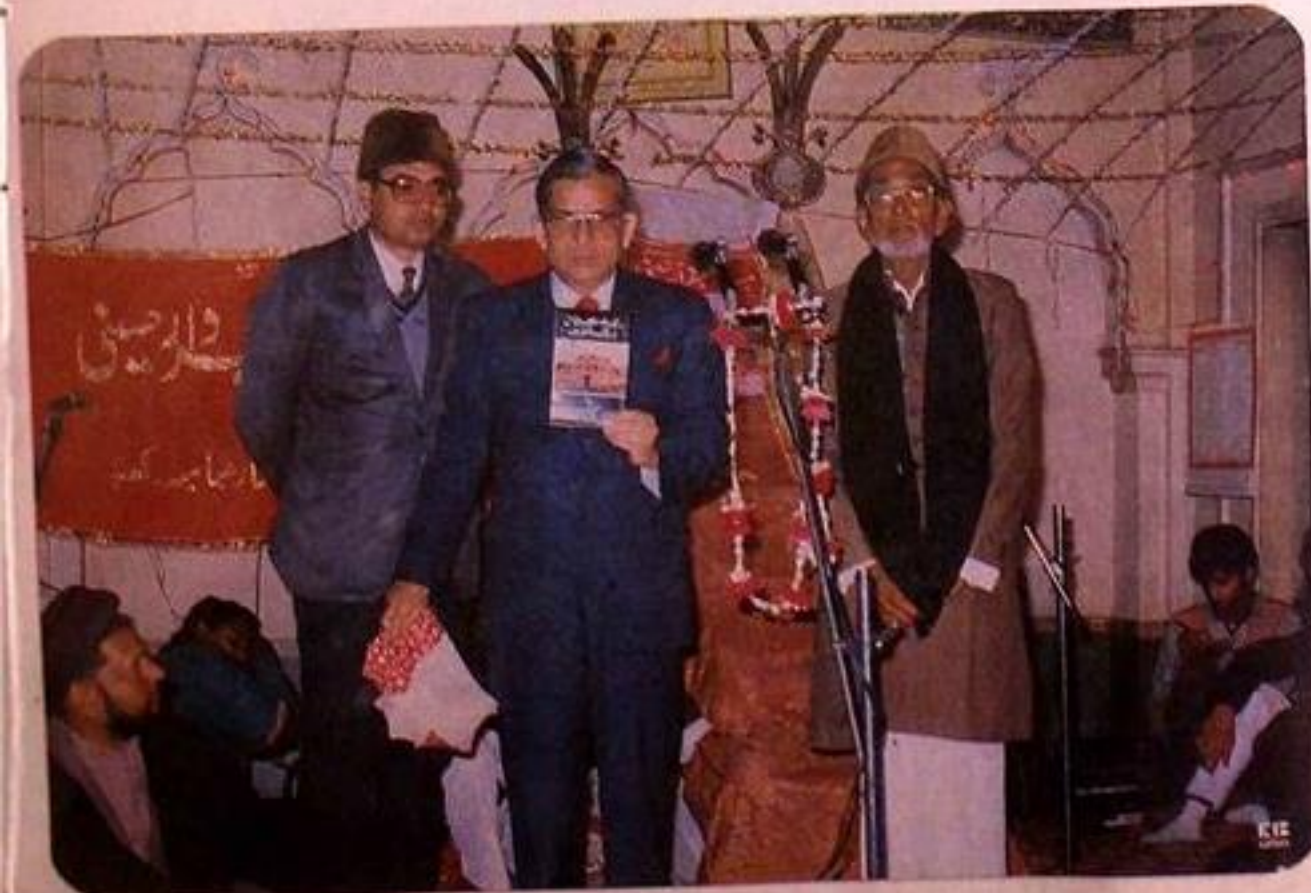
خاص آرائش شیشہ آلات کی ہے۔ بلجیم اور انگلستان کے بنے بھاری بھرکم جھاڑ چھت سے لٹکے اور فرش پر رکھے ہیں، ان کے علاوہ چین کی بنی ہوئی رنگ برنگ ہانڈیاں اور جھابے بھی آویزاں ہیں۔ محرم میں جب ان میں روشنی کی جاتی ہے تب گویا ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ جھاڑوں کے سہ پہل قلموں میں قوس قزح کے سات رنگ نظر آتے ہیں۔ رنگ و نور سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

امام باڑے کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے ذمہ ہے۔ یہ ٹرسٹ (وقف) محمد علی شاہ نے ۱۸۳۹ء میں قائم کیا تھا اور اس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خزانے میں ۳۶ لاکھ روپے جمع کیے تھے۔

(۳) امام باڑہ شاہ نجف

یہ امام باڑہ دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ اس کے دائیں جانب سکندر باغ اور بائیں جانب کچھ دور موتی محل ہے۔ موتی محل کے علاوہ جواہر لال نہرو اور شاہ نجف روڈ (حضرت گنج) سے بھی راستے جاتے ہیں۔ اسے اودھ کے پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر (زمانۂ حکومت ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) نے اعلانِ بادشاہت (۱۸۱۹ء) سے قبل بنوایا تھا۔ تاریخ تعمیر ہے ؎

با حسنِ عقیدت نجفِ اشرف را — فرمود بنا ہند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل — ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر

(۱۲۳۲ھ/ مطابق ۱۷-۱۸۱۶ء)

اندرونی پھاٹک پر کتبہ ہے "شبیہ روضہ نجف اشرف" یہ پیغمبر اسلام کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی کے مزار کی نقل ہے جو عراق کے شہر نجف میں ہے۔

پہلا پھاٹک سڑک کے کنارے ہے جس کے اوپر دو شیر بنے ہیں۔ جو حضرت علی کے لقب اسد اللہ (فارسی شیرِ خدا) کی یاد دلاتے ہیں۔ شیروں کے پنجے دو مچھلیوں کے حلقے پر ٹکے ہیں۔ اوپر تاج بنا ہے (جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پھاٹک غالباً اعلانِ بادشاہت کے بعد کا اضافہ ہے) پھاٹک کی محراب گول ہے۔ اُس کے دونوں جانب گنبد ہیں۔

اس پھاٹک کے آگے پختہ راستہ ہے جس کے اطراف میں سبزہ زار ہیں۔ اس کے بعد دوسرا پھاٹک ملتا ہے۔ یہاں ایک ملازم ہر ایک گھنٹے کے بعد وقت کے مطابق گھنٹہ بجاتا ہے۔ پھاٹک کے دونوں جانب ملازمین کے رہنے کے لیے کمرے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا پھاٹک ہے جہاں سے روضہ کا جنوبی رُخ اور چھت پر شاندار سفید گنبد نظر آتا ہے۔ گنبد کا کلس سنہری ہے۔ روضہ کی عمارت چوکور ہے۔ اس کے چاروں طرف غلام گردش ہے۔

روضے کے جانبِ مغرب ایک چھوٹی مسجد ہے۔ شمال کی طرف چوتھا پھاٹک ہے۔ اس کے بعد فصیل میں پانچواں پھاٹک ہے جو عام طور پر بند رہتا ہے۔ اس پھاٹک سے کچھ دُور دریائے گومتی ہے۔

امام باڑے میں داخلہ چوتھے پھاٹک سے ہوتا ہے۔ برآمدے کے بعد خاص عمارت کے تین دروازے نظر آتے ہیں جن میں برما کے ساگون (TEAK) کی بنی نقشی چوڑیاں لگی ہیں۔ اندر کا فرش سنگِ مرمر (سفید) اور سنگِ موسیٰ (سیاہ) کا شطرنجی ہے۔ گنبد ہشت پہل ہے۔ جس کے ہر پہلو میں روشن دان ہے۔ گنبد کے نیچے تین قبریں ہیں۔ بیچ میں غازی الدین حیدر کی، دائیں جانب مبارک محل کی اور بائیں جانب ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر بائیں گوشے میں بادشاہ کی تیسری بیوی سرفراز محل دفن ہیں۔ قبروں پر تعزیے رکھے ہیں۔ آخر الذکر کے نزدیک منبر نظر آتا ہے۔

امام باڑے کا جنوبی در بند کر دیا گیا ہے۔ اس حصے میں شہ نشین ہے جہاں چاندی کی شبیہ نجف اشرف، صندل کا تعزیہ اور عَلَم آراستہ ہیں۔

امام باڑے کی آرائش قابلِ دید ہے۔ بیش قیمت جھاڑ فانوس، زرد، نیلی اور سبز ہانڈیاں چھت سے مناسب فاصلوں پر لٹکی ہیں، فرش پر جھکیں (فرش جھاڑ) اور مردنگ رکھے ہیں۔

امام باڑے میں داخل ہوتے ہی دیوار پر فریم کی ہوئی تین تصویریں

(OIL PAINTINGS) نظر آتی ہیں۔ غازی الدین حیدر، نواب سرمحسن الدولہ اور نواب مُمتاز الدولہ کی یہ تصویریں مسز جاپلنگ رو (MRS. JOPLING - ROWE) کی بنائی ہوئی ہیں۔

غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خزانے میں ایک کروڑ روپے بہ طورِ قرضِ دوام جمع کیے تھے جس کا سُود بیگمات کے وثیقے، امام باڑے کی بقا اور عزاداری جاری رکھنے کے لیے وقف کیا تھا۔

غازی الدین حیدر کے بعد ان کی بیگم مبارک محل، ان کے بعد حکیم بندہ مہدی خاں حسبِ وصیت شاہ نجف کے متولی ہوئے۔ ان کے بیٹے اور جانشین حکیم بندہ رضا خاں نے بلا وصیت ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ اس لیے شاہ نجف کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے ذمے کر دیا گیا۔ شاہ نجف کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر یہ امام باڑہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وطن پرستوں نے سکندر باغ کی طرح یہاں بھی انگریزی فوج سے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن شکست ہوئی۔ اِس جنگ میں شاہ نجف کا بیش بہا آرائشی سامان لوٹ لیا گیا یا ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جو بچا وہ ہمارے سامنے ہے۔

(۴) امام باڑہ سبطین آباد

یہ امام باڑہ حضرت گنج میں واقع ہے (نمبر۳) اسے عام طور پر لوگ مقبرہ کہتے ہیں کیونکہ یہاں حضرت گنج کے بانی حضرت امجد علی شاہ (زمانہ حکومت ۱۸۴۲ء۔۱۸۴۷ء) دفن ہیں۔

اسے حضرت امجد علی شاہ کے بیٹے واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ تاریخِ تعمیر ہے ۔ "آرام گاہ ظل اللہ" (۱۲۶۴ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء) انھوں نے اس کا نام رکھا سبطین آباد (سبط عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نواسا، مراد رسولِ خدا کے نواسوں امام حسن اور امام حسین سے ہے) یہ زمانۂ شاہی کی لکھنؤ میں آخری یادگار ہے۔ معزولی کے بعد واجد علی شاہ نے مٹیا برج کلکتے میں اسی نام کا دوسرا امام باڑہ بنوایا جہاں ان کی دائمی آرام گاہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس امام باڑے کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کا سارا آرائشی سامان لٹ گیا۔ امام باڑے کے سامنے دو پھاٹک ہیں جن کے درمیان "مقبرہ روڈ" حائل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سڑک انگریزی دورِ حکومت کی تعمیر ہے۔ پہلے یہاں دونوں پھاٹکوں کے درمیان صحن اور باغ رہا ہوگا۔ سڑک کے دونوں طرف کی عمارتیں بھی بعد کی تعمیر ہیں۔ امام باڑے کی وسعت کا اندازہ اس کی پشت پر واقع لال باغ کی اس گلی میں جا کر ہو سکتا ہے جس کا نام بی این گھئی لین (B.N. GHAI LANE) ہے۔

امام باڑہ سبطین آباد بڑے امام باڑے کی چھوٹی موٹی نقل ہے۔ عمارت ایک اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جس کے دونوں طرف زینے اور درمیان میں حوض ہے (جسے پاٹ دیا گیا ہے۔)

امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں طرف دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں اوپر نیچے تین تین دَر ہیں۔ عمارت لکھوری اینٹ اور لال چونے کی بنی ہے۔ بڑے امام باڑے کی طرح اِس کی چھت میں بھی لوہے یا لکڑی کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ محرابوں اور پشت کی مُنبت کاری قابلِ دید ہے۔

امام باڑے کے دائیں جانب مسجد ہے۔ سامنے صحن کے بیچ میں اندرونی پھاٹک ہے۔ پھاٹک اور صحن کے دونوں طرف غلام گردش ہے۔ جس کے کمروں اور پھاٹکوں میں کرائے دار آباد ہیں۔ اگلے پھاٹک میں دکانیں ہیں شہ نشین اور بائیں طرف کی صحنچی میں لکڑی کے فرنیچر کا کارخانہ ہے۔ چبوترے کے سامنے جھونپڑیاں اور اوپر ٹین کا بنا گودام ہے۔ امام باڑہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔

(۵) امام باڑہ قاسم علی خاں

یہ امام باڑہ حسین آباد کے نزدیک محلہ پیر بخارا میں ڈھال پر واقع ہے۔ اس کے مقابل چوک کا فائر اسٹیشن اور قریب ہی کونیشور کا مندر ہے۔ اسے نواب قاسم علی خاں خلف مرزا محمد علی سالار جنگ نے آصف الدولہ کے زمانے میں (۱۷۹۶ء۔۱۷۹۷ء) بنوایا تھا۔ اس کے پاس ہی مرزا علی خاں کا مقبرہ ہے (وفات ۱۷۹۷ء) وہ اور سالار جنگ سگے بھائی اور نواب آصف الدولہ کے ماموں تھے۔

دوسرے امام باڑوں کے برخلاف جن کا رُخ جنوب کی طرف ہے اس کا رُخ مشرق کی طرف ہے۔ یہ کالے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس کی سیاہ دیواروں اور محرابوں پر آیاتِ قرآنی بخطِ نسخ سفید رنگ سے لکھی گئی تھیں اور سفید رنگ سے ظُروف۔ مسجد، گلدستے، دُلدُل، اونٹ اور بُراق وغیرہ بنائے

گئے تھے۔

شہ نشین کی چھت پرانی ہے۔ سامنے دو دالان ہیں (اگلے دالان کو برآمدہ کہنا مناسب ہوگا) جن کی چھتیں نو تعمیر ہیں۔ خاص عمارت کے پہلوؤں میں صحنچیاں ہیں۔ دروازے لوہے کے ہیں۔ کُل ملا کر نو در ہیں (۲+۵+۲) امام باڑے کی زینت لکڑی کی ایک ضریح ہے جو امام علی رضا (آٹھویں امام) کے روضے کی نقل ہے۔

امام باڑے کے سامنے ایک وسیع صحن ہے جہاں جا بجا قبروں کے نشان ہیں۔ سالار جنگ (متوفی ۱۸۰۱ء) اور ان کے بیٹے قاسم علی خاں بھی اسی امام باڑے میں دفن ہیں لیکن قبروں کا پتا نہیں۔ امام باڑہ وثیقہ دفتر کی نگرانی میں ہے۔ عزاداری اور مجالس ہوتی ہیں۔

(۶) امام باڑہ زین العابدین خاں

گول دروازے سے کاکوری جانے والی سڑک پر بائیں جانب کالی چرن انٹر کالج ہے۔ اس سے ملا ہوا ایک شاندار مگر شکستہ امام باڑہ نواب آصف الدولہ کے زمانے (۱۷۹۶ء ۔ ۱۷۷۵ء) کی یادگار ہے۔ اسے میر زین العابدین خاں (متوفی ۱۲۰۷ھ، مطابق ۱۷۹۲ء) نے بہ صرفِ کثیر الماسی اینٹ سے تعمیر کرایا تھا۔ موصوف الماس علی خاں خواجہ سرا کی طرف سے کئی پرگنوں کے عامل تھے۔

اس عمارت میں شہ نشین کے سامنے پانچ پانچ دروں کے دو دالان ہیں۔ چھتیں گرنے کی وجہ سے یہ امام باڑہ عرصۂ دراز تک اینٹوں کا ڈھیر بنا رہا۔ دالان اب بھی بغیر چھتوں کے ہیں۔ شہ نشین کی چھت نئی تعمیر ہے۔ اس کی دیوار پر سنگِ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:

مولانا کلب عابد ہال افتتاح ۲۸ جون ۱۹۹۲ء
بدست مولانا کلب جواد صاحب قبلہ منجانب: علی کانگرس

دروں کے پایوں اور محرابوں پر نہایت خوبصورت مُبتّت کاری ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دالانوں کے سامنے وسیع صحن ہے جو آرائش کا محتاج ہے۔ امام باڑے میں حسبِ معمول مجالس ہوتی ہیں۔

(متولی: سید کلب جواد صاحب قبلہ)

(۷) امام باڑہ راجہ جھاؤلال

یہ امام باڑہ ٹھاکر گنج میں واقع ہے۔ اسے نواب آصف الدولہ کے وزیر راجہ جھاؤلال نے بنوایا تھا۔ جب قدوۃ العلما سید آقا حسن (متوفی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء) نے یہاں "شیعہ بیت المال" قائم کیا تب سے یہ اس نام سے مشہور ہوگیا۔

امام باڑے کے راجہ جھاؤلال کی بنوائی مسجد بھی ہے جو اصلی والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے یہ مسجد امام باڑے کے احاطے میں تھی لیکن سڑک (کاکوری روڈ) نکلنے کی وجہ سے الگ ہوگئی۔

امام باڑے کے داہنی جانب باباگومتی داس کا مندر ہے (اس کے پیچھے ٹی بی اسپتال ہے) اسے نواب آصف الدولہ (۱۷۹۶ء ۔ ۱۷۷۵ء) نے بابا کی رہائش گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی لیے اسے باباگومتی داس کا اکھل بھی کہتے ہیں۔ امام باڑے اور اس مندر کا طرزِ تعمیر یکساں (مغل اور راجپوت طرزِ تعمیر کا امتزاج) ہے۔

امام باڑے کا صحن پہلے کافی وسیع تھا۔ لیکن حصار کی دیواریں گر جانے کی وجہ سے لوگوں نے رفتہ رفتہ امام باڑے کی آراضی پر قبضہ کرلیا۔ امام باڑے کے دونوں طرف مکان اور دکانیں ہیں۔

موجودہ عمارت میں شہ نشین کے سامنے دالان ہے۔ دونوں میں نو نو در ہیں۔ دالان کے پہلوؤں میں تین تین در ہیں۔ اس کی چھتیں اور جو حصے گر گئے تھے پھر سے بنائے گئے ہیں۔ تعمیر کا کام جو سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء سے شروع ہوا تھا اب مکمل ہو چکا ہے۔ انجمن رضا کارانِ حسینی اس امام باڑے کی نگرانی کرتی ہے۔ یہاں باقاعدہ مجلسیں ہوتی ہیں۔

(متولی: سید شمس الحسن تاج، سکریٹری انجمن رضا کاران حسینی)

(۸) امام باڑہ ملکہ زمانیہ

یہ امام باڑہ محلہ گولا گنج میں واقع ہے۔ اس کے سامنے جگت نرائن روڈ ہے اور داہنی جانب وہ سڑک ہے جو جھاؤلال کے پل سے ہو کر امین آباد جاتی ہے۔ اس کے سامنے، داہنی طرف مسجد ملکہ زمانیہ ہے۔ یہ دونوں عمارتیں نواب ملکہ زمانیہ زوجۂ نصیر الدین حیدر نے باہتمام محمد احسن خاں ۱۸۳۶ء میں بنوائی تھیں۔

دسمبر ۱۸۴۳ء میں ملکہ زمانیہ نے بہ زمانہ امجد علی شاہ انتقال کیا اور اپنے ہی امام باڑے میں دفن کی گئیں لیکن قبر کا پتا نہیں۔ امام باڑے کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ مسجد آباد ہے۔

امام باڑے کی عمارت میں ایک شہ نشین اور اس کے سامنے دو کشادہ دالان ہیں۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ پہلو میں تین دروں والی صحنچیاں ہیں۔ سامنے کی صحنچیاں دو منزلہ تین تین دروں والی ہیں۔ چھتیں سب کی گر چکی ہیں۔ صرف ایک حصے میں دھنّیاں، چھانیں اور چند شہتیر باقی ہیں۔

امام باڑے کے صحن کی جگہ ایک کچا میدان ہے جس پر ایک دودھ والے کا قبضہ ہے۔ گائیں امام باڑے کے اندر آرام کرتی ہیں (شاید انھیں بھی سکون کی ضرورت ہے) جا بجا کنڈوں، اُپلوں اور گوبر کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اوبڑ کھابڑ زمین اور کوڑے کرکٹ کو پار کر کے امام باڑے میں رسائی ہو سکتی ہے۔

پہلے اس کے صحن میں نہر تھی۔ لب سڑک عظیم الشان پھاٹک تھا۔ در و دیوار پر خوشنما منبت کاری اور رنگ آمیزی تھی، لیکن اب کچھ باقی نہیں ہے۔ امام باڑے کی آراضی فروخت ہو چکی ہے جس پر عمارتیں اور دکانیں بن گئی ہیں۔ بہرحال جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُسے مزید بربادی سے بچانے کی اشد ضرورت ہے۔ سید آغا مہدی صاحب مصنف تاریخ لکھنؤ کی رائے میں "یہ امام باڑہ اپنی وسعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے۔ امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جھاؤلال، امام باڑہ ملکہ زمانی بزرگ ترین عمارتیں ہیں[۱]"

(۹) امام باڑہ ولایتی محل

یہ امام باڑہ بیگم والی کوٹھی، ریذیڈنسی (بیلی گارد) میں واقع ہے۔ اس کوٹھی میں کبھی جارج ہاپکنس والٹرز (GEORGE HOPKINS WALTERS) کا خاندان رہا کرتا تھا۔ ان کی ایک بیٹی سے شاہ نصیر الدین حیدر نے ۱۸۲۶ء میں عقد کر کے نواب مخدرہ علیہ کا خطاب دیا۔ وہ ولایتی محل کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بادشاہ کے انتقال (۱۸۳۶ء) کے بعد وہ دولت سرائے سلطانی سے اپنے والدین کے مکان میں منتقل ہو گئیں اور بعد انتقال (۱۸۴۰ء) اپنے مکان کے صحن میں اپنی ماں کی قبر کے پاس دفن کی گئیں۔ (یہ مکان ان کے قیام کی وجہ سے بیگم والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہو گیا۔)

بیگم والی کوٹھی سے متصل ایک امام باڑہ اور ایک مسجد ہے جنھیں نواب مخدرہ علیا یا ان کی سوتیلی نو مسلم بہن اشرف النساء نے بنوایا تھا۔ غدر میں ان دونوں عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔

امام باڑے میں ایک شہ نشین اور سامنے دو دالان ہیں۔ تینوں میں پانچ پانچ در ہیں۔ دونوں جانب تین دروں والی بلند و بالا صحنچیاں ہیں۔ چھتیں سب کی منہدم ہو چکی ہیں۔ سامنے وسیع صحن ہے۔ مشرقی غلام گردش اب باقی نہیں ہے۔ مغربی غلام گردش کی چھت کے ایک حصے پر مسجد ہے جو بلندی کی وجہ سے دور نظر آتی ہے۔ "امام باڑے میں منبتی نقش و نگار اور گل بوٹے نہایت دل کش اور خوشنما بنے ہوئے ہیں جو اس زمانے کے معماروں کی استادی اور چابک دستی کا پتہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا خوبصورت نوک پلک سے درست اور جاذب نظر آرائشی کام اس مسجد اور امام باڑے میں بنا ہے ایسا ریذیڈنسی کی کسی عمارت میں نہیں ہے[۲]"

(۱۰) امام باڑہ مُغل صاحب

یہ امام باڑہ درگاہ حضرت عباس کے دائیں جانب محلہ رستم نگر میں وزیر باغ روڈ پر واقع ہے۔ راستہ گلی سے ہو کر پلیا کے پار ہے۔ اسے تاجدار اودھ محمد علی شاہ کی بیٹی مغل صاحب نے ۱۸۷۹ء میں بنوایا تھا۔ مغل صاحب عرف، اصلی نام اُمت الصغریٰ فخر النساء بیگم تھا۔ بعد انتقال (۸ دسمبر ۱۸۹۳ء) اپنے ہی امام باڑے کے دالان میں دفن کی گئیں۔

امام باڑے کے عالی شان پھاٹک کا صرف ایک پکھا (دائیں جانب کا) باقی ہے جس کے اوپر ایک خوبصورت گنبد ہے۔ پھاٹک کے اس حصے میں اوپر سے نیچے تک نہایت خوشنما منبت کاری ہے۔ "اس انداز کا نازک اور دل کش کام لکھنؤ کے کسی امام باڑے کے پھاٹک میں نہیں ہے[۳]"

پھاٹک کے دائیں جانب ایک دو منزلہ عمارت ہے جس میں اوپر نیچے پانچ پانچ در ہیں۔ اوپر کے کمروں اور نیچے کی دکانوں میں کرائے دار آباد ہیں۔ غالباً ایسی ہی عمارت پھاٹک کے بائیں جانب بھی تھی لیکن اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

پہلے پھاٹک سے گزر کر کچھ فاصلے پر ایک دوسرا پھاٹک ملتا ہے جو ادنا درجے کا ہے۔ اس کے اندر کے رُخ پر دو مچھلیاں بنی ہیں۔ امام باڑہ اس پھاٹک کے دائیں جانب ہے۔ پھاٹک سے باہر بائیں جانب بلندی پر مغل صاحب کی بنوائی ہوئی مسجد ہے۔ دونوں کے راستے کھڑی لکھوری اینٹوں کے بنے ہیں۔

امام باڑہ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہے جس کے دونوں جانب پانچ پانچ زینے ہیں۔ چبوترے کے سامنے ایک وسیع صحن ہے جس کے بیچ میں ایک خوشنما نہر (یخنۃ مستطیل حوض) ہے۔ صحن کے دونوں جانب غلام گردش ہے جس کے کمروں میں کرائے دار آباد ہیں۔

امام باڑہ ایک شہ نشین اور دو دالانوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ سامنے کے رُخ امام باڑے کے دونوں جانب دو نہایت خوشنما گنبد ہیں جن کے نیچے کی تعمیر ہشت پہل ہے۔ ان سے ملے ہوئے کمروں میں دونوں

جانب اوپر جانے کے لیے زینے ہیں۔ امام باڑے کے اندر کی منبت کاری اور رنگ آمیزی قابل دید ہے۔" پلستر میں جو مصالحہ صرف ہوا تھا اُس کا جزو غالب سنگ جراحت ہے اور استرکاری میں وہ چمک ہے جو کسی عمارت میں نہیں۔"

امام باڑے کا منبر نادر روزگار ہے۔ اتنا اونچا منبر ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منبر مغل صاحب کے زمانے کا ہے۔ نہ جانے کون سی لکڑی ہے کہ اب تک دیمک نہ لگی۔

امام باڑہ شیعہ سنٹرل وقف بورڈ کی نگرانی میں ہے۔ کرائے دار بھی اس کے محافظ ہیں۔ باقاعدہ مجلیس ہوتی ہیں۔ چند سال سے آگ کا ماتم بھی ہوتا ہے۔

(۱۱) امام باڑہ آغا باقر خاں

یہ امام باڑہ چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں واقع ہے۔ اسے نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں (۱۷۵۶ء۔ ۱۷۷۵ء) آغا اسمٰعیل دلاور جنگ کی خواہش پر ان کے چچا وکار پرداز آغا باقر خاں نے بنوایا تھا۔ آغا باقر نواب شجاع الدولہ کی فوج میں پانچ ہزار سواروں کے رسالدار تھے۔ اُس زمانے میں یہ لکھنؤ کا دوسرا امام باڑہ تھا۔ پہلا امام باڑہ آغا ابو طالب خاں نے بنوایا تھا۔ لیکن اب وہ موجود نہیں ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں نے امام باڑہ آصف الدولہ کو فوجی چھاؤنی قرار دے کر اردگرد کی ساری عمارتیں مسمار کرادیں تو یہ امام باڑہ بھی شہید ہوگیا۔ یہاں مرزا کام بخش (خلف مرزا اسلیماں شکوہ پسر دوم حضرت شاہ عالم ثانی' بادشاہ دہلی) کی قبر تھی۔ اسے لیے ان کے بیٹے مرزا حیدر شکوہ نے ۱۸۵۹ء میں اراضی کو واگزار کرا کے دوبارہ امام باڑہ بنوایا۔ اب وہ باقی نہیں ہے۔ موجودہ تعمیر کا آغاز ۱۹۷۱ء سے ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

امام باڑے کے دو حصے ہیں: سامنے مردانہ' پیچھے زنانہ۔ آگے پیچھے صحن اور اردگرد چہار دیواری ہے۔ امام باڑے کی زینت ضریح کے علاوہ ایک خاص وضع کا علم ہے جو زمین کھودنے پر برآمد ہوا تھا۔ امام باڑے کے اندر اور باہر (صحن میں) جا بجا قبریں ہیں۔

یہ امام باڑہ زمانہ قدیم سے مقبول خاص و عام ہے۔ ہر جمعرات کو عقیدت مند مرد و عورتوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شام کو ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے۔ حدیث کسا

کی تلاوت اور حضرت علی کی شان میں مناجات ہوتی ہے۔ شب کے ۱۲ بجے تک آنے والوں کی تعداد گھٹ کر سو سوا سو رہ جاتی ہے۔

(متولی: کشور جہاں صاحبہ' اہلیہ یوسف اختر صاحب)

(۱۲) امام باڑہ غفرانمآب

یہ امام باڑہ چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں واقع ہے۔ (آغا باقر کا امام باڑہ اسی سے چند قدم پہلے بائیں جانب ہے) اس کے سامنے سے وکٹوریہ اسٹریٹ گزرتی ہے اور پُشت پر کیننگ اسٹریٹ ہے۔ سڑک (وکٹوریہ اسٹریٹ) سے سیدھا راستہ گیا ہے۔ سبزی سے لدے چھکڑوں اور ٹرکوں کی وجہ سے گندہ راستہ پار کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

یہ امام باڑہ ۱۲۲۷ھ (مطابق ۱۸۱۳ء) میں مولانا سید دلدار علی صاحب نے بنوایا تھا جو ہندوستان میں امامیہ مذہب کے پہلے مجتہد تھے۔ غفرانمآب لقب بعد وفات ہوا۔

امام باڑے کے دائیں جانب ایک کمرے میں بانی امام باڑہ' ان کی زوجہ اور ان کے چھوٹے بیٹے سید العلماء سید حسین مجتہد کی قبریں ہیں۔ (وفات ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۶ء بہ عہد واجد علی شاہ' لقب بعد وفات علیین مکاں) ان کے علاوہ ایک چوتھی قبر ہے جس کے سنگِ مزار پر کتبہ ہے "مزارِ مقدس قدوۃ العلماء' بانی شیعہ کانفرنس" قبروں پر سنگ مرمر کے تختے نصب ہیں جن میں تراش کر خوشنما محرابیں بنائی گئی ہیں۔ حوض (گہرے حصے) بن کتبے ہیں۔ بانی امام باڑہ کی قبر پر کتبہ ہے "مزار محترم مجدد شریعت حضرت غفرانمآب طاب ثراہ" ان کے بیٹے سید العلماء کی قبر کا پتھر سب سے بڑا ہے۔ غالباً اتنا بڑا سنگِ مرمر کا تختہ کسی دوسری قبر پر کہیں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایران سے لایا گیا تھا۔

امام باڑے کے دائیں جانب نالے کے پاس غفرانمآب کے بڑے بیٹے سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد کی بنوائی ہوئی شاندار مسجد ہے (سنہ تعمیر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء) سلطان العلماء نے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ (مطابق ۱۸۶۸ء) کو رحلت کی اور امام باڑے کے ضریح والے دالان میں دفن ہوئے۔

امام باڑے کی موجودہ عمارت نئی ہے۔ تعمیر کا سلسلہ سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔

امام باڑے میں سامنے کے رُخ پانچ در ہیں جن کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ عمارت کے دونوں جانب برآمدے اور ان کے پیچھے کمرے ہیں۔ جن میں

چار چار در ہیں (۴+۵+۴) چھت پر دونوں جانب خوبصورت گنبد ہیں عمارت کا رنگ باہر کی جانب زرد ہے۔ رنگ خوشنا صدر دروازے کا بھی ہے۔)

امام باڑے میں داخل ہونے پر پہلے دو دالان (یا کمرے) نظر آتے ہیں۔ جن کا فرش نہایت خوشنما (MOSAIC) کا ہے۔ صرف ایک قبر کچی ہے (کچے فرش کے نیچے بھی قبریں ہیں۔) دونوں دالان پار کرنے کے بعد شہ نشین کے درمیانی دَر میں امام حسین علیہ السلام کی ضریح کی زیارت ہوتی ہے۔ اس دَر کا دروازہ اور اِردگرد کی کھڑکیاں لوہے کی ہیں جن کا رنگ سبز ہے۔ شہ نشین سے متصل دالان میں بائیں جانب منبر نظر آتا ہے۔

دونوں دالانوں کے پہلوؤں میں دو منزلہ صحنچیاں ہیں۔ شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تین تین در ہیں اور اس کے بعد والے (اگلے) دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے دو دو دَر ہیں (۵ ، ۳ + ۲)

امام باڑے کے سامنے کچا میدان ہے جس میں جا بجا صدر دروازے (گیٹ) تک قبریں نظر آتی ہیں۔ صحن کے دو حصے ہیں: امام باڑے سے متصل وقف خاص ہے جو افرادِ خاندان کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے آگے وقفِ عام ہے۔ قبروں کے کتبے پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے علمائے دین نامور شاعر اور باکمال ادیب یہاں دفن ہیں۔ "اہلِ قلم" حسینی شاعر فضل نقوی (تاریخِ وفات ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء) کے سنگِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

زندگی چند دن کی رعنائی　　پھر ہزاروں برس کی تنہائی

بھلا اسے کون بھلا سکتا ہے۔

امام باڑہ غفرانمآب کا نام "شامِ غریباں" کی مجلس کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ مجلس بروز عشرہ (۱۰ محرم) رات کی تاریکی میں کھلے میدان میں منعقد ہوتی ہے جس کے لیے منبر اندر سے باہر لا کر رکھا جاتا ہے۔ ہر سال بے شمار انسان ریڈیو پر اس مجلس کو سنتے ہیں۔ بیان اتنا پُراثر ہوتا ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت آبدیدہ ہو جاتا ہے۔

متولیان: مولانا سید کلب حسین صاحب (مرحوم)

〃　مولانا سید کلب عابد صاحب (مرحوم)

موجودہ: مولانا کلب صادق صاحب، مولانا سید کلب جواد صاحب۔

منتظمِ مجالس: سید شمس الحسن تاج (شمسی صاحب)

(۱۳) جنّت کی کھڑکی

چوک کی سبزی منڈی کے مشرق میں امام باڑہ غفرانمآب سے چند قدم پہلے دائیں جانب ایک سفید دو منزلہ عمارت ہے جس کے سبز پھاٹک کے دائیں طرف دیوار پر ایک دائرے میں "حسن منزل" اور بائیں جانب دیوار پر دوسرے دائرے میں "حسین منزل" لکھا ہے۔ یہی عمارت "جنّت کی کھڑکی" ہے۔ اسے حکیم سید یوسف حسین نے ۱۹۱۵ء میں بنوایا تھا۔

یہ امام باڑے کے علاوہ مکان بھی ہے جس میں وارثان رہتے ہیں۔ اس کی عمارت میں خاص بات یہ ہے کہ لکڑی کا کہیں بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ سب دروازے لوہے کے ہیں۔

صدر دروازے کے بعد ڈیوڑھی اور اس کے دونوں طرف کوٹھریاں ہیں۔ ڈیوڑھی کے بعد پختہ صحن ہے۔ اس کے سامنے دالان اور پھر شہ نشین جس کی زینت زمانۂ قدیم کی ایک ضریح ہے۔ دالان کے دائیں جانب سہ منزلہ مسجد ہے اور بائیں جانب دو منزلہ صحنچی۔

صحن کے دائیں جانب مذکورہ دالان سے متصل غسل خانہ اور پھر ایک کمرہ ہے۔ صحن کے بائیں جانب برآمدے میں باورچی خانہ ہے۔ گھر کے باہر بائیں جانب دکانیں ہیں۔

چہل منبری اس امام باڑے کی خصوصیت ہے۔ یہاں ۹ محرم کی شب میں چالیس چھوٹے چھوٹے منبر آراستہ کیے جاتے ہیں۔ حاجت مند آتے ہیں منتیں مانتے ہیں اور مُراد پوری ہونے پر چالیس منبروں پر شیرینی چڑھا کر رسولِ خدا کی نیاز دلواتے ہیں۔

(۱۴) امام باڑہ سیّد نقی صاحب

یہ امام باڑہ چوک میں مسجد تحسین علی خاں کی پُشت پر واقع ہے۔ راستہ مسجد کے دونوں طرف گلیوں سے ہو کر ہے۔ تیسرا راستہ عبدالعزیز روڈ (مولانا علی نقی روڈ) سے ہے۔

امام باڑے کی عمارت میں سامنے کے رُخ پانچ بلند و بالا در ہیں جن میں لوہے کے سبز دروازے لگے ہیں۔ درمیانی در کے اوپر سنگِ مرمر کی ایک تختی پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:

حُسینیہ حضرت جنّت مآب طاب ثراہ
زیر نظر مرمت و تعمیر
سرپرستی جناب صدر العلماء مولانا سید باقر صاحب قبلہ
متولی وقف ہٰذا

۱۴۰۲ھ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۸۱ء میں پرانی عمارت کی مرمت و تعمیر ہوئی۔ لوہے کے دروازے حفاظت کے خیال سے لگائے گئے ہیں۔ پہلے دروں میں بجائے جوڑیوں کے قدیم وضع کے لکڑی کے کھڑے تختے لگے تھے جو ضرورت کے وقت ہٹا دیے جاتے تھے۔

امام باڑے کے دائیں جانب "دانش گاہ ممتاز العلوم" (مدرسہ) اور "کتب خانۂ ممتاز العلوم" ہیں۔ اس کتب خانے میں قلمی کتابوں کا بے نظیر ذخیرہ ہے جو وقف علی الاولاد ہے۔

اس امام باڑے کو ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی صاحب نے بنوایا تھا۔ ۸ جولائی ۱۸۶۸ء کو سنگِ بنیاد رکھا۔ فروری ۱۸۷۱ء میں بن کر تیار ہوا۔

اس کے بانی سید العلماء مولوی سید حسین صاحب کے فرزند اور مولوی سید دلدار علی صاحب غفرانمآب کے پوتے تھے۔ ممتاز العلماء اور فخر المدرسین کے خطاب حضرت امجد علی شاہ (زمانۂ حکومت ۱۸۴۲ء - ۱۸۴۷ء) نے دیے تھے۔ بعد وفات (۲۶ نومبر ۱۸۷۰ء) "جنّت مآب" لقب ہوا۔ قبر امام باڑے کے وسطی دالان سے متصل صحنچی میں ہے۔ پہلو میں آپ کے پسر اکبر و جانشین شمس العلماء سید محمد ابراہیم صاحب مجتہد کا مزار ہے۔ (وفات ۱۲ جنوری ۱۸۹۰ء)

شہ نشین کی زینت کربلائے معلیٰ کی مٹی کی ایک ضریح ہے جو ممتاز العلماء کے زمانے میں عراق سے آئی تھی۔ ضریح کے سامنے والے در (بارگاہ حسینی) میں لکڑی کی خوشنما جالی لگی ہے۔ شہ نشین کے سامنے تین کشادہ دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ اگلے دو دالانوں کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں اوپر نیچے تین تین در ہیں۔ (بعض در بند کر دیے گئے ہیں) دالانوں کی پرانی چھتیں لکڑی کے لٹھوں اور دھنّیوں کی بنی تھیں۔ اب ان کی جگہ سلیب (SLAB) نے لے لی ہے۔

امام باڑے کے سامنے ایک وسیع صحن (کچا میدان) ہے۔ جب مجلس میں شریک ہونے والوں کو اندر جگہ نہیں ملتی تو وہ باہر میدان میں دریوں پر شامیانے کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

اس امام باڑے کے بارے میں سید آغا مہدی صاحب، مصنف "تاریخ لکھنؤ (کراچی ۱۹۷۶ء) کی یہ رائے ہے" یہ امام باڑہ امام باڑۂ آصفی، امام باڑہ جھاؤلال، امام باڑہ ملکہ زمانی کے بعد چوتھے نمبر پر ہے اور اس سے بڑا کوئی عزاخانہ نہیں ہے۔" (صفحہ ۸۴)

امام باڑے سے کچھ دور دائیں جانب ایک مختصر سی عمارت ہے جس پر لکھا ہے "آرام گاہ سید العلماء" یہاں افرادِ خاندان دفن ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) جناب مولانا سید ابوالحسن صاحب والدِ محترم سید علی نقی صاحب (۲) سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب عرف نقن صاحب (۳) اہلیۂ مولانا سید ابوالحسن صاحب (۴) دختر سید علی نقی صاحب۔

آرام گاہ سید العلماء سے متصل ایک قدیم مسجد بھی ہے جس کی مکمل مرمت مولانا سید باقر صاحب قبلہ نے کرائی ہے۔ امام باڑے کے موجودہ متولی مولانا سید باقر صاحب قبلہ، مولانا سید علی نقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔

□□

حواشی:

۱ سید آغا مہدی تاریخ لکھنؤ (کراچی ۱۹۷۶ء) جلد اول صفحہ ۳۰۔

۲ شیخ تصدق حسین بیگماتِ اودھ (کتاب نگر لکھنؤ) صفحہ ۱۴۲۔

۳ شیخ تصدق حسین "لکھنؤ کے دو تاریخی امام باڑے" (استقلال لکھنؤ ۲۳ اگست ۱۹۵۱ء صفحہ ۲

۴ سید آغا مہدی تاریخ لکھنؤ (کراچی ۱۹۷۶ء) جلد اول صفحہ ۱۲۳۔

خان محمد عاطف
۴/۲۲ ۔ اسٹیشن روڈ ۔ لکھنؤ ۱

ملیح آباد :: اپنی تہذیب و ثقافت کے آئینے میں

بنگاہ رَد بروُ اے طالبانِ شیشہ دل   کہ ہے یہ مدرسۂ شاعرِ ملیح آباد

ملیح آباد کی تہذیبی زندگی پر شیوخ، سادات، مغلوں، کاشتکوں اور پٹھانوں نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ ملیح آباد اپنے نام کے ساتھ شیخ ملیح کے نام سے منسوب ہے۔

محمد غوری کا منہ بولا بیٹا قطب الدین ایبک اور اس کا ہمسفر بختیار خلجی اپنی صلاحیتوں اور بہادری کے نتیجہ میں محمد غوری کے منظورِ نظر تھے۔ ایک دہلی کے تخت پر بیٹھا تو دوسرا بنگال تک فتح کے ڈنکے بجاتا اور جگہ جگہ بختیار نگر و خالص پور یا بختیار پور آباد کرتا چلا گیا۔ ساتھ ہی ہندوستانی و افغانی تہذیب کے نقوش بھی چھوڑے۔ جن میں علاقوں کی فتوحات کے مقابلہ میں دلوں کو جیتنے کا جذبہ زیادہ تھا۔

ایمن زئی قبائل کے شمشیر خاں جن کا مرکز بختیار نگر اور سنجر خاں جن کا مرکز خاص گڑھی سنجر خاں رہا۔ نواب شمشیر خاں اور نواب سنجر خاں کے قبضہ میں نوسو نواسی گاؤں، ترپن توپ اور آبپاشی کے لیے باون کنوئیں تھے۔ یہ علاقہ گنگا کے دہانے اناؤ سے شروع ہو کر دریا آباد کو گھیرتا ہوا سرجوندی تک جاتا تھا۔

بازید خیل قبیلہ کے لوگ جگلہ دار تھے۔ بختیار نگر میں اسی خاندان کے حسین علی خاں تخلص جویا صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس قبیلہ کا افغانستان کے خرشبن خلف سربنی سے سلسلۂ نسب ملتا ہے۔

ملیح آباد کے سادات نے علم و حکمت و طبابت میں اپنے جوہر دکھائے ان کی بزرگانہ شان کا مرکز دھیول شریف ہے۔ ان میں سے کئی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ سید حسین احمد صاحب جو مشہور طبیب بھی تھے۔ سید احمد بریلوی کے ساتھ جہاد پر گئے تھے۔ یہ شاہ صاحب کے مدرسہ کے فارغ تھے۔ فقیر محمد خاں گویا ان سے بیعت تھے۔

محمد حسن انصاری صدر پور کے باشندہ تھے۔ یہ ٹونک میں شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولوی قدرت اللہ بیگ راؔو نے انھیں سے فارسی پڑھی تھی اور قدرت اللہ بیگ سے جوشؔ ملیح آبادی نے فارسی زبان پڑھی تھی۔ خالص پور میں حکیم سعید احمد خاں بھی بڑے پائے کے حکیم تھے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں قاسم خاں آفریدی پشاور سے ملیح آباد آیا۔ کچھ دن یہاں قیام کیا۔ قاسم گڑھی اس کی یادگار ہے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھا اردو اور پشتو دونوں میں کہتا تھا۔ اس کا پشتو دیوان رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے اور اردو دیوان بنام دیوانِ آفریدی اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں ہے۔

قاسم خاں کا باپ برہان الدین دہلی میں ۱۸۲۱ء اردوئے معلیٰ کا ماہر تھا۔ قاسم خاں نے اپنی کتاب شفاعتِ آفریدی میں ایک منقبت کا بھی ذکر کیا ہے جو تلف ہو چکی ہے۔

آصف الدولہ کا وزیر خزانہ راجہ ٹکیت رائے ملیح آباد کے محلہ منشی گنج کا باشندہ تھا۔ اس زمانہ میں کاکوری کے خاندانِ قلندریہ کی دعا سے ٹکیت رائے کو یہ مرتبہ ملا تھا اور انھیں کے کہنے سے ٹکیت رائے "راجہ" ہو گئے تھے۔

مگر ملیح آباد کو تہذیبی عروج اور سربلندیاں قندھاریوں اور آفریدیوں کی آمد سے نصیب ہوئیں۔ حضرت داؤد کی آٹھویں پشت میں حضرون کی بیوی کا نام افراتہ تھا جو نہایت عقلمند خاتون تھیں۔ آفریدیوں کا نسب کئی وسیلوں سے وہاں تک پہونچتا ہے۔

ملیح آباد کے شمال میں پندرہ کلو میٹر پر راجپوتوں کی بستیاں ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں راجہ کہلائے جاتے ہیں۔ نواب فقیر محمد خاں گویا نے یہ علاقہ راجگان سندیلہ سے حاصل کیا تھا۔ پھر وزیر اودھ آغا میر کی دعوت کی تھی جس کے لیے ایک بارہ دری اور پانچ محلات تعمیر کروائے تھے۔ پھر اپنے

تعلقہ کو اپنے دو بیٹوں محمد احمد خاں اور نسیم خاں میں برابر سے تقسیم کر دیا تھا۔ قندھاریوں کا مرکز خالص پور تھا۔

نواب احمد خاں کے ایک سو تیرہ اولادیں تھیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اسحٰق خاں تعلقدار بنائے گئے تو بڑے بیٹے ملیح آباد چھوڑ کر سندیلہ چلے گئے تھے۔ اسحٰق خاں میں قبائلی زندگی کی بے شمار خصوصیات تھیں۔ بڑے کنبہ پرور اور اپنی بیٹیوں کے لیے جاں نثاری کا جذبہ رکھتے تھے۔ بیٹیوں سے ان کی محبت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ مال کے ٹھاکروں میں ان کے ایک مخالف کی بیٹی رخصت ہو کر ان کے علاقے سے گزر رہی تھی ان کو پتہ چلا تو انھوں نے بارات روک لی۔ بازار کے حلوائیوں کو حکم دیا کہ تین دن تک باراتیوں کے لیے کھانا پکے گا۔ پھر خود تشریف فرما ہوئے اور کہا تو میری بیٹی ہے تیری سسرال والے کیا کہیں گے کہ چچا کی بستی سے گزرے تھے پھر معلوم کیا کہ کیا کیا جہیز میں دیا ہے۔ تین دن کے بعد جہیز اور دولھا کو سلام کرائی دے کر رخصت کیا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے بھاگ کر ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی تو انھوں نے کہا۔ اسحٰق خاں صاحب مرد آدمی ہیں وہ اپنی بیٹیا کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیں گے اور مجھے جھکنے پر مجبور کر دیں گے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ ان کے بیٹے حبیب خاں صاحب کا ہے۔ جب تک حبیب خاں زندہ رہے ان کے مقابلہ پر ٹاؤن ایریا میں کوئی چیرمین نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ انگریز کمشنر بھی موجود تھا۔ نواب محمد علی خاں جو ان کے چچا ہوتے تھے دیر میں پہونچے تھے۔ حبیب خاں کمشنر کے بغل میں بیٹھے تھے۔ کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ حبیب خاں کی جب نظر پڑی تو وہ منزل تھی جہاں نواب صاحب بے عزت ہو جاتے۔ فوراً حبیب خاں نے کھڑے ہو کر کرسی خالی کر دی ان کے کھڑے ہوتے ہی انگریز کمشنر بھی کھڑا ہو گیا تو سب کھڑے ہو گئے۔ خیال رہے کہ ملیح آباد کی سیاست میں دونوں کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ جلسہ ختم ہوتے ہی نواب صاحب نے کہا۔ حبیب جانے سے پہلے مجھ سے بات کر لینا۔ مگر حبیب خاں نے جواب دیا چچا وہاں لڑائی جاری رہے گی۔ یہاں آپ کی عزت نہ کرتا تو میں بے عزت ہو جاتا۔ یہ تہذیبی قدریں آج ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

افغانوں کی حوصلہ مندی، زندگی کی سادگی، یقین کی پختگی، اخلاقی قوت و طاقت، قومی و قبائلی روایات اور اپنی تاریخی ثقافت سے رابطہ اور بزرگوں کی روایات کے مطابق مہمان نوازی، غیر کی اطاعت سے نا آشنائی کمزوروں کی مدد پر کمر بستہ، دوست داری و عزت مندی کے خاص جوہر ہیں۔ جس کو جوش نے یوں ادا کیا ہے ؎

ہمیشہ جاگتا رہتا ہوں محنت کی چٹانوں پر
تن آسانی کے بستر پر مجھے سونا نہیں آتا

پٹھانوں میں شاعری کا ذوق شروع سے ہی رہا ہے۔ عورتیں تک منظوم لوریاں دے کر بچوں کو سلاتیں اور ٹپّے یا "لنڈی" میں اپنی فکر و خیال کو ادا کرتیں۔ پشتو میں ایک عورت اپنے محبوب سے کہتی ہے۔ وطن پر دشمن چڑھ آئے ہیں تو جا اور دشمنوں سے جنگ کر اور اگر تو کام آ گیا تو اپنی زلفوں کے تاروں سے تیرا کفن بناؤں گی!

بکسر کی لڑائی کے بعد عبد الرحمٰن خاں قندھاری کو چودہ گاؤں معافی کے طور پر ملے تھے۔ چھ گاؤں ملیح آباد میں جس کا صدر مقام خالص پور تھا۔ ان کا تعلق افغانستان میں قندھار کے علاقہ قلات سے تھا۔ شاہ عالم خیل بیں غلزئی قبیلہ کی شاخ سلیمان خیل سے تھا۔ ان کے والد شہزادہ محمد یوسف نادر افشار سے شکست کھا کر ہندستان آ گئے تھے جن کی حیثیت شاہی مہمان کی تھی۔ اس وقت اودھ کی راجدھانی فیض آباد تھی۔ فیض آباد میں جہاں رہے وہ علاقہ قندھاری بازار کہا جانے لگا جب دار السلطنت لکھنؤ آیا تو لکھنؤ میں ان کا مسکن قندھاری بازار کہلایا۔

مولانا حیدر علی خاں خالص پوری بڑے مرتبہ کے آدمی تھے۔ ان کے علمی مرتبہ کا یہ عالم تھا کہ افغانستان و ایران سے لوگ مثنوی روم کے مطالب سمجھنے آتے تھے۔ علامہ شبلی بھی ان کی زیارت کو خالص پور گئے تھے۔

سردار محمد خاں پنجہ کشی کے ماہر تھے۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ جو ان کا پنجہ موڑ دے گا۔ اس کو پانچ سو روپیہ انعام ملے گا۔ افغانستان تک سے پنجہ کشی کے ماہران سے پنجہ لڑانے آتے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی ان کو نگاہِ محبت سے دیکھا تھا۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف سردار محمد خاں کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور جب مولانا آزاد کو سردار محمد خاں کی موت کی خبر موصول ہوئی تو مولانا آبدیدہ ہو گئے۔ سردار محمد خاں خالص پور ہی میں سکونت پذیر تھے اس وقت خالص پور کے لیے یہ فقرہ مشہور تھا کہ خالص پور قندھار ہے جس میں نو سو جوان کم کسے۔

محمد خاں قندھاری نے "شرع محمدی" منظوم لکھی۔ جو ملک دین محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے ۱۹۳۹ء میں چھٹی بار چھپا ہے سرورق پر لکھا ہے ؎

سب مطابق اصل کے ہو باقیں — دخل کچھ اس میں تصرف کا نہیں

میر عوض علی عدیل ملیح آبادی ولد میر چاند علی سید حسینی کتب درسیہ سلامت اللہ لکھنوی سے پڑھیں۔ فن خوشنویسی حافظ ابراہیم سے سیکھا۔ نواب محمد سعید خاں والی رام پور نے نواب یوسف علی خاں ناظم کی تعلیم و تربیت کے لیے میر عوض علی کا انتخاب کیا۔ میر صاحب نے رام پور میں خوشنویسی کا ذوق پیدا کیا اور اپنے بہت سے شاگرد چھوڑے۔ چند رسائل بھی تصنیف کیے جن میں رسالہ سہل ممتنع املاء، صحت الملوث (طب میں) ستور العمل تدبیرو معاش مساکین وقحط سالی۔ (فارسی) انتظام السعید (فارسی) مرحوم کی قبر جنرل اعظم خاں کے مقبرہ کے چبوترہ میں آگئی ہے۔

منشی عبدالرؤف خاں لطف نے ایک کتاب بنام نیرنگ خیال لکھی تھی۔ گلدستۂ نجات یا وسیلۂ نجات منظوم اور مولانا روم کی مناجات کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ ملیح آباد میں تین چیزیں عجائبات عالم کی طرح مشہور ہیں۔ عزیے کی "نہیں" نبی شیر خاں کا "لٹھ" اور غنی احمد خاں کا "قلم"

جلیل احمد خاں جلیل گڑھی سنجر خاں میں رہنے لگے تھے۔ اصل باشندے بکھو لہار کے تھے۔ آخری عمر میں بادشاہ ہو گئے تھے۔

نواب محمد احمد خاں کی بیٹی علی بیگم جوش کی پھوپھی تھیں وہ کہتی ہیں ؎

ایک صیاد کی خاطر مرے کنبا مارا
میں وہ بلبل ہوں کہ گلشن میں نہ آؤنگی کبھی

اپنے ہی تہذیبی دائروں میں شعر و ادب کو ہمہ گیر بنانے کا کام بڑے حسن و خوبی سے اہل ملیح آباد نے انجام دیا ہے۔ سائنسدانوں اور فلسفیوں کی طرح طے شدہ راہوں پر نہیں چلتا بلکہ شاعری فلسفہ کے بے روح ڈھانچہ میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔

ولی کمال خاں لکھنؤ یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ انتھراپالوجی اور اردو میں ایم اے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور عارف ادیب قلمی نام لکھتے ہیں۔

گیتی کوئی نظیر محمدؐ کے طرز کی — پیدا نہ کر سکی یہ شہادت ہے چرخ کی

مائل ملیح آبادی شاعر و ادیب ہیں دو سو سے زیادہ سماجی، اصلاحی اور تاریخی ناولیں لکھ چکے ہیں۔ ان کا انداز دیکھیں ؎

دربار میں شاہوں کے بھی سر خم نہیں کرتے
دنیا ہی کرتی ہے مگر ہم نہیں کرتے

سید محمد علی عرش ملیح آبادی شیفتہ کنتوری کے شاگرد تھے۔ قیام حیدرآباد میں ۳۱-۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا، ملیح آباد کے واقعات جمع کیے تھے۔ جن میں عورتوں کے گیت۔ اپنا شجرہ۔ ملیح آباد کے مدرسوں، طلباء۔ پیشہ وروں، اسپتال، ڈاکخانوں اور تھانوں کی تفصیلات کے علاوہ اہم لوگوں کے نام شامل ہیں۔ ان کی فارسی کتب (۱) جوھر فرد (۲) دوحۃ الصنائع ہیں۔

فضل اللہ خاں فضل قطعی ان پڑھ تھے۔ غدر کی بربادی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی۔ پھر لکھنؤ سے خالص پور چلے گئے تھے۔ فضل کے یہاں دنیا کی بے ثباتی صوفیانہ نہیں بلکہ سوالیہ نشان ہے ان کے اشعار میں غدر کی بربادیوں کی جھلک ہے ان کا شعر ملاحظہ ہو ؎

زندگی میں جو کہ بے مشعل نہ چلتے تھے کبھی — اب نظر آتا نہیں ان کے سر مدفن چراغ

ملیح آباد میں علمی و ادبی دنیا میں چار ہستیاں عالمی شہرت کی مالک ہیں۔

سید امیر علی ملیح آبادی جنھوں نے علم دین میں، عربی ادب میں اور علم حدیث میں علمائے عرب سے خراج تحسین حاصل کیا۔

۱۔ تیس جلدوں میں تفسیر قرآن مواهب الرحمٰن کے نام سے مرتب کی۔ بخاری شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب عین الہدایہ کا چار جلدوں میں ترجمہ کیا۔ فتاویٰ عالمگیری کا بھی ترجمہ کیا۔ اس پر سو صفحات کا عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ عہد اکبری میں فیضی کی تفسیر غیر منقوطہ سواطع الالہام کی تصحیح کر کے عربی زبان میں ویسا ہی غیر منقوط مقدمہ بھی لکھا۔

۲۔ مولوی قدرت اللہ بیگ عربی و فارسی کے عالم بے بدل تھے ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ انھوں نے چھ ہزار چھ سو اشعار فارسی میں رسول اکرمؐ کی شان میں غیر منقوطہ کہے۔ ایک شاھنامۂ اسلام بھی منظوم لکھا تھا جس میں فردوسی کی کوتاہیوں کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ دنیائے شاعری میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی جن کے اندر شاعر شباب، شاعر فطرت، شاعر خمریات اور شاعر خدا شناس اور نہ جانے (باقی)

یوگیش پروین
۵۹ ، غوث نگر، لکھنؤ

لکھنؤ کے قدیم مشہور مندر

علی گنج واقع ہنومان مندر

شہر لکھنؤ کی شناخت باغوں اور محلوں سے تو ہے ہی لیکن یہاں باغوں اور محلوں کے علاوہ بھی متعدد ایسی نشانیاں اور باقیات موجود ہیں جو سیاحوں کے لئے یک لخت کشش اور دلچسپی کے مرکز ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں ہم چند مندروں کا ذکر کرنا چاہیں گے۔

● لکھنؤ کے دیوی مندر

لکھنؤ کے مندروں میں سب سے زیادہ اہمیت دیوی مندروں کی رہی ہے یہ دیوی مندر کم سے کم ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

● کالی مندر

لکھنؤ کے چوک علاقہ میں دہلا کنواں اور پان والی گلی کے درمیان مشہور دیوھٹ بڑی مندر ہے جو بہت ہی قدیم مندر ہے۔ اس مندر کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں گومتی اس مندر کے قریب سے ہی کہیں بہتی تھی۔ اس مندر کی تعمیر بلندی پر ہے۔ مندر سے ملحق سرکٹا نالہ بہتا ہے جس کی دیواروں میں گپت زمانے کی اینٹیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اصل مندر چاروں طرف سے کئی چھوٹے چھوٹے مندروں سے گھرا ہوا ہے جن میں ایک مندر کی چوٹی گیا طرز کی ہے۔ اس مندر میں چار ہاتھوں والا ایک مجسمہ نصب ہے جو ہزارہا برس قدیم کے باقیات میں سے ایک ہے۔ نوراتری کے دنوں میں یہاں کثیر تعداد میں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔

● چندریکا دیوی کا مندر

لکھنؤ میں چندریکا دیوی کی وہی اہمیت ہے جو کشمیر میں کھیر بھوانی کی ہے کہا جاتا ہے کہ رام کے بھائی لکشمن کے بڑے بیٹے کنور چندر کیتو جب اشوک میگھ یگ کے گھوڑے کے ساتھ نومی سارن کی طرف روانہ ہوئے تو مانڈو رشی آشرم سے آگے گومتی کے کنارے ایک خیمہ نصب تھا۔ اماوس کی شبانہ رات تھی جہاں انھوں نے دیوی منتر پڑھا۔ دیوی منتر پڑھتے ہی ماں درگا چودھویں کے چاند کے مثل نمودار ہوئیں۔ بعد میں چندر کیتو نے اس مقام پر بھگوتی کو چندریکا کے نام سے موسوم کرتے ہوئے ایک مندر قایم کیا۔

اس علاقے میں بھی گپت کے زمانے کے نشانات ملتے رہتے ہیں چونکہ درگا اماوس کی رات میں ہی ظاہر ہوئی تھیں اس لئے آج بھی ان کی پوجا کا دن اماوس ہی مقرر ہے اور اس دن یہاں مندر پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے

● شیتلا دیوی مندر

قدیم مشہور شیتلا دیوی مندر لکھنؤ کے مہدی گنج میں واقع ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ اس مندر کی تعمیر سیتا کے بیٹے لو نے کرائی تھی۔ جس کی بعد میں تعمیر نو بنجاروں نے کرائی تھی۔ اس مندر میں شنگ کے وقت کی مورتیاں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ہولی کے بعد کی اشٹمی کے دن یہاں ایک میلہ لگتا ہے جو آٹھوں کے میلے کے نام سے مشہور ہے۔

● مساتی دیوی مندر

یہ قدیم مندر سعادت گنج میں واقع ہے اس مندر میں نرسنگھ بھگوان کی ایک سفید خوبصورت سی مورتی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں ضیاء الدین مالی نے اس مندر کی

تعمیرِ نو کے لئے ایک نقشہ بنایا پیتل کے صدر دروازے پر بڑی خوبصورتی سے گن پت اور بھوانی کے چہرے ابھارے گئے ہیں۔ اس مندر کی پوجا کا خاص دن بدھ ہے جہاں لوگ اپنی مرادوں کے لئے چوکی بھرتے ہیں اور اس کے لئے سات بدھ جاکر چوکھٹ کو پھول، پان، لونگ، بتاشے اور چاول سے سجاتے ہیں۔

بدھیشور مہادیو کا مندر

لکھنؤ میں شہ درا کے قریب ساون کے مہینے میں ہر بدھ کو بدھیشور مہا دیو کا میلہ لگتا ہے۔ بدھ گنیش کا دن ہے اور بدھ چاند کا بیٹا بھی ہے اس لئے شیو سے ان کا سیدھا تعلق ہے

اس مندر کا شیو لنگ گپت کے زمانے کا ہے۔ اس مندر کے قریب دھنیا مہری نے راستے میں پڑنے والے ایک نالہ پر پل بنوایا تھا جس کے نشانات آج بھی برائے نام ہی سہی مل جاتے ہیں۔

من کامیشور شیو مندر

لکھنؤ میں گومتی کے بائیں کنارے پر واقع کامیشور مندر بہت قدیم شیوالہ ہے۔ اسے راجہ ہرنیہ دھنو نے دشمن پر غلبہ پانے کے بعد تعمیر کرایا تھا جس کی چوٹی ۲۲ سونے کے کلشوں سے سجی ہوئی تھی۔ بارہویں صدی عیسوی میں یمنی حملہ آوروں نے اس مندر کا تمام سونا لوٹ کر اسے برباد کر دیا تھا جو تعمیرِ نو کے بعد اب اس شکل میں ہے۔ موجودہ مندر کی تعمیر سیٹھ پورن داس نے کرائی تھی۔

لکھنؤ کے مشہور شیو آلے

بڑا شیوالہ ۔ یہ لکھنؤ کے رانی کٹرہ محلے میں کشمیریوں کا سیکڑوں برس قدیم ایک شیوالہ ہے جو بڑے شیوالے کے نام سے مشہور ہے اس مندر میں مشرقی ہند کا سب سے بڑا شیولنگ ہے

رتنیشور شیو مندر

یہ مندر اٹونجہ میں ہے جس کو ۱۸۹۲ء میں اٹونجہ کے راجہ اندر وکرم سنگھ نے بنوایا تھا۔ بلندی پر بنے اس مندر میں پانچ خوبصورت چوٹیاں ہیں۔ کمرخی ڈھنگ کی چوٹیوں کی نقل بعد میں کاشی ڈیرا کے ناگیشور شیو مندر میں کی گئی مندر کے درمیانی حصے اور برآمدوں میں خوبصورت تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

پھاگن کے مہینے کی شیوراتری کے موقع پر یہاں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی پھاگن کے مہینے میں اس مندر کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا۔

کاشیشور مہادیو کا مندر

کاشی شیو کی نگری ہے اسی لیے بھگوان شیو کو کاشیشور کہا جاتا ہے۔ لکھنؤ ضلع کے جنوب مشرقی علاقہ موہن لال گنج کے کاشیشور مہادیو مندر کی تعمیر سیڈی کے تعلقدار راجہ کاشی پرشاد نے ۱۸۶۰ء میں کرائی تھی۔

شیوالے کے ساتھ آٹھ کونوں پر آٹھ مندر اور بنے ہوئے ہیں۔ درمیانی مندر بہت بلند اور خوبصورت ہے۔

کلیان گری مندر

لکھنؤ کے مغرب میں کاکوری روڈ پر کلیان گری کا علاقہ ہے۔ وہیں سڑک کی بائیں جانب بلندی پر کلیان گری مندر بنا ہوا ہے۔ اس مندر کو ہری دوار کے ایک سنت باباکلیان گری نے قائم کیا تھا۔ اس مندر کی تعمیر میں آصف الدولہ کے دیوان راجہ مہرا نے مالی امداد فراہم کی تھی اس مقام پر باباکلیان گری اور بعد کے متعدد مہنتوں کی سمادھیاں بھی ہیں۔ مہاشیوراتری اور کجلی کے علاوہ ساون کے ہر پیر کو یہاں میلہ لگتا ہے۔

علی گنج کا قدیم ہنومان مندر

لکھنؤ میں علی گنج کا قدیم ہنومان مندر عہدِ نوابین اودھ کی قومی یک جہتی کا ترجمان ہے۔ اس مندر کی چوٹی پر آج بھی چاند کا نشان چمک رہا ہے۔ نواب شجاع الدولہ کے دوسرے بیٹے نواب سعادت علی خاں کی ماں چھترکنور نے منگل کے دن پیدا ہوئے اپنے بیٹے کا نام منگلو رکھا تھا۔

نواب سعادت علی خاں جب ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء میں والئ سلطنت اودھ ہوئے تو ان کی ماں کو راج ماتا کا درجہ ملا اور اس دن سے ان کی ماں جناب عالیہ کہی جانے لگیں جنھوں نے بہو بیگم کے بسائے گئے محلے علی گنج میں ہنومان مندر بنوایا۔ نوابین اودھ مہاویر جی کے لئے احترام و عقیدت رکھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس صوبہ میں بندروں کے شکار پر ہمیشہ پابندی رہی ہے۔ جان عالمؔ واجد علی شاہ اپنے زمانے میں بڑے منگل کے موقع پر ایک دعوتِ عام اہتمام کرتے تھے۔

علی گنج کا مہاویر مندر

علی گنج کے ہنومان مندر کے قریب ہی ایک عطر فروش جاٹ مل نے ۱۷۸۳ء میں ایک مہاویر مندر کی تعمیر کرائی۔ اس مندر کے قریب پہلے ایک بہت ہی قدیم تالاب تھا جو پشکرنی کے نام سے مشہور تھا۔

لکھنؤ کے تمام ہنومان مندروں میں آج اس مندر کی سب سے

(باقی صفحہ ۱۵۱ پر)

انیس انصاری
ٹائپ ۲، فلیٹ ۲/۲۔ ڈالی باغ۔ لکھنؤ

اودھ کی تہذیب کا عروج اور زوال

اودھ کی تہذیب کا تصور آج کل اس تہذیبی روایت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو اس دور حکومت میں پروان چڑھی تھی جس کا سلسلہ سعادت خاں برہان الملک (۱۷۲۲) سے شروع ہو کر واجد علی شاہ (۱۸۵۶) پر ختم ہوا۔ یہ تہذیبی روایت صحیح معنوں میں ہندستانی روایت تھی اگرچہ اس میں پرانی ہندو تہذیب پر ایرانی فارسی تہذیب کا نمایاں اثر تھا۔ اس روایت نے زندگی کے سبھی شعبوں پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ دلی کے مغل بادشاہوں کی روایت سے لے کر چھوٹے طبقوں کے رسم و رواج نے اس کے بنانے میں مدد دی تھی۔

اس تہذیب کے نمایاں اثرات اس علاقے کے لباس پر بھی پڑے اور دو پلی ٹوپی، شرعی انگرکھے، چوڑی دار پاجامے، بڑے بڑے ریشمی رومال، ململ اور ریشم کے کڑھے ہوئے کرتوں، سلمے ستارے کی رضائیوں، مخمل کے لحاف اور مخملی جوتوں وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ کھانے پینے کے طریقوں میں پلاؤ، خاسگی، متنجن، مزعفر، شیرمال، پراٹھے، کباب، قورمہ، برفی، بالائی وغیرہ میں تبدیلی آئی۔ بات چیت کے طریقوں اور زبان و ادب میں نئی ڈگر کی شروعات ہوئی مثلاً مرثیہ، مثنوی، غزلوں وغیرہ میں لکھنؤ کا الگ اسکول قائم ہوا۔ تفریحی مشغلوں میں پتنگ بازی، مرغے بازی اور بٹیر بازی وغیرہ کے میدان گرم ہوئے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طوائفوں کو سماج میں بلند مقام ملا۔ رقص و موسیقی میں کتھک ٹھمری، خیال کی گائیکی اور رہس میں نئے تجربے ہوئے۔ اس تہذیب کے اثرات مصوری، خطاطی، مشاعروں، مجلسوں، دستکاریوں مثلاً چکن اور کامدانی کارچوبی اور سلمہ ستارہ کے کام، چاندی سونے کے زیورات، پیتل تانبے کے برتنوں مٹی کے برتنوں اور کھلونوں اور علمی ثقافتی اداروں جیسے فرنگی محل، سلطان المدارس خاندان اجتہاد، نولکشور پریس اور اودھ پنچ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

سب سے دیرپا اثر غالباً یہاں کے اس مزاج کو بنانے پر پڑا جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی اس روایت کی مضبوط ترین کڑی بن گئی جو بغیر کسی پروپگنڈے کے عوام اور خواص کی روزمرہ کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔

اودھ کی تہذیب کی ترقی مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کی دین تھی۔ ایک طرف بکسر کی جنگ (۱۷۶۴) میں شجاع الدولہ کی شکست سے انگریزی تاجروں اور سیاسی رہنماؤں کو دلی کی مغل حکومت کو کمزور کرنے کا سنہرا موقع ملا تو دوسری طرف اودھ کے نوابوں کو اسی مرکزی حکومت سے خود مختاری حاصل کرنے کی گنجائش دکھائی دی۔ انگریز اس بات کو جانتے تھے کہ اودھ کا صوبہ مالی، سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے بیحد کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے شکست خوردہ اودھ کے نوابوں کا استعمال مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کیا۔ ان حالات کا فائدہ اودھ کے نوابوں نے اٹھایا اور اپنے دربار کو دلی کے مغل دربار سے ممتاز کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس کا سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں اودھ کی سلطنت جو مغلوں کی صوبہ دار تھی ۱۸۱۸ سے باقاعدہ خود مختار بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر اودھ کے نوابوں نے مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے بجائے انگریزوں کے خلاف دلی حکومت کا ساتھ دیا ہوتا تو کیا ۱۸۵۶ میں واجد علی شاہ کی معزولی اور ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی میں ہندستانیوں کی شکست کو روکا یا ٹالا جا سکتا تھا۔

سن ۱۸۵۷ کے غدر یا جنگ آزادی نے واضح طور پر ہندستان میں برطانوی حکومت کو استحکام اور بالادستی دے دی۔ اس وقت یورپ دنیا بھر کی کل مصنوعاتی پیداوار کا ۵۳٪ سے زیادہ پیداوار کر رہا تھا۔ باہری ملکوں میں برطانیہ کی برآمدات تمام ملکوں سے زیادہ تھی۔ تکنیکی اور صنعتی علم بھی برطانیہ کی دسترس میں اور ملکوں کی بہ نسبت زیادہ تھا۔ سن ۱۸۵۷ میں ہندستانیوں کی شکست بنیادی طور پر صنعتی اور تجارتی طور پر بیحد ترقی یافتہ، سائنس اور تکنیکی میں سب سے

آگے، برطانیہ کے سامنے پچھڑے ہوئے۔ کھیتی باڑی اور چھوٹی صنعتوں پر منحصر ایشیائی معاشرے کی ہار تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے عوام کو سائنس اور تکنیکی کے میدان میں شعوری طور پر آگے بڑھایا ہوتا تو کیا ۱۸۵۷ کی جنگ میں ہندستان کی شکست کو ٹالا یا روکا جا سکتا تھا؟ یہ سوال آج بھی اہم ہے کیونکہ آج بھی یورپ اور امریکا تکنیکی میں ترقی یافتہ ہیں اور ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں تکنیکی پچھڑا پن موجود ہے۔ جاپان اور کوریا وغیرہ کی مثالیں استثنا ہیں۔ سائنس اور تکنیکی میں پچھڑے طبقے آج بھی کمزور ہیں۔

اودھ کے سماجی نظام میں جاگیردارانہ نظام جاری تھا۔ پیداواری طبقہ نسبتاً کم تعلیم یافتہ تھا۔ پیداواری طبقہ تعلیم یافتہ ہو تو تکنیکی کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ اس سماج کے شرفا پیداواری شعبے سے سیدھے جڑے نہیں تھے۔ وہ پیداواری طبقوں کو کم حیثیت والا سمجھتے تھے۔ اس سوچ کی وجہ سے شرفاء کا طبقہ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی پیداوار کی تکنیک میں سدھار لانے کی فکر یا حیثیت میں نہیں تھا۔ انگریزوں اور انگریزی تعلیم سے نفرت اور خوف کی وجہ سے شرفا صنعتی ترقی کے لئے پیداواری طبقے کی رہبری نہیں کر سکے۔ آج بھی پیداواری طبقہ نسبتاً کم پڑھا لکھا ہے۔ کیا ہمیں اس معاملے میں ایسا انتظام نہیں کرنا چاہیے کہ پیداواری طبقوں کو نئی تکنیکی جانکاری آسانی سے مل سکے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ اور اس کی منصفانہ تقسیم ہو سکے۔

اودھ کی تہذیب بنیادی طور پر درباروں اور درباداری سے متاثر تھی۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ براہ راست اس روایت کی تعمیر اور ترقی میں شامل نہیں تھا۔ اگرچہ عوام اس تہذیب سے متاثر تھے۔ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ تہذیب بڑے پیمانے پر عوام کے طبقوں کے موثر اشتراک سے بنی ہوتی تو کیا یہ تہذیب اور زیادہ مدت تک قائم رہ سکتی تھی۔

اودھ کی تہذیب نے جذباتی ہم آہنگی کو عوام و خواص کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا۔ اس تہذیب کے زوال پذیر ہونے سے ہندو، مسلمان، شیعہ سنی امیر و غریب کے بیچ فاصلوں کو بڑھاوا ملا ہے۔ ایک سی میٹھی زبان، یکساں رہن سہن ایک سی سوچ نے مختلف فرقوں کے فرق کے باوجود سب کو ایک ہندوستانیت کے رشتے میں پروئے رکھا تھا۔ آزادی کے کچھ پہلے اور آزادی کے بعد عمل میں لائی گئی زبان کی پالیسی، جمہوریت میں حکومت حاصل کرنے کے لئے عوام کو ووٹ بینک کی طرح استعمال کرنے کی ضرورت اور مادی وسائل کی نابرابر تقسیم نے شہریوں کے درمیان فرق کو نمایاں زیادہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم حکومت حاصل کرنے، اسے چلانے اور باقی رکھنے کے طور طریقوں اور سماجی و اقتصادی اداروں میں کیا ایسی تبدیلی نہیں کرنا چاہیں گے جس سے عوام کے طبقوں میں آپسی بھائی چارہ بڑھے اور عوام خوشحال ہو سکیں۔

اودھ کے زوال کی وجہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے اور نمائشی زندگی گزارنے کا وطیرہ بھی تھی۔ ہم آج بھی کئی معاملوں میں قومی سطح پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اگر اودھ کی حکومت بیجا اسراف کی وجہ سے کمزور ہوئی تو ہم آج کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے غیر ضروری اخراجات کا خراب اثر ہماری سماجی تنظیم پر نہیں پڑے گا۔ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

اودھ کے زوال کے پیچھے انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی بھی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں شیعہ سنی اور دیگر مسلک کے لوگوں کے بیچ اختلافات ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے سماج میں بکھراؤ پیدا ہوا اور اس کے خراب اثرات آج تک دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مذہب اور دھرم کے کٹر پنتھی رجحان کا اثر ہمارے موجودہ سماج پر بھی پڑ رہا ہے تو اسے کیسے روکا جائے۔ لکھنؤ کی تہذیب آپسی بھائی چارے، نفاست، شرافت نفس، وضعداری، فراخ دلی اور انسانیت کے رجحانات سے عبارت تھی۔ اودھ کی تہذیب کا محض یہ پہلو اسے احترام کے لائق بنانے کے لئے کافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ان پرانی لیکن بابرکت روایت کو کیا ہم لوگ دوبارہ زندگی کے ایجنڈے میں مرکزی جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اودھی تہذیب کا یہ رخ بیحد مفید اور سود مند ہے اور ہمیں اسے فروغ دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔

□□

بیگم حضرت محل کی یاد میں حکومت ہند کی طرف سے جاری کردہ ایک ڈاک ٹکٹ۔

فیض آباد کی تہذیبی روایات

لئیق اختر فیض آبادی
امام باڑہ. فیض آباد

مقبرہ نواب شجاع الدولہ (گلاب باڑی)

بادش بخیر — اودھ کا قدیم دارالسلطنت فیض آباد کبھی اپنی گنگا جمنی تہذیب، اپنی بے مثال ثقافت، اپنی شاندار روایات اور اپنی عدیم المثال قومی یکجہتی کا مرکز تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ کوئی تفرقہ تھا، نہ مزاجی تضاد، نہ کوئی بھید بھاؤ تھا، نہ کوئی اُتار چڑھاؤ۔ تیوہار دونوں مل جل کر مناتے، شادی اور غمی میں دونوں برابر کے شریک ہوتے۔ ہندو کی خوشی مسلمان کی خوشی ہوتی تھی، مسلمان کا غم ہندو کا غم ہوتا تھا۔ شب برات کے حلوے، عید کی سویاں، ہندو بھائیوں کے گھر جاتی تھیں، دیوالی کی مٹھائیاں، مٹی کے کھلونے، شکر سے بنی رنگین لوزاتیں مسلمانوں کے گھروں میں آتی تھیں، دسہرے کے جلوس اور بھرت ملاپ دونوں میں بخلوص دل شامل رہتے۔

تقسیم وطن کے بعد ہر طرف بھیانک فساد کے شعلے بلند ہوئے لیکن فیض آباد میں تقسیم وطن کا ہلکا سا بھی اثر نہیں پڑا۔ دونوں طرف کے خواص وعوام کبھی بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کے شکار نہیں ہوئے۔ یہاں امن کا گلشن ہرا رہا اور شانتی کا چمن کھِلا رہا۔ نہ سینے تنگ ہوئے اور نہ ذہن محدود ہوئے۔

مجھے یاد ہے کہ جب کچھ مسلمان جانب پاکستان ہجرت کرنے لگے تو ہندو عورتوں نے مسلمان عورتوں کو اور ہندو مردوں نے مسلمان مردوں کو گلے لگا کے اور اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کر کے ترکِ سکونت سے روکنا چاہا تھا۔ جب جانے والے نہ مانے تو لالہ رام داس نے ساتھ میں جانے والی ایک نا کتخدا صاجزادی کی ماں کو ایک جوڑ خالص سونے کے کنگن، ایک سونے کا نکلس اور ایک سونے کی نتھ موتیوں سے بھری دے کر کہا:۔ "بٹیا! جب دیارِ غیر میں میری اس نواسی کا بیاہ کرنا تو میری طرف سے اسے دے دینا۔"

تاریخ اودھ و ظفر نامہ بزبان فارسی اس حقیقت کا شاہد ہے کہ ہنومان گڑھی (ایودھیا) کی تعمیر میں نواب شجاع الدولہ کا کتنا ہاتھ تھا، چار محال ہنومان گڑھی کے نام لکھے تھے۔ وہ علمائے کرام، حکمائے وقت اور ساتھ ہی ساتھ سنتوں، سادھوؤں کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔

ایک تھے حکیم حاذق، ماہر نباض، بے مثال شاعر پیارے صاحب مرحوم۔ ان کے مطب میں عوام و خواص کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ بلاتفریق مذہب و ملت راجے مہاراجے، امرا، روسا، غربا، مساکین سب ہی ان کے مرہون منت تھے۔ باوضع، ملنسار، رحم دل، خوش مزاج، شیریں زبان۔ غریب مریضوں سے نہ دوا کے دام لیتے تھے اور نہ فیس لیتے تھے بلکہ زیادہ تر مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ خدا نے ایسی شفا ان کے ہاتھ میں عطا کی تھی کہ جس کو بھی ایک چٹکی خاک چٹا دیا کرتے تھے وہ شفایاب ہو کر ہر ایک سے کہتا پھرتا کہ

ایک چٹکی خاک کی کچھ ایسا کام آئی کہ بس

جب حکیم پیارے صاحب مرحوم ٹانگے پر بیٹھ کر نکلتے تھے تو گزرگاہ میں جو بھی ملتا وہ باادب فرطِ عقیدت سے سلام کرتا۔ ان کے دولت کدے

کے قریب ایک محلہ دلی دروازہ ہے جہاں ان کے عہد میں بھی اور آج بھی بڑے بڑے مہاجن رہتے ہیں۔ تمام مہاجن حکیم صاحب مرحوم کو دیوتا کی طرح پوجتے تھے — دوسری طرف عالمی شہرت کے سیاسی رہنما اچاریہ نریندر دیو جی تھے، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا امیر کیا غریب، کیا حکام، کیا حکام رس — سب ہی ان کے پرستار، ان کے نام کی پوجا کرنے والے۔

آنجہانی اچاریہ نریندر دیو جی کے بھائی تھے ڈاکٹر دیوا — صبح سے شام تک ان کے مطب میں مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ غربا کو دوا مفت دیتے گورے چٹے، کم سخن، مسکراتا چہرہ، ہمہ وقت لبوں پر تبسم۔ ایک باپ، ایک بڑے بھائی اور ایک مربی کی طرح ہر مریض سے سلوک کرتے۔ دور دور سے مریض آتے اور شفایاب ہو کر جاتے تھے — اگر کسی محلے میں ایک مریض کو دیکھنے جاتے تو محلے کے بہت سے مریض بھی وہاں جمع ہو جاتے۔ ڈاکٹر دیوا ہر مریض کو بڑے چاؤ، بڑے پیار سے دیکھتے۔ نہ ان کے ماتھے پر شکن پڑتی نہ ان کے ابروؤں پر بل۔

میرے ایک عزیز تھے مولوی محمد اختر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب اور محمد اختر دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ روزانہ ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا، آندھی آئے، پانی جائے لیکن کیا مجال جو ناغہ ہو جائے۔ جب میرے انہی عزیز کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر دیوا تصویر غم بن گئے تھے۔ عزیز کے گھر سے قبرستان تک ڈاکٹر دیوا نے جو جنازے کو کندھا دیا تو بدلا نہیں — روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"ہائے اختر! اب تمھارے بعد کیسے زندہ رہوں گا۔؟"

مولوی سید محمد اختر صاحب کے جنازے میں ہزاروں سوگوار شریک تھے۔ میں نے فیض آباد کی رواداری، اتحاد باہمی، قومی یک جہتی اور تہذیبی روایت کو بچشم خود دیکھا تھا کہ جب اختر صاحب مرحوم کی میت دفن کی گئی تو ڈاکٹر دیوا نے ایک مٹھی خاک قبر اٹھا کر اپنے آنسوؤں سے تر رومال میں یہ کہہ کر باندھ لیا تھا:

"تمھارے بعد اب یہ خاک قبر میرا سرمایۂ حیات رہے گی۔"

ایک تھے نواب محمد رضا مرحوم، بوٹا سا قد، ہر بزم کی رونق، ہر محفل کی زینت، ہر دل کے مکین، ہر زبان کے ساکن، ماہر علم موسیقی، پاٹ دار آواز،

جب وہ سُر تال کے عالم میں ہوتے تھے تو شعلے سے لپک جاتے تھے، اچھے اچھے موسیقاروں کا پتّا پانی ہوتا تھا ان کے روبرو، مرحومہ بیگم اختر کی والدہ مشتری ان کا بڑا احترام کرتی تھیں، جہاں جاتے تھے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ وہ پیشہ ور موسیقار نہ تھے، احباب کی جب پھڑ جمتی تب وہ آواز کا جادو جگاتے، ایرے غیروں کی محفلوں سے وہ اجتناب کرتے۔ ہر خاص و عام میں مقبول بھی اور محبوب بھی۔ فن کی وجہ سے نہیں حسنِ اخلاق، شرافت نفسی، نیازمندی، خاکساری کی وجہ سے۔ مرحوم محمد رضا کے ایک دوست تھے لالہ ستّی — بانکے سجیلے، بلا کے خوب رو، بہت شستہ اور فصیح اردو بولتے تھے۔ قیمتی دھوتی، کرتا، قیمتی جوتے پہنتے تھے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا میں چاندی کے ورق سے بنی سنوری پان کی گلوریاں ہوتی تھیں — چاندی کی گول مول ننھی سی ڈبیا میں خانہ ساز قوام۔ جدھر سے گزر جاتے وہ راستہ دیر تک قوام کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتا رہتا۔ اودھ کی شام جیسے ہی اپنی چھب دھب دکھانے کے لئے فیض آباد میں نمودار ہوتی لالہ ستّی بیلے، چمیلی موگرے کے موٹے موٹے گجرے اپنی کلائیوں میں باندھ لیتے۔

نواب محمد رضا مرحوم اور آنجہانی لالہ ستّی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ساتھ اٹھنا، ساتھ بیٹھنا، ہم خیال، ہم مزاج، ہم مشرب — کبھی کبھار اگر کوئی منہ لگا دوست ان دونوں کے یارانے پر مزاحیہ جملہ کس دیتا تو نواب محمد رضا مرحوم مسکرا دیتے لیکن آنجہانی لالہ ستّی نہلے پر دہلا پھینکتے:

"اجی حضرت! آپ کیا جانیں اس یاری کا کیف، جب تک ہندو کی "ہ" بے یار و مددگار تھی، بیچاری ہونق ہونق پھرا کرتی تھی۔ یہی حال مسلمان کی "م" کا تھا۔ نہ کوئی اس کا معین تھا نہ کوئی محبت کرنے والا، ماہی بے آب تھی۔ جب سے ہندو کی "ہ" اور مسلمان کی "م" ملی ہے "ہم" کی چاندنی دوستی کے کھلے صحن میں چھٹک اٹھی ہے"۔

نواب محمد رضا مرحوم اپنی عقبیٰ سنوارنے کے لیے خاص خاص مجالس میں سوز خوانی کرتے اور شہدائے کربلا علیہم السّلام کے چہلم کے دن قلب شہر میں واقع چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس ایک مخصوص نوحہ پڑھتے تھے۔ اس نوحے کو سننے کے لئے خلقت امنڈ پڑتی تھی۔ لالہ ستّی و دیگر ہندو رفقا گھنٹہ گھر کے نیچے ایک معززصراف کی دوکان کے تختے پر کھڑے ہو کر بنفس نفیس نوحے سنتے تھے۔ نواب محمد رضا مرحوم کے بازو بنتے تھے مرحوم کے صاحبزادے نواب مہدی رضا

نواب سجاد علی خاں، شیخ یوسف حسین چندو صاحب، نواب بتا جانی صاحب (افسوس کہ سب ہی آغوشِ لحد کی زینت بن چکے ہیں)۔ اس یومِ غم کے موقع پر نواب محمد رضا مرحوم جو نوحہ پڑھتے تھے اس کی ابتدا یوں ہوتی تھی :

بولیں زینب اُٹھو بہنا امِ کلثوم سے
بھیا کا ہم چہلم کرنے جائیں گے دھوم سے

لالہ سدّی و دیگر ہندو احباب نوحے کے ایک ایک مصرع پر بے انتہا گریہ کرتے تھے نواب محمد رضا مرحوم کے انتقال کے بعد آنجہانی لالہ سدّی مفلس کا بچراغ بن گئے تھے۔ کبھی کسی نے اس زندہ دل انسان کو مسکراتے نہ دیکھا۔

خان بہادر مہدی حسین صاحب بڑے وضعدار، پابندِ صوم صلوٰۃ دیندار، خدا ترس، جھوٹ سے متنفر، سچ کے شیدائی، پہلے مجسٹریٹ بنے پھر ڈپٹی کلکٹر۔ اصل وطن بارہ بنکی تھا، فیض آباد کی تہذیب، میل جول، شرافت انسانیت اتنی پسند آئی کہ فیض آباد کے ہوکر رہ گئے۔ دیوکالی روڈ پر ایک عالی شان کوٹھی بنوائی، صبح و شام حاجت مندوں کی حاجت روائی، یتیم پرستی اور غربا پروری میں مصروف رہتے، بے شمار نادار طلبا کی فیس ہمراہ اپنے پاس سے دیتے۔ کتابیں اور کاپیاں مہیا کراتے۔ عید بقرعید میں پریشاں حالوں کو نئے جوڑے دیتے۔ دینی مدرسوں کی بھرپور مالی مدد کرتے۔ کتنے ہندو اور مسلمان ان کی امداد کے ذریعے غربت کی پستی سے نکل کر دولت، عزت، شہرت کی بلندی تک پہونچے۔ مندر اور مسجد دونوں جگہ سالانہ گراں قدر عطیہ دیتے تھے کہتے تھے " میری ایک آنکھ ہندو ہے دوسری مسلمان "۔ وہ جب تک زندہ رہے انھوں نے غربت، مفلسی، پریشاں حالی، کس مپرسی پر نظر کی، کبھی نہ ہندو دیکھا نہ مسلمان۔ نہ ذات دیکھی نہ برادری ــ گھر کے اندر مسلم ملازم، گھر کے باہر ہندو ملازم۔ سب ہی وفادار، سب ہی جاں نثار دیوالی دسہرے میں ہندو ملازمین کو قیمتی جوڑے اور تہواری دیتے۔ گرمیوں میں سرِ شام اپنی کوٹھی کے سبزہ زار پر جب بیٹھتے تو شیعہ، سنی، ہندو اُمرا اور رؤسا ملاقات کے لئے آتے۔ پاس پڑوس اور شہر کے غربا بھی کرسیوں پر براجمان رہتے۔ کبھی بھولے چوکے بھی کوئی تفریق کی دیوار انھوں نے کھڑی نہ ہونے دی۔ ان کی شش جہت شخصیت ہمیشہ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام پر عامل رہی۔ ان کے پرستاروں اور وارفتگاں میں ہندو مسلم دونوں دل و جان سے شریک رہے۔ ان کے انتقال پر مسلمانوں سے زیادہ ہندو گریہ کناں تھے۔

خان بہادر بابو محبوب حسین خاں مرحوم ـــ بڑے کلّے ٹھلّے کے رئیس دُبلے پتلے کچھ دراز قد، جامہ زیب، لائق دید حویلی، صدری پھاٹک پر دربان اندر باہر ملازمین کی ریل پیل۔ رات گئے تک دربار لگا رہتا۔ آنجہانی راجہ صاحب اجودھیا بھی اکثر تشریف لاکر دربار سے لطف اندوز ہوتے۔ ممتاز ہندو مہاجن مسلمان سوداگر، وکلا، دانشور، ادیب، شاعر سب ہی حاضری کو شرف سمجھتے۔ کبھی بھی کوئی ضرورت مند ان کی ڈیوڑھی سے خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ مرحوم کے عقیدت مندوں اور حاشیہ نشینوں میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو رہتے تھے۔

آنجہانی رائے بہادر بابو پریا دت رام ـــ قلبِ شہر میں واقع محلہ رکاب گنج میں ان کی سفید کوٹھی آج بھی بابو جی کی شان و عظمت کی گواہی دے رہی ہے کیا آن بان والے اور کیا راج پاٹ والے تھے۔ اودھ کی نفاست، اودھ کی ثقافت، اودھ کی سنسکرتی، اودھ کی پرمپرا، اودھ کی مریادا کے مرقع تھے۔ " انشاء اللہ اور ماشاء اللہ " وردِ زبان رہتا۔ "چشم ما روشن دلِ ما شاد" ایسے جملے ان کے لبوں پر ہر وقت حاضر رہتے۔ فیض آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے۔ ہندو ان کو بھگوان، مسلمان انھیں اللہ والا کہتے رئیس الامرا تھے، مگر فقیر منش بھی تھے۔ اچھا کھاتے تھے اچھا کھلاتے تھے، خوش لباس تھے، خوش مزاج تھے ـ آخر عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے لیکن دیدہ وری آخر تک باقی رہی۔ ہندوؤں کے دیوتا تھے اور مسلمانوں کے ملجا و ماویٰ تھے۔

بڑے استھان کے بڑے مہنت آنجہانی رگھو بر پرشاد ـــ چشم دید ہے ان کی مسلم دوستی۔ ایسا مسلم پرست نہ دیکھا نہ سنا۔ مسلمانوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک کسی انجانے اور ناواقف مسلمان کی بھی پریشان حالی سُن لیتے تو دامے درمے قدمے سخنے خدمت سے کوتاہی نہ کرتے۔ ایک مسلمان مالی مہکتے پھولوں کے گجرے روزانہ صبحِ صادق کے وقت بلا قیمت لے کر حاضر ہوتا تھا۔ جب اس مالی کا انتقال ہوا تو بڑے مہنت جی نے اس کی تجہیز و تکفین بڑے دھوم دھام سے کرائی۔ مرحوم مالی کے پسماندگان کی تاحیات خبر گیری کی۔ ایک معتبر اور مستند شخصیت نے یہ واقعہ بتایا کہ :

" اجودھیا میں ایک ہندو نوجوان نے ایک مسلمان بیوہ کی نوجوان

خوب رو بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ بیٹی کی رسوائی اور بدنامی کے پیش نظر وہ بیوہ خاتون روتی پیٹتی بڑے مہنت جی کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنی پریشانی بتائی۔ آنجہانی مہنت جی کی پیشانی پر غصّے سے بل پڑگئے، بڑے استھان کے پجاریوں کو حکم دیا کہ جہاں بھی وہ مسٹنڈا ملے پکڑ کر لے آؤ — لایا گیا وہ نوجوان اور ایسی درگت بنائی گئی اس کی کہ اللہ کی پناہ — پھر بیوہ خاتون کی ناکتخدا بیٹی کا رشتہ طے کرا کے بڑے مہنت نے اس کے ہاتھ پیلے کرا دیئے اور ایک اچھے بھلے مسلمان گھرانے کی بہو بنا دیا۔"

خان بہادر محمد عمر مرحوم — لمبے چوڑے، موٹی موٹی کلائیاں، سر پر گول ٹوپی سیاہ، سفید لمبا کوٹ، سفید ڈھیلی ڈھالی پتلون، شہر اور کنٹونمنٹ ایریا میں لاکھوں بیگھے زمین، بے شمار عالی شان کوٹھیوں کے مالک، اتنی جائداد کے مالک تھے کہ خود کثرتِ جائداد کا ان کو علم نہ تھا۔ مرنجان مرنج اور کڑھی ہوئی شخصیت، انگریزوں کے محبوب نظر، ہندوؤں کے سر کا تاج، مسلمانوں کے دل کا چین۔ ہر طرف ان کا نام ہر سمت ان کا چرچا۔ کس کے ساتھ کیا حسنِ سلوک کیا، کس کو کیا دیا، کس کی کس طرح خبر گیری کی، دوسرے کیا باخبر ہوتے جب خود خان بہادر مرحوم کو بھی خبر نہ رہتی تھی۔ سخی تھے، مخیر تھے، بلا تفریق مذہب و ملت سب کے بہی خواہ تھے۔ کرم نواز تھے، ہمدم و دمساز تھے۔

رائے بہادر شری مادھو پرشاد سنگھ، بابو تلسی رام، ٹھاکر ہر گوبند سنگھ ٹھاکر کیسری سنگھ، مولانا علی احمد صاحب شاہی پیش نماز، مولوی ابو محمد صاحب مولوی نفقیر حسین صاحب، بابو مہابیر پرشاد جی، بابو سندر لال جی، لالہ نرائن داس جی مہاجن، سید حسن مثنیٰ ایڈوکیٹ، مرزا مجتبےٰ علی ایڈوکیٹ، محمد مہدی تسکینؔ، پنڈت پرمیشور ناتھ سپرو، پنڈت ٹی۔ این۔ دینا، پنڈت رام ناتھ شانگلو، بابو بال بھدر سہائے اور مولوی اظہر علی۔ یہ چشم دید ہستیاں جنھیں نیستی نے عدم آباد پہونچا دیا۔ یہ دیکھی بھالی پر بہار شخصیتیں ان میں سے ہر ایک اودھ کی تہذیب و روایات کا آئینہ دار تھی۔ ان کے چہرے مہرے، بود و باش، شرافت نفسی، بات چیت، نشست و برخاست آداب انسانیت سے فیض آباد کبھی آباد تھا۔ جدھر چلے جایئے آداب و تسلیمات، مزاجِ گرامی، بحمداللہ، شرف نیاز، خاطر مدارات کے چمن کھلے ہوئے۔

اگر میں اپنی یادداشت اور اپنے حافظے کے سہارے فیض آباد اور اس کے قرب و جوار جیسے اکبر پور، ٹانڈہ، ایریا بھدرسہ وغیرہ کے مثالی کردار والے افراد پر لکھنے بیٹھوں تو ہر فرد ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ ہر شخص چمن زار نظر آئے۔ زمین جن آسمانوں کو کھا گئی، دستِ اجل نے جن فلک مقاموں کو آغوش لحد کی زینت بنا دیا ہے ان کا قلمی حصار میرے لیے مشکل بھی بہت ہے۔

آج بھی درگا پوجا کی جو پانچ مورتیاں قلبِ شہر میں واقع چوک کے عظیم الشان سال بہ سال بننے والے منڈپ میں رکھی جاتی ہیں ان کو بلا قیمت ایک مسلمان مالی پھولوں کا گجرا چڑھاتا ہے۔ منڈپ بنانے والے اور منڈپ کو سجانے والے زیادہ تر مسلمان ہوتے ہیں۔ آج رؤف، جبّار اور وحید مستری موجود ہیں جو اپنی فنی مہارت سے مندروں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ □□

میر خلیق کا مرثیہ — ص ۲۷ کا بقیہ

ہر چند نا امید ہوں مطلب سے ہو چکا
قولِ ضمیر سے ہے مگر دل کو آسرا
اعجاز صد ہزار پیمبرؑ کرے علیؑ
چاہے تو انقلاب مقدّر کرے علیؑ

□□

کتابیات: (۱) اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء۔ اکبر حیدری
(۲) قیصر التواریخ (جلد اول) سید کمال الدین حیدر ص ۳۸، ص ۱۰۳، ص ۱۴۴
(۳) لکھنؤ گزیٹیئر ص ۱۴۸ ص ۱۰۳، ص ۲۰۳
(۴) تفضیح الغافلین۔ مرزا ابوطالب ص ۱۵
(۵) مثنوی گلزار ارم۔ میر حسنؔ ص ۱۴۲ (۶) مرقع اودھ ص ۲۹
(۷) آفتاب اودھ (قلمی نسخہ) ص ۱۰۲ (۸) کلیات سودا (قلمی نسخہ)
(۹) انیسؔ کی مرثیہ نگاری۔ مرزا جعفر علی خاں اثر ص ۴۱
(۱۰) تاریخ اودھ جلد سوم ص ۲۹۶، (۱۱) تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۳۰
(۱۲) تاریخ اودھ جلد دوم ص ۲۷۴ (۱۳) وزیر نامہ ص ۴۵
(۱۴) ہفت تماشا۔ مرزا قتیل لکھنوی ص ۱۵۶ (۱۵) تنقیدی مقالات۔ ڈاکٹر زور ص ۲۹۴
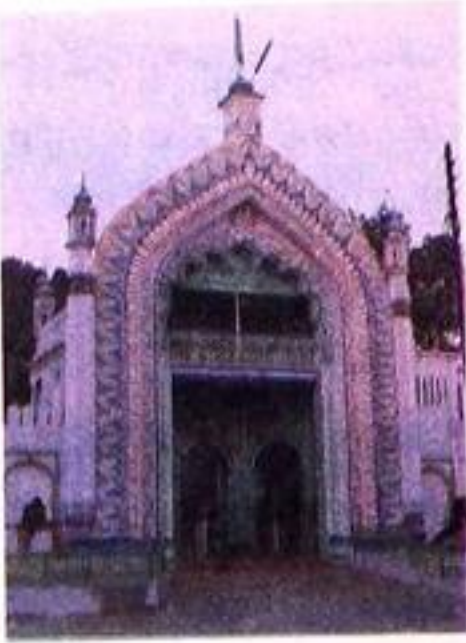
سید سالار مسعود غازیؒ کا تاریخی آستانہ

اودھ میں قومی یکجہتی کا ایک بڑا مرکز

راحت علی خاں
کاشانۂ راحت، قلعہ نان پارہ، بہرائچ

درگاہ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ بہرائچ

بہرائچ اترپردیش میں "اودھ" کا ایک پس ماندہ ضلع ہے لیکن زمانۂ قدیم ہی سے بے مثال تاریخی اور روحانی اقدار کا حامل چلا آرہا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ اس ضلع کی تاریخ مسلم حکمرانوں سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بھی "شراوتی" "سلہٹ مہیلٹ" دگوں (نان پارہ) بھنگا اور چرّہ کے جوار میں جو پرانے سکّے۔ مورتیاں، برتن اور کتبے وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں ان سے ان کی قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔

بہرائچ کیسے نام پڑا یہ ایک پہیلی بھی ہے۔ پرانی کتابوں کے مطابق "برہماجی" نے اپنی راجدھانی کا انتخاب اسی ضلع کو کیا تھا، دوسرے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پہلے "گندھوربن" تھا جہاں پانڈوں نے اپنی جلاوطنی کے دن گزارے تھے۔ ہندو دیومالائی (HINDU MYTHOLOGY) عقیدے سے پتہ چلتا ہے کہ "برہماجی" نے بہت سے رشیوں کی ایک کانفرنس یہاں بلائی تھی اسی باعث یہ جگہ "برہم رائچ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ضلع گزیٹیر لکھتا ہے کہ مہاراج رام چندرجی کے ایک "مہاراجہ لو" اپنی حکومت اترکوشل کا نظام یہاں سے چلاتے تھے۔ ضلع کے پرانے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ مسلم سلاطین کی حکمرانی سے پہلے یہاں "بھر قوم" آباد تھی جس کے نام پر یہ بھرائچ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعد میں کثرت استعمال سے ہی بھرائچ اب "بہرائچ" ہوگیا ہے۔

عبدالرحمٰن ابن بطوطہ کے سفرنامے کے بموجب بہرائچ ایک خوبصورت شہر ہے جو دریائے سرجو کے کنارے آباد ہے۔ اور یہ دریا اپنے کنارے بدلتا رہتا ہے (دریا کی یہ خصوصیت آج بھی قائم ہے۔)

بایں وصف اسی ضلع میں "بدھ مذہب" کی ایک بڑی تیرتھ گاہ "شراوستی" بھی واقع ہے۔ اگر تاریخ پر قیاس کو دخل ہوتا تو بالارک رشی کے آشرم کا یقین بھی بہرائچ میں کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال "شراوستی" بدھ مذہب کا ایک بڑا تیرتھ استھان ہے جہاں مورخین کی رائے میں مہاتما گوتم بدھ نے اپنی ریاضت اور فیضان کے لیے ۱۸ چوماسے (یعنی ۲۴ برساتیں) گزارے تھے۔ اس کے علاوہ یہی شراوستی "جین دھرم" کی بھی عبادت گاہ کے لیے مشہور ہے اور ان کے چودھویں گرو سمبھوناتھ جین کا جنم بھی اسی مقام پر ہوا تھا الغرض بہرائچ روحانی اقدار کا حامل چلا آرہا ہے۔

اس روحانی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ اسی بہرائچ سے سلطان محمود غزنوی کے عہدِ حکومت میں ایک نوجوان صالح اور ممتاز بزرگ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے غیر معمولی کارناموں، ان کی انسانیت نوازی کے اعلا نمونے، مظلوموں کے حق میں ظالموں سے جہاد کرنے اور جامِ شہادت نوش کرکے اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہونے کی ایک ناقابل فراموش داستانِ حقیقت بھی جڑی ہوئی ہے۔

تاریخ فیروزشاہی، سفرنامہ ابن بطوطہ، طبقات اکبری، خزینۃ الاصفیا، تاریخ فرشتہ، منتخب التواریخ، اخبار الاخیار اور عہدِ جہانگیری کے ممتاز مورخ مولانا عبدالرحمٰن بجنوری کی اہم تصنیف مراۃ مسعودی وغیرہ جیسی اہم تاریخی کتب کے مطالعہ سے اس عظیم بزرگ کے حالات اور کردار کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔

اس طرح شمالی ہندستان کا یہ منفرد آستانہ اپنی گوناں گو خصوصیات کے لیے آج بھی ہندو مسلم ایکتا کی ایک علامت بنا ہوا ہے۔ ہر سال یہاں

بسنت پنچمی کے تہوار، گرمیوں میں جیٹھ کے سالانہ میلہ کے مراسم اور ماہ رجب میں عرس کی تقریبات کے موقع پر لاکھوں انسانوں کا ایک سیلاب امنڈ کر آجاتا ہے جس میں غیر مسلموں کی نمایاں اکثریت ہوتی ہے جو اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرکے اپنے دامنِ مراد کو امیدوں سے بھر کر واپس ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار برس سے جاری و ساری ہے۔

مستند تاریخی حوالوں کے بموجب سید سالار مسعود غازی ۲۱ رجب ۴۰۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۰۱۵ء کو سلطان محمود غزنوی کی قلعۂ اجمیر کی تسخیر کے دوران عالمِ وجود میں آئے۔ آپ کا اصلی نام امیر مسعود ہے، والد صاحب سالار ساہو کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کا مزار ستر کھ (بارہ بنکی) میں ہے جو سلطان محمود کے بہنوئی اور ان کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ چار سال کی عمر میں آپ کی تعلیم کا آغاز حضرت ابراہیم نامی ایک بزرگ کی معلمی اور نگرانی میں ہوا۔

تقریباً ۹ برس کی عمر میں آپ نے مروجہ تعلیم اور علوم ظاہری کی تکمیل کر لی تھی اور دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے علوم باطنی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ مسلسل شب بیداری اور عبادتِ الٰہی کا شوق ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس لیے ہر وقت باوضو رہتے تھے اور درویشان اہلِ باطن کی صحبت بابرکت میں اپنا وقت گزارتے تھے، عمدہ لباس اور خوشبو کے دلدادہ تھے۔ بایں اوصافِ حمیدہ آپ فن سپہ گری خاص کر تیر اندازی میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ کئی جنگوں میں شریک رہے۔

اس محاذ آرائی کے سلسلے میں ملتان۔ دہلی۔ میرٹھ۔ قنوج۔ بلگرام اور بدایوں ہوتے ہوئے آپ ستر کھ (بارہ بنکی) تک پہنچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں کا راجہ ہر سال رعایہ کی پہلی اولاد نرینہ کو دیوی جی کی بھینٹ چڑھواتا تھا۔ اتفاق سے اس سال ایسے شخص کی اولاد کی باری تھی جو اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی اس کا باپ پریشان تھا یہ اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور اپنی فریاد بیان کی، یہ سن کر حضرت غازیؒ بہرائچ کے لیے کوچ کر گئے۔ اور اس مقام پر پہنچ گئے گئے جہاں لڑکے کو بھینٹ چڑھانے کا انتظام تھا اور آپ نے فوراً راجہ کے سپاہیوں سے جنگ کی اور لڑکے کو موت کے منہ سے بچا لیا لیکن خود لڑتے ہوئے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ یہ واقعہ ۱۴ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۰۳۳ء کا ہے۔ آپ کا مزار اسی جگہ ہے جہاں آپ نے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر اختیار کیا۔

مشہور ہے کہ ایک بار محمد شاہ تغلق نے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ ان کے ہمراہ ممتاز سیاح ابن بطوطہ بھی تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ بادشاہ عین الملک کی بغاوت فرو کرکے دریائے سرجو کو پار کرتا ہوا حضرت مسعود غازی کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ سالانہ میلہ کے ایام تھے گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مزار شریف تک پہنچنے کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اس لیے بادشاہ اندر نہ جا سکا۔

ایک اور تاریخی حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ تغلق خاندان کا ایک دوسرا بادشاہ "فیروز شاہ تغلق" بنگال کی مہم کی کامیابی کے بعد آستانہ پر حاضر ہوا اور وہاں اس کی ملاقات بہرائچ کے ایک بزرگ حضرت امیر ماہؒ سے ہوئی۔ اس نے مزار شریف پر خلقت کا ہجوم دیکھ کر پوچھا کہ اس آستانہ کی کیا کرامت ہے کہ اتنا بڑا مجمع یہاں حاضر ہے۔ حضرت امیر ماہؒ نے جواب دیا کہ یہ کرامت کیا کم ہے کہ ایک جلیل القدر بادشاہ وقت اور میرا جیسا فقیر دونوں اس مزار شریف پر حاضر ہیں۔ بادشاہ اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا پھر اسی نے مزار شریف کی چوحدی قائم کروائی اور موجودہ سنگی قلعہ تعمیر کرایا۔ مزار شریف کی تعمیر جدید کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مزار شریف کے انتظام کے لیے اس نے موضع سنگھا پرا سی وقف کر دیا جو ابھی تک قائم ہے۔

حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ملتا ہے۔

□□

یادگار مجلسیں ...... صہ ۵۶ کا بقیہ

۲۔ واقعہ خوان

یہ حضرات محرم میں ذکر مصائب حضرت امام حسین علیہ السلام منبر پر بیٹھ کر بیان فرماتے ہیں۔ ان کے پڑھنے کی ترکیب مثل اہل عجم کے ہوتی ہے۔

محرم کی ان چھوٹی چھوٹی مجلسوں میں یہ سب اور ان کے علاوہ عزائی بیان کے دوسرے شعبوں کے پڑھنے والے بھی مل جاتے تھے۔

مجلسوں کی رونق اور رواج میں آج بھی کمی نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ لیکن اوپر جن مجلسوں کو یاد کیا گیا ہے وہ اپنی کیفیتوں سمیت ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔
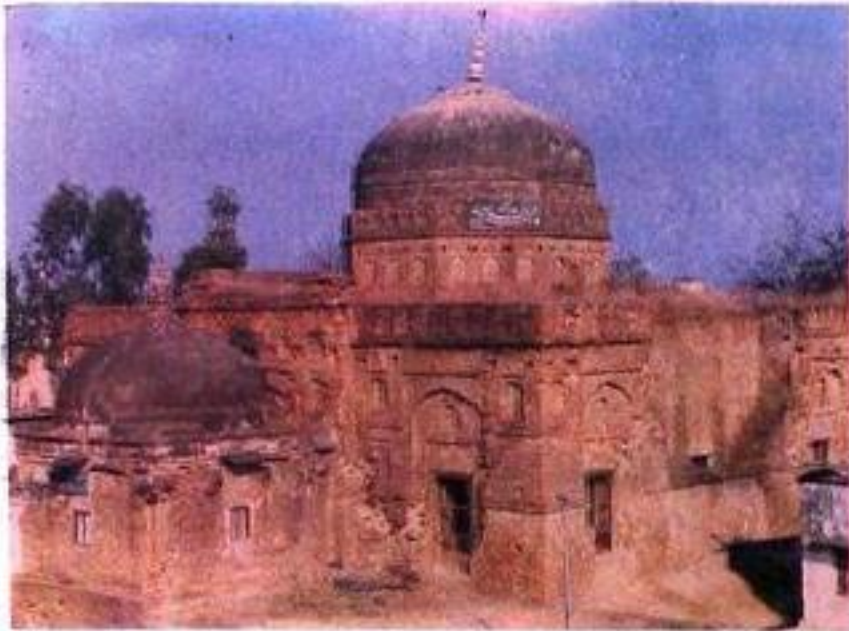
کاکوری

حقائق کی روشنی میں

احمد ابراہیم علوی

۳۰۔ ہیلتھ اسکوائر، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

روضۂ [illegible]، کاکوری (لکھنؤ) ◁

پُرشکوہ بام و در والی لق و دق حویلیوں اور جاہ و جلال والے عظیم الشان محلات اور کوٹھیوں کو حصار میں لیے ہوئے آم کے باغات سے گھرے چھوٹے سے قصبے کاکوری کی داستان طویل اور تاریخ درخشاں اور مستند ہے۔ بات چاہے علم و ادب کی ہو یا تصوف و مذہب کی، ملک کی آزادی کے لئے جان نثار کر دینے والے شہیدان وطن کی ہو یا ملک اور قوم کی ترقی و خوش حالی کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دینے والے عظیم انسانوں کی، کاکوری کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کاکوری کی تاریخ میں ۹ اگست ۱۹۲۵ء کی شام کی دلیرانہ کارروائی سنہرے حروف سے لکھی ہوئی ہے جبکہ اشفاق اللہ خاں، جتیندر بخشی، راجندر لہری اور بسمل نے کاکوری میں جنگ آزادی کی شمع روشن کی۔

کاکوری ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے بارہ تیرہ کلومیٹر دور لکھنؤ ہردوئی شاہراہ پر واقع ہے اپنے رقبے اور حدود کے اعتبار سے یہ جتنا مختصر ہے اپنی ادبی تاریخی اور سماجی حیثیت سے اتنا ہی اہم ہے۔ اس کی تاریخ ہزار دس سال پرانی ہے بسہتا نام کا راجہ کبھی اس کو اپنا دارالسلطنت بنا کر حکمرانی کرتا تھا۔ اس کے شاندار محل اور قلعہ کے نشانات ابھی تک نمایاں ہیں۔

کاکوری علم و فن کا مرکز رہا ہے یہاں ہر شعبۂ حیات میں نمایاں شخصیتوں میں ایسے نام بھی شامل ہیں جو پورے ملک کے لیے باعث فخر و افتخار ہیں یہاں شجاعت اور دلیری کے کارنامے انجام دینے والے صنعت و حرفت کو فروغ دینے والے اور علم و ادب کی شمعیں فروزاں کرنے والے نیز تصوف و معرفت کے ذریعے ذہنی و قلبی سکون عطا کرنے والے بزرگان ہمیشہ ہی فیض و برکت رہے ہیں۔

ان ممتاز و ناقابل فراموش شخصیات میں قاضی نجم الدین خاں علوی، منشی خلیل الدین خاں، مسیح الدین خاں علوی، امیر حسن خاں بسمل، رضا حسن خاں علوی، مقصود احمد نطق، ارتضا علی شرر، محمد عالم قیصری، نور الدین کیفی، محمد رضا صبر، تاج الدین جذب، حیدر حسن نشتر، رضا الدین احمد خنجر، حافظ علی عسکری بیدل، منشی سجاد حسین، شیخ غلام مینا ساحری، نادر علی خاں عباسی نادر، محسن کاکوری، منشی احمد علی، ڈپٹی امیر احمد علوی ظفر الملک علوی، نور الحسن نیر اور ناظر کاکوروی کے علاوہ بزرگان دین میں شاہ محمد کاظم قلندر، شاہ تراب علی قلندر، شاہ انور قلندر، شاہ حبیب حیدر قلندر جیسے قابل صد احترام بزرگ بھی شامل ہیں۔ مقام مسرت یہ ہے کہ ان سب کا فیضان جاری ہے اور ان کے پس ماندگان ان کی روایات کو بحسن و خوبی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

"نور اللغات" اردو کی آج بھی سب سے مستند اور معتبر لغت ہے اس کے برابر اہم اور معتبر دوسری لغت بڑی بڑی اکیڈمیاں اور ادارے بھی نہ پیش کر سکے۔ یہ لغت کاکوری کے ہی ایک سپوت نور الحسن کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اردو میں اپنی قسم کا بے مثل نعتیہ قصیدہ کہنے والے مولانا محسن بھی کاکوری کے فرزند تھے۔ اس کے علاوہ اردو میں انگریزی کے مشہور مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" کے طرز پر رسالہ نکالنے والے منشی سجاد حسین کا بھی تعلق کاکوری ہی سے تھا۔

مہمان نوازی کاکوری کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے دسترخوان

ہمیشہ وسیع رہے، دعوت طعام کا اہتمام بھی قابل ذکر رہا ہے اسی لیے یہاں بڑے لذیذ کھانے پکتے رہے ہیں یہاں کے سیخ کباب اپنی لذت میں جواب نہیں رکھتے بڑی اہم دعوتوں میں کاکوری سے سیخ کباب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چوک کے ٹنڈے کباب والے کا تعلق بھی کاکوری سے ہی ہے۔

یہاں صنعت وحرفت میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ عورتوں کا سہاگ شہانے یہاں بڑے اہتمام سے بنائے جاتے ہیں لڑکیاں ان شہانوں سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔

کاکوری کے لوگ ہمیشہ ترقی کی دوڑ میں آگے ہی رہے ہیں۔ جب ہندوستان میں حیدرآباد (دکن) اپنی خوشحالی کے لیے مرجع خلائق تھا اور ہندوستان بھر سے لوگ وہیں سمٹ رہے تھے کاکوری والے وہاں جانے میں کسی سے پیچھے نہ رہے وہ کاکوری سے ہجرت کر کے حیدرآباد پہنچے اور انہوں نے آباد ہونے میں سبقت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اپنی ضرورت محسوس کرائی اور شہرت و ناموری حاصل کی اور چیف سکریٹری کے عہدے تک پہونچے۔ اس سلسلے میں مجاہد علی عباسی کا نام قابل ذکر ہے۔ جب پاکستان بنا تو کاکوری والے بڑی تعداد میں وہاں گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر حق جمالیا، فوج میں بڑے بڑے عہدے پائے کموڈور، میجر، کرنل تک کے عہدوں کو حاصل کیا اور نام پیدا کیا اس کے بعد یورپ کی طرف مراجعت شروع ہوئی تو کاکوری والے بڑی تعداد میں برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں گئے اور وہیں بس گئے۔ اس کے بعد جب لوگ بڑی تعداد میں امریکا اور کناڈا جانے لگے تو وہاں بھی کاکوری والے پہونچ گئے۔ اس طرح آج ساری دنیا میں کاکوری والے پھیل کر شہرت و ناموری حاصل کر رہے ہیں۔

ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے والے اہالیان کاکوری آزادی وطن کے پرستاروں میں بھی پیش پیش رہے ہیں اس سلسلے میں منشی رسول بخش اور ان کے جیالے بیٹے حافظ عبدالصمد کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔

کاکوری والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں قلم تو دوسرے میں شمشیر رہی اور انہوں نے دونوں ہی کے جوہر دکھائے ہیں۔ قصبہ ڈپٹی کلکٹروں کے لیے مشہور رہا ہے۔ اس مختصر سے قصبے میں جتنے ڈپٹی کلکٹر رہے اتنے شاید ہی کسی اور جگہ رہے ہوں یہاں گھر گھر میں شعر و ادب کا چرچا رہا ہے۔

مذہب سے بے پناہ لگاؤ کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے دلچسپی یہاں کا شعار رہا ہے۔ اسی لیے اس قصبے میں محترم و معتبر مذہبی و ادبی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

اردو کے نامور محقق و ناقد ڈاکٹر فرمان فتحپوری قصبہ کاکوری کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں ——

"کاکوری ایک عظیم تہذیبی مرکز ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔ اہالیانِ کاکوری نے علم و فن کے ہر شعبے میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں یہاں تک کہ امیر خسرو کے بعد اگر کسی کا مصدقہ کلام اردو میں ملتا ہے جو قابل ذکر ہے اور جسے ریختہ کہا جاتا ہے تو وہ سعدی کاکوری ہیں" مزاحیہ صحافت کے باوا آدم منشی سجاد حسین کا بھی اسی مردم خیز قصبے ہی سے تعلق تھا ان کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں: ——

"جب میں ادب و شعر کے دوسرے شعبوں میں دیکھتا ہوں تو اردو شاعری اور طنز و مزاح کی پختہ روایت منشی سجاد حسین "اودھ پنچ" والے کا تعلق بھی کاکوری سے تھا اور اکبر الہ آبادی جیسے بڑے شاعر جو "اودھ پنچ" میں لکھتے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ نے اکبر الہ آبادی کو حقیقت میں اکبر الہ آبادی بنا دیا تو غلط نہ ہوگا۔"

نعتیہ قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کے خالق حضرت محسن کاکوروی تھے

علامہ نور الحسن پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور بڑے کامیاب تھے وکالت کی مصروفیت کے باوجود انہوں نے محض سات برس کے عرصے میں چار جلدوں میں اردو کی لغت تیار کی جب کہ پاکستان میں اس کام کے لیے ایک دفتر درکار ہوا اور اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جوش ملیح آبادی جیسے نامور ادیبوں اور شاعروں نے بیس برس تک محنت کی لیکن اس کے باوجود ایسی لغت وجود میں نہیں آسکی جیسی نور اللغات ہے۔ اس سلسلے میں اگر علامہ نور الحسن کاکوری کا کوئی ثانی ہے تو وہ انگریزی کے مستند ادیب ڈاکٹر جانسن ہیں جنھوں نے تن تنہا انگریزی زبان کی پہلی لغت تیار کی تھی لیکن وہ لغت اغلاط سے بھری ہوئی تھی جبکہ نور اللغات کے سلسلے میں ایسی کوئی بات آج تک نہ کہی جاسکی۔

صحافت کے میدان میں بھی کاکوری والوں نے کچھ کم کارنامے نہیں دکھائے ہیں اس سلسلے میں کاکوری اخبار" قابل ذکر ہے جس کا اجرا ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا اور جو کسی نہ کسی شکل میں نکلتا رہتا ہے اس اخبار کی فائلیں اپنی الگ اہمیت و

افادیت رکھتی ہیں۔ اس اخبار میں دنیا بھر میں بسے کاکوری والوں کی خانگی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں بعض تخالیق ایسی ہیں جو اس اخبار کے علاوہ کہیں نہیں شائع ہوئی ہیں ایسے کتنے ہی مضامین یکجا کرکے کتنی ہی کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ ظفر الملک علوی، انیس احمد عباسی، عبدالرؤف عباسی، ناظر کاکوروی، فرقت کاکوروی، منشی سجاد حسین کے علاوہ ایسے نام ہیں جو اردو تاریخ صحافت کے جز لاینفک کہلائیں گے۔

اردو صحافت کے علاوہ انگریزی صحافت میں نام پیدا کرنے والوں میں بھی کاکوری کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ دنیا کے سب سے قدیم اور معتبر انگریزی روزنامہ دی ٹائمز "لندن تک رسائی حاصل کرنے والے پہلے مسلمان اور ہندوستانی صحافی قیصر تمکین کا بھی وطن کاکوری ہے۔ ان کی خود نوشت "خبرگیر" خود نوشت سے کہیں زیادہ اُردو صحافت کی مستند تاریخ ہے جبکہ وہ اُردو کے بڑے ہی معتبر مستند و ممتاز افسانہ نگار ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں کاکوری کے جیالے سپوتوں نے سب سے پہلے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ اس سلسلے میں مفتی عنایت احمد قابل ذکر ہیں جنھوں نے تحریک آزادی کی رہنمائی کی جس کی پاداش میں انہوں نے کالا پانی کی سزا پائی۔ منشی احترام علی علوی نے نہ صرف قومی تحریکوں کی مدد کی بلکہ بڑے بڑے قومی لیڈروں کو جائے پناہ بھی دی انہوں نے ندوۃ العلوم جیسے بین الاقوامی شہرت کے اداروں کے قیام میں زبردست تعاون دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مالی اعانت کی۔

تعلیم نسواں کے میدان میں بھی کاکوری کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ یہاں عموماً خواتین حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ خواتین میں شعری اور ادبی ذوق رکھنے والیوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ شعر کہنا اور افسانہ لکھنا یہاں کی لڑکیوں کا مشغلہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں وحیدہ نعیم اور زیبا کاکوری نے کافی شہرت حاصل کی۔ کاکوری اخبار نے اکثر خواتین کی ہمت افزائی کی۔

کاکوری کشف و کرامات تصوف و فلسفہ اور صاحبانِ علم و حکمت اور بزرگوں اور پاکبازوں سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہاں حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کا آستانہ کاظمیہ ہمیشہ ہی مرجع خلائق رہا ہے۔ اور بزرگوں کا سلسلہ آج تک برقرار ہے۔

حضرت شاہ تراب علی قلندر، حضرت شاہ تقی علی قلندر، حضرت شاہ حیدر علی قلندر، حضرت شاہ اکبر، حضرت شاہ انور، حضرت شاہ حبیب حیدر قلندرؒ کا فیضان ابھی جاری ہے۔ آج بھی آستانہ کاظمیہ سے صبر و سکون کی دولت حاصل کرنے والے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔

حضرت ملا نظام الدین عرف شیخ پنکھ دنیائے اسلام کے مشہور بزرگ تھے حضرت ملا قیام الدین اپنے وقت کے ایسے جیّد بزرگ تھے کہ شہنشاہ اکبر اعظم آپؒ سے شرف ملاقات کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

کاکوری میں شہنشاہ ہمایوں کے زمانے کا مقبرہ جھنجھری اب بھی عہد مغلیہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس میں نورالحسن نیّر کا مدفن ہے۔

کاکوری کے مکمل حالات اور صاحبانِ فن کی حیات اور کارناموں کو جاننے کے لیے دو مستند کتابیں موجود ہیں ایک ہے "مشاہیر کاکوری" اور دوسری "سخنوران کاکوری"۔ "سخنوران کاکوری" حالیہ تصنیف ہے جو بڑی اہم اور مفید ہے جس کو کلیم نثار احمد علوی ساقی کاکوروی نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا تھا۔ □ □

لکھنؤ کے مشہور مندر ...... صفحہ ۴۴ کا بقیہ

زیادہ اہمیت ہے۔ بڑے منگل کا میلہ اسی مندر پر لگتا ہے

چھاچھی کنواں ہنومان مندر

سولہویں صدی کی بات ہے کہ ایودھیا کے ایک سنت پرمیشور داس نے لکھنؤ کے ایک جنگل میں ایک کنویں کے قریب ایک ٹھاکر دوار کی تعمیر کرائی تھی اور اس میں ہنومان کی ایک قدیم مورتی نصب کردی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کنویں سے تین دنوں تک چھاچھ نکلتا رہا اسی کی مناسبت سے اس کنویں کا نام چھاچھی کنواں ہوگیا۔ منگل کو یہاں بھیڑ ہوتی ہے لیکن موسم گرما میں جیٹھ کے مہینے میں خصوصی طور پر دھوم دھام رہتی ہے کہا جاتا ہے کہ تلسی داس بھی یہاں قیام کرچکے ہیں۔

بھیروجی کا مندر

لکھنؤ کے وسط میں بھیروجی کا مندر ہے جو مغلیہ دور میں بھی موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت گومتی اس کے قریب سے گذرتی تھی اور یہاں پر شمشان تھا۔ آصف الدولہ نے اس مندر کی بہت قدر کی۔ مہاراجہ جھاؤلال اس مندر کے پرستار تھے۔ راجہ بلرام پور کا خاندان بھی اس مندر کے عقیدت مندوں میں تھا۔ لکھنؤ کے کتھک فنکار کا مرکز عبادت یہی مندر تھا۔ کالکا اور بندادین اس مندر کے عقیدت مندوں میں تھے۔ موسم باراں کے بھادوں مہینے کے آخری اتوار کو یہاں میلہ لگتا ہے۔

ترجمہ و تلخیص: صفیہ اسرار حسین

ڈاکٹر حبیب نثار
حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد

شاہانِ اودھ اور موسیقی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے زوال ہوتی چلی گئی اور ایک سو پچاس برس بعد ختم ہوگئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے پندرہ برس بعد محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک نے ۱۷۲۲ء میں سلطنتِ اودھ کی بنیاد ڈالی۔ برہان الملک نے بنگلہ، فیض آباد کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ انھیں اپنی نوتعمیر سلطنت کے انتظام و انصرام ہی سے فرصت نہ ملی تھی کہ موت کا بلاوا آگیا۔

اودھ کی سرزمین یوں بھی فنونِ لطیفہ کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی تھی۔ بلگرام کے علاقہ سے نہ صرف معتبر شاعر پیدا ہوئے بلکہ معروف موسیقاروں نے بھی جنم لیا۔ عہد شاہجہاں میں مدلانا ئک نے بلگرام ہی کی سرزمین سے اٹھ کر موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کیا تھا۔ موسیقی میں نائک کا درجہ رکھتے تھے۔ شاہجہاں کے لاکھ چاہنے کے باوجود دربار کا رُخ کرنا پسند نہ کیا۔ میر عبدالواحد بلگرامی عہدِ عالمگیر میں معروف تھے موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی کو موسیقی میں اس حد تک دسترس حاصل تھی کہ انھیں خسرو ثانی کہا جاتا تھا۔ اس فن سے ان کی واقفیت کا ثبوت ان کی مثنوی "کتخدائی فرخ سیر" سے ملتا ہے۔ لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل بھی موسیقی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> "بحرالعلوم کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فن موسیقی میں اُن کا رسوخ عام طور پر مسلّم تھا۔"

برہان الملک کے بعد ان کے داماد صفدر جنگ تخت نشین ہوئے۔ صفدر جنگ کو بھی اپنی سلطنت کے دروبست نے فرصت نہ دی علاوہ ازیں ان کا زیادہ وقت دہلی میں گزرا جس کی وجہ سے اپنی سلطنت کی تعمیر پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ لیکن تاریخ کے پوشیدہ اوراق شاہد ہیں کہ صفدر جنگ موسیقی ہند سے اچھی طرح واقف ہی نہ تھے بلکہ خود بھی اس میں دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ موسیقی سُننا ان کا معمول تھا۔ صفدر جنگ کے لیے موسیقی سے محظوظ ہونا صرف ایک شغلہ نہ تھا بلکہ روح کو تازگی بخشنے کا ایک وسیلہ بھی تھا بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> "صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا، تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔"

صفدر جنگ کی وفات کے بعد شجاع الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں سلطنتِ اودھ کی تہذیبی زندگی پر بہار آنے لگی۔ دہلی کے بار بار لٹنے کی وجہ سے وہاں کے فنکار اودھ کا رُخ کرنے لگے۔ سعادت خاں برہان الملک اور صفدر جنگ نے مغل شہنشاہ سے ربط ضبط برقرار رکھا تھا اور ان کی سلطنت ایک طرح سے نیم آزاد تھی۔

جس زمانے میں مغل شہنشاہ، افغانوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں دہلی کے برباد ہونے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ شجاع الدولہ بہادر اپنی سلطنت کی خوشحالی پر نازاں تھے۔ ان کے عہد میں موسیقی کے فنکار ہندوستان کے گوشے گوشے سے فیض آباد چلے آرہے تھے اور حقیقتاً شجاع الدولہ بہادر موسیقی کے فنکاروں کو نوازنے میں شہنشاہ دہلی پر سبقت لے جارہا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے شجاع الدولہ کی نوازشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سلطنتِ اودھ کے سماجی پس منظر کا بیان کیا ہے اور موسیقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لاکے اکٹھا کر دیا۔ یہاں اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پُرانے اسکول قائم ہی تھے۔ جونپور کے مشرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگاریں بھی باقی تھیں۔ ان میں جب دہلی کے باکمال گویّے اور تان سین خاندان کے مستند اُستادانِ موسیقی بھی آکے مل گئے تو خاص شان

پیدا ہو گئی اور موسیقی کا دراصل ایک نیا دور شروع ہو گیا۔"

دہلی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اور شاہ عالم کے عہد سے قبل فن موسیقی میں جو ابتذال آ گیا تھا اس کی وجہ سے اس فن کے ماہرین (جنھیں فن کی پاکیزگی عزیز تھی) ہجرت پر مجبور ہو گئے، علاوہ ازیں محمد شاہ نے نادر شاہ کے حملے کی بنا پر جب موسیقی سننے سے پرہیز کیا تو بیشتر فنکاروں نے اودھ کا رُخ کیا۔ کچھ پنجاب گئے، کچھ بڑودہ اور کچھ نے اورنگ آباد کا رُخ کیا۔ شرر نے متذکرہ بالا اقتباس میں دہلی سے ہجرت کرنے والے انھی فنکاروں کا بیان کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صفدر حسین خود شجاع الدولہ بھی فن موسیقی میں ماہر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک ہم عصر کا بیان ہے کہ شجاع الدولہ موسیقی کے شوقین ہونے کے علاوہ خود بھی اس فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔"

موسیقی اور عہد شجاع الدولہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شہر میں تمام رات گھنگھروؤں کی جھنکار سُنائی دیتی تو صبح سویرے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی دھول اور گرد و غُبار سے آسمان ڈھک جاتا۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ بارہ سو طائفے شجاع الدولہ کی سواری کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان میں بیشتر سازندے گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔

میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں شہزادہ بے نظیر کی سواری کا بیان کرتے ہوئے شہزادہ کے ہمراہ گھوڑوں پر سازندوں کا ہونا بیان کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

"وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی — قدم با قدم بالباس زری
بجاتے ہوئے شادیانے تمام — چلے آگے آگے ملے شادکام"

میر حسن کا یہ بیان دراصل شجاع الدولہ بہادر ہی کے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ شہزادہ کی سواری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا کہ میر حسن اپنی مثنوی سحر البیان شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ سحر البیان میں عہد شجاع الدولہ کے بزم کا بیان ملتا ہے اور سودا کے قصیدہ میں عہد شجاع الدولہ کی رزم آرائیوں میں موسیقی کے سُروں کی چلت پھرت کا بیان ملتا ہے۔ ان تخلیقات کے بہ غور مطالعے سے عہد شجاع الدولہ میں موسیقی کے وجود اور ترقی و ترویج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ موسیقی کے یہ دالہ و شیدا تھے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے موسیقی کو دربار کے ایوانوں سے نکال کر تہواروں کے سٹیج پر عوام سے روشناس کرایا۔ انھوں نے موسم اور تہواروں کے موقع پر رقص اور موسیقی کی محفلیں آراستہ کیں۔ چنانچہ ہولی، بہار، بسنت پر جشن منائے جاتے۔ عوام نے اس جدت کو پسند کیا۔ اور روایت کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ان محفلوں میں عوام کے ہر طبقہ کے لوگ جوش و خروش سے شریک ہوتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ آصف الدولہ کی یہ کوشش آج کی اصطلاح میں قومی یک جہتی کو مضبوط بنانے کا عمل تھا۔ اس موقع پر راگ/راگنی کے تحت بسنت لکھے جاتے جنھیں موسیقی کے سازوں کے ساتھ گایا جاتا۔ ہولی کے موقع پر ہولی لکھی جاتی اس کا خصوصی موضوع کرشن کنھیا اور رادھا کے عشق کی داستان ہوتی اور حیدر خاں انھیں گاتے تو آسمان پر پرندے پرواز بھول جاتے۔ آصف الدولہ کی ہولی کے بیان میں استادِ محترم پروفیسر سید مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں:۔

"نواب آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ تمام رعایا ہولی کھیلتی ہے..... جب یہ سماں طاری ہوتا ہے تو نواب کی نذر کے لیے اہلِ فرنگ آتش بازی لے کر آتے ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان حکمراں صرف رسمی طور پر ہولی نہیں مناتے تھے بلکہ اسے اپنا خاص تیوہار مانتے تھے۔"

آصف الدولہ کے زمانے میں موسیقی پر بیشتر کتابیں لکھی گئیں جن کے صرف نام ہی ہم تک پہونچے ہیں۔ لیکن جو سب سے اہم کتاب آصف الدولہ کے عہد میں لکھی گئی اور ان ہی کے نام سے منسوب کی گئی وہ آج بھی مل جاتی ہے یعنی "اصول النغماتِ الاصفیہ" کتب خانۂ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں اس کتاب کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو چھوٹی تقطیع پر بہت ہی دبیز تحریر میں نقل ہوا ہے۔

"اصول النغمات الاصفیہ" وہ معرکتہ الآرا کتاب ہے جس پر آج کا تمام فن موسیقی انحصار کرتا ہے۔ جس پر موجودہ موسیقی کے نظریات اور گائیکی کا دار و مدار ہے۔" یہ کتاب جتنی مشہور اور معروف ہے اس کے مصنف کے بارے میں معلومات اتنی ہی کم دستیاب ہوتی ہیں۔" صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد رضا خاں تھے اور اس کا سنہ تصنیف

۱۸۱۳ء ہے۔"

محمد رضا خاں نے موسیقی کا فن خواجہ حسن مودودی سے حاصل کیا تھا۔ جو نواب آصف الدولہ کے عہد میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے ــــ نواب آصف الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ اس فن میں اپنے عہد کے یکتا و تنہا سمجھے جاتے تھے کہ "بڑے بڑے قوالوں اور کلاونتوں سے بازی لے جاتے تھے۔" عہد آصفی کی مشہور خواتین موسیقاروں کے ضمن میں بڑی مصدی اور سُندر جان کا نام لیا جاتا ہے جو خیال گانے میں بے نظیر تھیں۔

خواجہ حسن مودودی نے کافی طویل عمر پائی چنانچہ عہد نواب سعادت علی خاں میں انھیں دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شجاع الدولہ بہادر اور آصف الدولہ ہی کی طرح سعادت علی خاں بھی سرود و نغمہ کے شائق تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ جس کمرے میں کاغذات دیکھتے تھے اس میں ایک طرف طوائفوں اور رقاصاؤں کی چوکی بھی ہوتی تھی چنانچہ جب سعادت علی خاں کاغذات دیکھتے دیکھتے تھک جاتے یا اُکتا جاتے تو موسیقی و رقص کے سُر اور لَے سے دل و دماغ کو تازہ کرتے تھے۔

اس زمانے میں راگنی بھیرویں بہت مشہور ہوئی تھی اس سلسلہ میں مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

"سعادت علی خاں کے زمانے ہی سے بڑے بڑے عالم و فاضل بھیرویں سننے کے شیدائی تھے۔ راقم کے مورثِ اعلا خان علامہ نواب تفضّل حسین خاں نمازِ صبح کے بعد بھیرویں سنتے تھے۔"

اور مولانا ابوالکلام آزاد تفضّل حسین خاں کے ذوقِ موسیقی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اودھ کی نوابی کے دَور میں تفضّل حسین خاں علّامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی، شوستری صاحبِ تُحفتہ العالم کلکتہ میں ان سے ملا تھا جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے وہ لکھتا ہے ــــ تمام علوم عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی بدرجہ اجتہاد رکھتے ہیں اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں ــــ ایک ماہرِ فن سازندہ صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خوابگاہ میں خواب آور گیت چھیڑ دیا کرے۔"

شوستری کی تحریر اور مرزا جعفر حسین کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علاّمہ نہ صرف موسیقی کے عملی پہلو ہی سے واقف تھے بلکہ موسیقی کے فلسفیانہ نکات پر بھی ان کی نظر تھی۔ شب کو خواب آور گیت سننا اور صبح بھیرویں سننے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علاّمہ "راگ مالا" سے بھی واقفیت رکھتے تھے کیونکہ بغیر راگ مالا کے نکات سمجھے کسی فرد کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سُروں کی کیفیات کو جان لے۔

غازی الدین حیدر کا عہدِ حکومت مختصر تھا لیکن اودھ کی موسیقی کے باب میں یہ زمانہ بڑا مبارک و مسعود قرار دیا جائے گا کیونکہ غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت میں میاں شوری نے سرحد کے لوک گیت ٹپّہ کو ہندستانی موسیقی سے روشناس کروایا اور اس صنف کو پروان بھی چڑھایا۔ غازی الدین حیدر ہی کے زمانے میں بڑے حیدر خاں جیسا خیال گانے والا گذرا ہے جس نے نوابِ اودھ کو دوبارہ دربار میں مدعو کرنے سے باز رہنے کی التجا کی تھی۔ حیدر خاں اپنے فن میں انتہائی پختگی رکھتا تھا اسی لیے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بڑے موسیقی کی دنیا کا عام لقب ہے جو مرہٹی سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'خود سر استادِ فن' کے ہوتے ہیں یعنی ایسا فن کار جسے اپنے فن کی خوبیوں کا علم ہو اور جو دوسروں کی فنی کمزوریوں کو ایک لمحہ برداشت نہ کرتا ہو۔

غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا بھی رواج ہوا اور مرثیہ خوانی و سوز خوانی اب موسیقی کے اصولوں کے موافق اور مطابق ہونے لگی۔ اس زمانے میں ایسے ایسے اہلِ فن' سوز خواں پیدا ہوئے کہ بڑے بڑے موسیقی کے فن کار انھیں سُن کر کان پکڑتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب میں لکھتے ہیں:

"مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرزِ نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلّم الثبوت اُستاد کہا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا اس طرح کا دھرپد، خیال، ٹپّہ گایا اور جتایا کہ کبھی کسی نائک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا پھولا پھلا وہ اس کا پیرو ہوا۔ اور جس نے ڈھنگ جُدا کیا وہ ٹکسال باہر بےڈھنگ

ہوا۔ اگر تان سین جنیا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا ....
بھیک مانگ کھاتا گمرنہ گاتا ہزاروں شاگرد جگت استاد
ہوا، مولوی سب میں پریزاد ہوا ۔"

جناب امداد امام اثر نے اپنی تصنیف کاشف الحقائق میں بھی میر علی سوزخواں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ علاوہ ازیں شاد عظیم آبادی نے میر علی سوزخوان کے علاوہ میر علی حسن و میر بندہ حسن لکھنوی سوز خوان کا ذکر کیا ہے۔ میر علی سوزخوان کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جب میر ضمیر کا مرثیہ ع
سپیدۂ صبح کا جب رَن میں آشکار ہوا۔ الخ بھیرویں میں پڑھا تو سیکڑوں کو غش آگیا۔ اور برسوں تک لوگ اس کا مزا لیتے رہے ۔"

شاد عظیم آبادی نے جو کچھ لکھا ہے وہ صدفی صد صحیح ہوسکتا ہے اور اس مرثیہ کے جادو نے سننے والوں کے سر پر چڑھ کر اس لیے اثر کیا ہوگا کہ میر ضمیر نے اپنے مرثیہ کے چہرہ میں صبح کا منظر بیان کیا ہے اور بھیرویں صبح گائی جانے والی راگنی ہے۔ راگنی کا تیور سُر اور صبح کے منظر نے یقیناً "سماں اور سماع" باندھ دیا ہوگا۔ شاد عظیم آبادی کے بیان کے تناظر میں مرزا جعفر حسین کی تحریر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس عہد میں بھیرویں کا چلن بہت ہوگیا تھا اور خان علامہ تفضل حسین بھیرویں بڑے ذوق وشوق سے سُنا کرتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سوز خوانی کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں :

"سوز خوانوں کا اصول تھا کہ جب ابتدا میں وہ کسی کا مرثیہ
پڑھتے تھے تو پھر دوسرے شاعر/ مرثیہ نگار کے سوز کو ہرگز نہ
پڑھتے تھے ۔"

گویا کتاب ناجو اور بنی کے مصنف کا دور آتے آتے مرثیہ خوانی نے موسیقی کو تقدس اور پاکیزگی عطا کردی تھی ـــ اور اس کا اصطلاحی نام سوز پڑگیا تھا۔ یہاں مذہب کی طرف سے موسیقی کو سندِ اعتبار ملی تھی۔ چنانچہ سوز خوانی اپنے عروج پر پہونچی ـــ

اس پس منظر میں واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دلی میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موسیقی اپنی اصلی کیفیت و ماہیت کی طرف واپس آگئی تھی۔ دربار سے وابستہ فنکاران موسیقی اس فن کو اس کی پوری پاکیزگی و طہارت کے ساتھ برت رہا تھا جبکہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر اُسے آسان اور پُرلطف بنانے میں مصروف تھے۔ واجد علی شاہ نے فنِ موسیقی، اپنے وقت کے نامور اُستاد، باسط خاں سے سیکھا تھا۔ واجد علی شاہ اختر، فن موسیقی پر اس حد تک دسترس رکھتے تھے کہ ان کے ہم عصر مصنفین انھیں اپنے عہد کا سب سے بہتر فنکار قرار دیتے ہیں اور ان کی مہارتِ فن کا بیان کرتے جاتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"عہد واجد علی شاہ میں پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں اور محمد علی خاں، خاندانِ تان سین کے افراد تھے۔ (یہ تمام فنکار) نعمت خاں اور باسط خاں کے شاگرد تھے۔ گوہر جان لکھنوی ٹیا برج کی ایک محفل میں تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو بجایا کی کہ تمام اہل کمال دنگ رہ گئے۔ نجبن، ٹپہ گانے میں فرد تھی۔ نظام الدین احمد خاں، محمد احمد خاں، حیدر علی خاں، جھجو خاں عہدِ واجدی میں موسیقی کے ماہرین شمار ہوتے تھے۔ شوری ٹپہ گانے میں بے مثل تھا۔ والا قدر نواب وزیر مرزا بہادر ٹھمری گانے میں مشہور تھے۔ ڈولے خاں لکھنوی، ہوری اور دھرپد گانے کا استاد تھا۔ نواب گیتی آرا بیگم، نواب حضور عالم، وزیر اعظم کی صاحبزادی تھی، جلترنگ بے مثال بجاتی تھی۔ مہدی حسن خاں .... بین بجانے میں برصغیر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسماۃ شرعی دریاآبادی حسین بخش لکھنوی کی شاگرد تھی۔ موسیقی دانی کے ساتھ سارنگی بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔"

ٹیا برج میں واجد علی شاہ اختر اور ان کے فنکاروں کے بارے میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :

"ٹیا برج میں احمد خاں، تاج خاں، غلام حسین خاں باکمال گویئے تھے۔ دلی خاں اپنے سحر آفرین گلے کی وجہ سے کلکتہ میں مشہور تھا۔ زہرہ اور مشتری گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ بی حیدر کا سوز سننے کے لیے محرّم میں لوگ گھنٹوں انتظار کرتے تھے۔ محمد جی کے مقابل میں سارے ہندوستان میں کوئی کامل طبلہ نواز نہیں تھا۔"

(باقی ص ۱۶۲ پر)

واجد علی شاہ کتھک بہت اچھا کرتے تھے۔ اپنی تصنیف "بنی" میں

بشیر فاروقی
۵۱۵، مُراد علی لین، عقب رائل ہوٹل
لکھنؤ

لکھنؤ کے
مرجعِ خلائق مزارات

مزار حضرت شاہ قوام الدین چشتیؒ

لکھنؤ زمانۂ قدیم سے اہل اللہ اور صوفیائے کرام کا مسکن رہا ہے۔ یہاں ایسے بہت سے مرجعِ خلائق مزارات ہیں جو قومی یک جہتی کا مرکز ہیں اور جہاں ہر قوم کے افراد بغیر تفریق مذہب و ملت آتے ہیں اور فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے تذکرے نزہتہ الخواطر، مشائخ نقشبندیہ، آئینۂ اودھ، عین الولایت اولیاء ہند و پاکستان، تذکرۂ اولیاء، اعجاز جہانگیری اور دیگر کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان اہل اللہ اور صوفیائے کرام کا نام شجرۂ قادریہ، شجرۂ نقشبندیہ، شجرۂ قلندریہ اور شجرۂ چشتیہ وغیرہ میں مذکور ہے۔ لکھنؤ میں مدفون ان اکابرین سلاسل میں سے چند کے تذکرے درج ذیل سطور میں نذر قارئین ہیں۔

حضرت شاہ قوام الدین چشتیؒ

امام المشرقین، حاجی الحرمین شاہ قوام الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مخدوم نصیر الدین کے خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد کے واصل بحق ہونے کے بعد آپ کچھ روز مخدوم جہانیاںؒ کی خدمتِ اقدس میں رہے۔ مخدوم شیخ سارنگ رحؒ نے آپ ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ آپ نے اپنی ساری زندگی رشد و ہدایت میں بسر کی۔ ۸۴۰ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار مبارک میڈیکل کالج لکھنؤ کے احاطہ میں ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت شاہ میناؒ

شیخ الاعظم، قطب العالم حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا نام مُبارک شیخ محمد تھا۔ آپ کے والد محترم کا نام شیخ قطب الدین تھا۔ شیخ قطب الدینؒ دہلی سے جون پور آئے تھے۔ جون پور کے بعد پھر دلمؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد ازاں دلمؤ سے حضرت حاجی الحرمین شیخ قوام الدینؒ کی خدمت میں لکھنؤ پہونچے۔ بچپن ہی میں آپ کے عادات و اطوار سے آثارِ ولایت ظاہر تھے۔ جب آپ پانچ برس کی عمر کو پہونچے تو آپ کو بغرض تعلیم مکتب بھیجا گیا۔

معلم نے آپ کو پڑھانا شروع کیا اور کہا: "کہو الف"۔

آپ نے کہا "الف"۔ لیکن جب معلم نے کہا: "کہو ب"۔

تو آپ نے کہا: "دوسرا کہاں؟" پھر الف کے اس درجہ معنی بتائے کہ مکتب کے طلباء اور معلم سب ہی حیران رہ گئے۔

دس برس کی عمر تک شیخ قوام الدین نے آپ کی تربیت فرمائی اور پھر شیخ صاحب کے حسبِ وصیت آپ نے ان کے خلیفہ قاضی فریدوں اور قاضی فریدوں کے بعد مولانا شیخ اعظم سے بالترتیب شرح کافیہ اور کتاب وقایہ پڑھی۔ آپ کبھی بے وضو نہیں رہتے تھے۔

عین الولایت میں مرقوم ہے کہ ایک بار شیخ سارنگؒ نے آپ کو

△ مزار حضرت شاہ میناؒ

کسی شہر بھیجا۔ جب آپ اس شہر سے ہوکر دوبارہ شیخ سارنگؒ کی خدمت میں پہونچے تو حضرت شیخ سارنگ نے فرمایا کہ اس شہر میں ایک اور درویش ہیں تم نے ان سے ملاقات کی کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو آپ ہی کی محبّت کافی ہے۔ حضرت شیخ سارنگؒ نے حضرت شاہ میناؒ کی اس بات سے خوش ہوکر انھیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا

حضرت شاہ میناؒ ایک صاحبِ کشف ولی کامل تھے۔ ایک بار شمس خاں نامی ایک شخص آپ کے پاس اس ارادے سے آیا کہ اگر آپ ایک انار اس کو دیں اور وہ چاروں طرف سے پھٹا ہو اور اس کے سب دانے سرخ ہوں تو وہ جانے کہ آپ ولی ہیں۔ آپ نے اس کے حسبِ منشا انار اس کو دیا اور پھر فرمایا:

"فقیروں کا امتحان لینا اچھا نہیں ہوتا۔ انار کی فصل نہیں ہے اگر نہ ہوتا تو میں کیا دیتا۔"

چھ ماہ علیل رہنے کے بعد ۲۳ صفر ۸۸۴ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ تاریخ وصال کا شعر یہ ہے ؂

شیخ مینا بہ ارم رحلت کرد
آہ ز اندوہ چنیں شیخ اجل

حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا مزارِ اقدس شاہ مینا روڈ متصل میڈیکل کالج لکھنؤ ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت شاہ پیر محمدؒ

آپ جون پور کے سادات میں تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت عبداللہ سیاح چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ درسی کتابیں جون پور، قنوج اور دہلی میں پڑھنے کے بعد لکھنؤ تشریف لائے۔ آپ متوکل فقرا میں تھے۔ آپ کو جو بھی نذرانے ملتے وہ سب مہمان نوازی میں صرف کر دیتے تھے۔ آپ نے فیض باطنی حضرت شاہ میناؒ کی روح پرفتوح سے حاصل کیا۔ آپ کی متعدد عارفانہ تصانیف اور تالیفات ہیں۔ اکثر مشہور علماء تحصیلِ علم کے لیے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں راہِ خدا میں صرف کیں۔ آپ کا مزار مبارک دریائے گومتی کے کنارے ایک بلندی پر زیارت گاہِ خواص و عوام ہے یہ مقام ٹیلہ شاہ پیر محمد کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحمٰنؒ

حضرت شاہ عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سادات میں تھے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید محمد حسن تھا، آپ کی ولادت ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ میں آثار ولایت نمایاں تھے۔ آپ نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے دور حکومت میں ۱۲۱۴ھ میں لکھنؤ تشریف لائے۔ شروع میں شاہ پیر محمدؒ کے مزار ٹیلے والی مسجد میں کچھ دن رہنے کے بعد آپ مسجد درگاہ حضرت مخدوم شاہ میناؒ میں منتقل ہو گئے۔ اس مسجد میں آپ تقریباً سات سال تک قیام پذیر رہے۔ یہاں کے بعد آپ مسجد محلہ ڈیوڑھی آغا میر متصل سٹی اسٹیشن لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ یہی جگہ اب آپ کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ نواب غازی الدین حیدر کی بیگم شاہ صاحبؒ کی عقیدت مند تھیں۔ اُنھی نے اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ آپ تلاوت کلام پاک کے بعد بڑی پابندی سے مثنوی مولانا روم پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت صبر و تحمل، بلند اخلاق اور بلند ہمتی کی آئینہ دار تھی۔ مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ آپ ہی کی دعا سے تولد ہوئے تھے۔ آپ فلسفۂ وحدت الوجود کے عظیم مبلغ تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ،

سلسلۂ علیہ قلندریہ، سلسلۂ ستاریہ، سلسلۂ نقشبندیہ، سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں اجازت و خلافت تھی۔ آپ کی تاریخ وفات ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۸۳۰ء ہے۔ آپ کا مزار مبارک آغا میر کی ڈیوڑھی متصل سٹی اسٹیشن لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت شاہ مُراد اللہ نقشبندیؒ

آپ نسباً فاروقی تھے۔ آپ کی ولادت تھانیسر میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام قلندر بخشؒ تھا۔ آپ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص و حضرت شاہ نعیمؒ اللہ بہرائچی کے خلیفہ تھے۔ آپ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ نعیم اللہؒ کے وصال کے بعد لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ مکتوباتِ عالیہ جعفر علی زیدی گورکھپور میں مرقوم ہے کہ آپ مشہور اہلِ سماع چشتی بزرگ حضرت شیخ نظام شاہ بلخی چشتی کی نسل میں ہیں۔ آپ کچھ عرصہ حجرہ مسجد ٹاٹ شاہ فیض آباد میں قیام پذیر رہے۔ آپ ایک صاحبِ کشف و کرامت بزرگ ہیں۔ آپ کی کرامتوں کے تذکرے "قطب دائرے" اور "شہر اولیاء" میں مرقوم ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ ہے۔ آپ کا مزارِ مبارک رائل ہوٹل لکھنؤ کے ایک حصہ میں ہے جس میں آنے جانے کا راستہ مراد علی لین کی طرف سے ہے۔ یہاں آپ کے سجادہ نشین حضرت کریم اللہ شاہؒ کا بنوایا ہوا ایک اکھاڑہ بھی ہے۔ یہ جگہ اکھاڑہ کریم اللہ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

خواجہ محمد نبی رضا شاہ المعروف دادا میاںؒ

آپ کے والد بزرگوار کا اسمِ گرامی حسن رضا خاں ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۲۸۴ھ ہے۔ جائے پیدائش بھینوڑی ضلع رام پور ہے۔ آپ جسمانی طور پر بہت قوی تھے اور فوج میں ملازم تھے۔ آپ حضرت شاہ عبدالحیٔ چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے خواجہ محمد نبی رضا شاہؒ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور ابتدا میں مسجد محمد خاں میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ دنیاوی دولت و شہرت سے بے نیاز ہو کر رشد و ہدایت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے ہندستان کی متعدد زیارت گاہوں کا سفر کیا اور فیضِ روحانی حاصل کیا۔ تاریخ وفات ۲۴ ربیع الاوّل ۱۳۲۹ھ ہے۔ آپ کی درگاہ اسلامیہ قبرستان صدر بازار لکھنؤ سے ملحق مال ایونیو میں فیض بخشِ ہر خاص و عام ہے۔

△ درگاہ حضرت خواجہ محمد نبی رضا شاہ (دادا میاںؒ)

حضرت مولانا عین القضاۃؒ

آپ کے والد بزرگوار کا نام الحاج سید شاہ محمد وزیر علی تھا۔ آپ سادات میں سے تھے۔ آپ ۲۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کی غرض سے آپ ابتدا میں بمبئی تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ بمبئی میں قیام کرنے کے بعد لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ حضرت موسیٰ ترکیسری رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے تھے اور انہی کی خدمت میں رہ کر سلسلۂ نقشبندیہ کی تکمیل کی۔

حضرت مولانا عین القضاۃؒ ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔

آپ کا سنِ وفات ۱۳۴۳ھ ہے۔ سنِ وفات کا شعر یہ ہے:

گفت عزیز ایں سالِ رحلت
زیر زمیں شد مہر ملت

آپ کا مزارِ مبارک مدرسۂ عالیہ فرقانیہ چوک لکھنؤ میں زیارت گاہ ہر خاص و عام ہے۔

□□

اشفاق احمد خاں
اسسٹنٹ میوزیم، لکھنؤ

صوبۂ اودھ کے سکّے

صوبہ اودھ کے سکوں کے متعلق جاننے سے پہلے اودھ کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ ۱۷۱۹ء میں دہلی کے مغل بادشاہ نے اپنے وزیر سلطنت محمد امین سعادت خاں برہان الملک کو صوبہ اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ برہان الملک دہلی چھوڑ کر اودھ میں اجودھیا آئے اور اسے ہی اپنا مستقر بنایا۔ ۱۷۳۰ء میں برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے داماد منصور علی خاں صفدر جنگ اودھ کے صوبہ دار ہوئے اور ۱۷۴۷ء میں انھیں دہلی سلطنت کا وزیر بھی مقرر کیا گیا۔ اس وقت سے وہ اور ان کے کئی جانشین نواب وزیر کہے گیے۔ صفدر جنگ نے شہر فیض آباد کی بنیاد از سر نو ڈالی۔ ۱۷۵۳ء میں انکا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ ان کی جگہ اودھ کی گدی پر رونق افروز ہوئے۔

۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی بادشاہ دہلی کے عہد میں بنارس کی ٹکسال کا انتظام شجاع الدولہ کے سپرد ہوا۔ اور ۱۷۷۵ء یعنی شجاع الدولہ کی وفات تک یہ ٹکسال انھیں کے زیر انتظام رہی اور اس میں سکے بادشاہ شاہ عالم ثانی کے نام سے ڈھلتے رہے۔ نواب شجاع الدولہ نے ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء میں وفات پائی۔ بعد ازیں نواب آصف الدولہ رونق افروز تخت سلطنت ہوئے انھوں نے بجائے فیض آباد کے لکھنؤ میں ہی سکونت اختیار کرلی ان ہی کے بعد سے شہر لکھنؤ کا نام ہندوستان اور اس کے باہر بھی مشہور ہوا۔ وہ خوش نیتی اور سخاوت کے لیے بہت مشہور تھے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا جانے لگا کہ "جسکو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"۔ ان کے عہد میں مچھلی دار روپیے جن پر سنہ جلوس ۲۶ لکھا ہوتا تھا۔ بادشاہ شاہ عالم کے نام سے بنتے رہے۔ ۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کے انتقال کے بعد وزیر علی اور سعادت علی خاں تخت نشیں ہوئے مگر ان کے عہد میں کوئی خاص سکہ یا تمغہ جاری نہیں ہوا۔

۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو غازی الدین حیدر اودھ کے نواب وزیر بنے ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہسٹنگز کی ترغیب پر غازی الدین حیدر نے دہلی سلطنت سے اپنا تعلق ختم کرکے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بحیثیت بادشاہ اودھ اپنے نام سے سکہ جاری کیا۔ غازی الدین حیدر کی تاجپوشی لال بارہ دری میں بہت ہی جوش وخروش سے ہوئی اور اس موقع پر تاجپوشی کی یادگار میں ایک تمغہ بھی جاری کیا گیا جو اپنے میں اعلی درجہ کی کاریگری کا نمونہ ہے۔ اس کے ایک طرف دائرے میں تاج و بادشاہ کی شبیہ اور باقی جگہ میں پھول اور بیلیں بنی ہیں حاشیہ پر گولائی میں ذیل کا کتبہ موجود ہے:-

سکہ زر بر سیم وزر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر علی نسب شاہ زمن۔ سنہ احد

تمغے کی دوسری طرف شاہی نشان ہے۔ اس میں دو شیر ہاتھوں میں جھنڈا لیے ہوئے ہیں۔ ان جھنڈوں پر مچھلی بنی ہے۔ دونوں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹار بھی ہے۔ کٹار کے اوپر تاج اور نیچے مچھلیاں ہیں جن کی گولائی سے ایک دائرہ بن جاتا ہے۔ سب سے نیچے ایک لہردار باریک جھنڈا ہے۔ داہنے گوشہ پر حرف "ج" ہے اور کنارے حاشیہ پر گولائی میں دعائیہ شعر ہے:-

"شاہزادسال شاہا بقائے عمر تو بادا
ہزار سال باشی تو در زمان خدا"

غازی الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے جاری کیے۔

قسم الف: یہ سکہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں شاہ عالم بادشاہ کے

نام سے جاری کیا گیا تھا اس میں مچھلی ٹکسال کے نشان کے طور پر ایک طرف بنی ہوئی ہے اور فارسی کا یہ شعر کندہ ہے:۔

"سکہ زر در ہفت کشور سایہ فضل اللہ
حامی دین محمود شاہ عالم بادشاہ"

سکہ کی دوسری طرف سلطنت اودھ کا شاہی نشان دو مچھلیوں کی شکل میں بنا ہوا ہے۔ مچھلیوں کے درمیان اس کا سنہ جلوس ۲۶ اور "حرف صوبہ اودھ دار الامارۃ لکھنؤ" لکھا ہوا ہے۔ مچھلیوں کے اوپر کٹار اور تاج بنا ہوا ہے اور اس کے دائیں بائیں جھنڈا لیے ہوئے شیر بنے ہیں۔

قسم ب: یہ سکہ بھی بادشاہ نے اپنے نام سے ہی جاری کیا تھا اس پر بھی ۱۲۳۴ھ ہی لکھا ہوا ہے مگر اس پر سنہ جلوس ۵ لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ پانچ سال قبل ۱۲۲۹ھ میں اپنے والد کی جگہ پر نواب وزیر مقرر ہو چکے تھے۔

قسم ج: یہ سکہ بھی انھوں نے ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں ہی اپنے نام سے جاری کیا مگر اس میں سنہ جلوس ۵ کے بجائے سنہ احد لکھا ہے کیونکہ ان کی بادشاہت کا یہ پہلا سال تھا اور اسی سال ان کی تاج پوشی باضابطہ طریقہ سے ہوئی تھی۔ ان سکوں پر ایک طرف یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

"سکہ زر بر سیم وزر از فضل ربِّ ذُوالمِنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن"

دوسری طرف (الف) اور (ب) کی وہی عبارت اور نشانات ہیں۔

قسم د: ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ء) میں لکھنؤ کا لقب دارالامارۃ سے دار السلطنت ہو گیا اور اب یہاں کے سکوں پر "ضرب صوبہ اودھ دار السلطنت لکھنؤ" لکھا جانے لگا۔

غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں نصیر الدین حیدر دوسرے بادشاہ بنے۔ ان کے عہد کے پہلے دو سال کے سکوں پر ان کا نام سلیمان جاہ اور یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے۔

"بر ہر سکہ شاہی زر ز لطف اللہ
سند مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ"

تیسرے سال یہ شعر بدلا اور سکوں پر بادشاہ کا نام نصیر الدین حیدر ہوا اور شعر یہ لکھا جانے لگا۔

سکہ زر بر سیم وزر از فضل حق ظل اللہ
نائب مہدی نصیر الدین حیدر بادشاہ

نصیر الدین حیدر کی وفات پر ان کے چچا محمد علی شاہ تخت شاہی پر ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں جلوہ افروز ہوئے۔ انھوں نے سونے اور چاندی کے سکوں پر ایک نئے قسم کا مارک ایجاد کیا۔ اس میں سکے کی دوسری طرف شیر کی جگہ دو عورتیں ہیں جو ان کے جلوس کے پہلے اور دوسرے سال میں ننگے سر ہیں مگر بعد میں سر پر نوکیلی پگڑی پہنے ہوئے دکھائی گئی ہیں۔ سکوں پر ذیل کا شعر لکھا ہوا ہے۔

بجود و کرم سکہ زر دو جہاں
محمد علی شاہ بادشاہ زماں

محمد علی شاہ کے پہلے تین سال کے سکوں پر دوسری جانب "صوبہ اودھ بیت السلطنت لکھنؤ" لکھا ہوا ہے مگر ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) سے بجائے صوبہ اودھ کے "ملک اودھ" تحریر ہے۔

۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے اس کے عہد کے سکوں پر یہ شعر لکھا ہوا ملتا ہے:۔

زر دو جہاں سکہ شاہی بتائید اللہ
ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

سکے کی دوسری طرف مارک اس طرح سے بنا ہوا ہے یعنی ایک گھومتی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چھتر ہے اور اس کے دائیں اور بائیں طرف کسی قدر گولائی میں دو تلواریں ہیں اور کچھ اس طرح سے لکھا ہے۔ "ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس"

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں واجد علی تخت نشیں ہوئے۔ ان کے سکوں کے پہلی طرف یہ شعر لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

"سکہ زر بر سیم وزر از فضل اللہ
ظل حق واجد علی شاہ سلطان عالم بادشاہ

دوسری طرف شاہی نشان میں تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ اب بجائے

(باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

صبا نقوی
ڈی ۹۔ گل مہر پارک، نئی دہلی ۔ ۴۹

حاجی وارث علی شاہ:

یک جہتی کے علمبردار

بارہ بنکی کے پڑوس دیوی شریف میں حاجی وارث علی شاہ کے مزار پر قوالی گائی جارہی ہے: ——

" دیو داسی کنور کنھیّا
سوہن پیارے بنسی دھریّا
جنم کے راجہ سُندر چھیلا
شام بہاری " ——

حاجی وارث علی شاہ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سارے مذاہب برابر ہیں۔ ان کا قول ہے:

" نسل اور مذہب کی سرحدوں سے اوپر اٹھو کیوں کہ جو رب ہے وہی رام ہے۔"

ہزاروں اہلِ ہنود اُن کے آستانے پر کھنچ کر آئے اور آج کے زمانے میں بھی دیوی شریف آنے والوں میں کوئی آدھا حصہ غیر مسلموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

وارث علی شاہ اور اسی قسم کے صوفی بزرگ ہی تھے جو ہندستان میں اسلام کو عوام الناس تک لے گئے۔ اس برصغیر میں زیادہ تر تبدیلیٔ مذہب انھیں صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے بتایا کہ اسلام مساوات اور درد مندی کا مذہب ہے۔ ان کا مذہبی پیغام بہت سیدھا سادا تھا۔ سب کا خدا ایک ہے اور سارے انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ ظاہر ہے ذات پات کے ظلم سے پسے ہوئے لوگوں میں اس پیغام نے گھر کرلیا۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ پوری پوری برادریوں اور پورے پورے گاؤں نے کسی ایک صوفی یا پیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور مسلمان ہوگئے۔

صوفیائے کرام نے جو راہِ طریقت اختیار کی اور اس کا پرچار کیا تو وقت کے ساتھ اس میں مذہب تبدیل کرنے والوں کے بہت سے پُرانے عقائد بلکہ توہمات بھی شامل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ صُوفیا کی درگاہوں پر بہت سے ایسے رسوم دیکھنے کو ملتے ہیں جو عالمِ اسلام میں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ مزاروں پر حاضری، نذرانہ، منت ماننا چراغ روشن کرنا، قبروں پر لوبان سُلگانا، تبرک کے طور پر شیرینی اور پلاؤ وغیرہ تقسیم کرنا، مزاروں کا طواف، مزاروں پر رکھی ہوئی چیزوں اور پیروں کے تبرکات کو بوسہ دینا اور یقین کرنا کہ اس سے بیمار کو شفا ہوگی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہندستانی اسلام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب ہندو ماحول کی دین ہیں۔ ان بزرگوں کے نام کے ساتھ فوق البشری خصوصیات وابستہ کرنا اور ان کے مزاروں پر سجدہ کرنا ہندو پرستش کے طریقوں سے مستعار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زاہدانِ خشک نے شریعت کا نام لے کر ان چیزوں کو بدعت قرار دیا ہے اور بار بار " اصلاح " کا بیڑا اٹھایا۔ جو چیز انھیں سب سے زیادہ ناگوار تھی وہ یہ کہ ان طریقوں میں انھیں بُت پرستی کا شائبہ ملتا تھا۔ ہندستانی ماحول میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام کو خطرہ ان مسلمانوں سے ہے جو اپنے رسوم لے کر اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہندستان میں مزار پرستی ہندو بُت پرستی کی مانند ہے جو
مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے سیکھ لی ہے"۔

چوں کہ مزاروں کی عزت اور وہاں کے عرس اور میلے ٹھیلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور تہذیبی بندھن کی شکل اختیار کر چکے ہیں اس لیے ان عوامی مظاہروں کے خلاف تحریکیں اس میل ملاپ کی عمارت کو کمزور کرنے کے مترادف ہیں۔ اصلاحی تحریکوں نے شاید بہت سے مسلمانوں کو اپنے اعمال و رسوم پر نظر ثانی کرنے کے لیے اکسایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستانی اسلام سے اس یک جہتی کی روایت کو یکسر ختم نہیں کر سکیں آج بھی ملک کے بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے جتنی کشش مزاروں اور درگاہوں میں ہے اتنی شاید مسجدوں میں نہیں ہے ۔۔ اتنی اصلاحی تحریکوں کے باوجود یہ روایتیں آج بھی زندہ ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان میں بڑی جان ہے۔ اگر اہلِ شریعت عام لوگوں کو آج تک صوفیا کی درگاہوں اور ان کے مزاروں سے الگ نہیں کر سکے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل ہندستان میں اسلام کی اشاعت کا سہرہ انھیں صوفی بزرگوں کے سر ہے۔

اتر پردیش ہندوتو کا گڑھ سمجھا جانے لگا تھا لیکن آج بھی صوفیوں کی درگاہیں ہندو مسلم یک جہتی کی پناہ گاہیں ہیں۔ ہزاروں ہندو صوفیوں کی ان درگاہوں پر اس لیے حاضری دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ ان مزاروں سے ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ بہت سے مزار تو ایسے ہیں جو اس لیے زیادہ مقبول ہیں کہ ان کی سرپرستی ہندو کرتے ہیں۔ مثلاً دیویٰ شریف میں سب سے زیادہ چڑھاوا چڑھانے اور نذرانہ پیش کرنے والی ایک ہندو راجپوت خاتون ہیں جو اجمیر میں رہتی ہیں لیکن ہر دوسرے مہینے درگاہ کی زیارت کے لیے آتی ہیں۔ حاجی وارث علی شاہ کی درگاہ کے آس پاس جو لوگ رہتے ہیں ان میں ان کے ہندو ارادت مند بھی ہیں اور مسلمان بھی ۔۔ یہ سب گیروا لباس پہنتے ہیں اور ناکتخدائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

نریش سنگھ ایک بھومی ہار ہیں، جن کا تعلق بہار سے ہے۔ کئی برس پہلے وہ وارث علی شاہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے درگاہ کے قریب زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

"صرف اس لیے کہ میں نے ایک سنت کی خدمت میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا، یہ کہنا کہ میں ہندو نہیں رہ گیا، غلط ہے۔ وارث علی شاہ کہا کرتے تھے کہ سب مذہب برابر ہیں۔ کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے مذہب سے بہتر ہے۔ وہ مسلمان تھے لیکن دیوالی کے تہوار میں حصّہ لیتے تھے۔ میں انھیں کے دکھائے راستے پر چل رہا ہوں"۔

□□

وارث علی شاہ کے چند اقوال

- عشق میں جب تک آدمی کافر نہیں ہوتا، مسلمان نہیں ہوتا۔
- صاحبِ توحید ہونا آسان ہے مگر صاحبِ تصدیق ہونا مشکل ہے
- اسلام اور چیز ہے ایمان اور چیز۔

□□

اودھ کے سکّے ------ صفحہ ۱۶۰ کا بقیہ

عورتوں کے مچھلی دار پریاں بنی ہوئی ملتی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں واجد علی شاہ نے اپنے سکوں کی دوسری طرف بجائے "ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ کے" ملک اودھ اختر نگر" لکھوانا شروع کیا۔ بادشاہ خود شاعر تھا اور اختر تخلص کرتا تھا۔ اس طرح کے سکے بہت کم ملتے ہیں کیونکہ اسی سال ضرب کے نام کی پھر تبدیلی ہوئی اور" بجائے ملک اودھ اختر نگر" کے "بیت السلطنت لکھنؤ ملک اودھ اختر نگر" لکھا ہوا ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کے سکے بہت نفیس ساخت کے ہیں۔ روپیہ کے علاوہ چاندی کی اٹھنی، چونی، دونی اور اکنی بھی پائی جاتی ہے۔ سونے کے سکوں میں اشرفی اور نصف اشرفی بھی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مجاہدوں نے بھی تانبے کے سکے اودھ کی نقل پر چلائے مگر ان کی ساخت بہت خراب ہے۔

□□

"شاہانِ اودھ کا عہد باہمی اتحاد کے عروج کا عہد تھا"

—— پرنس انجم قدر

"ملک میں حالیہ سیاسی اور سماجی بحران کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی، ثقافتی وراثت کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔"
یہ جواب آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے وارث پرنس انجم قدر کا تھا۔

گزشتہ دنوں پرنس انجم قدر کی ماہنامہ نیا دور کے مدیر سید امجد حسین کے ساتھ ہونے والی گفتگو قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کی جا رہی ہے:

امجد حسین: آج ملک میں جو افراتفری اور منافرت کا بازار گرم ہے آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

انجم قدر: دراصل آج انسان قومی مفاد سے زیادہ ذاتی مفاد کے بارے میں سوچ رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص بغیر کسی کے نقصان کی پروا کیے ہوئے خود فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور اپنے حصار کے باہر کسی اور کے وجود کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔

امجد حسین: شاہانِ اودھ کے زمانے میں قومی یک جہتی اور اخوت کے جذبے کو بہت فروغ تھا جس کا آج کے معاشرے میں فقدان ہو چلا ہے، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

انجم قدر: وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں تغیر اور تبدل ایک فطری عمل ہے اسی کلیے کے زیر اثر اودھ میں بھی تبدیلی آئی۔ کچھ تو اس بنا پر اور کچھ خارجی عناصر کے اثر سے ہمارے معاشرے کا نظام بدلا۔ آزادی کے بعد سے عمومی طور پر تمام ہندستان اور خصوصی طور پر اترپردیش کے بے شمار افراد نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور اودھ کو آباد کیا۔ ان کی فکر جدا تھی، ان کی سوچ الگ تھی اور مختلف ماحول کے پروردہ ان افراد نے اودھ کے باشندوں پر بھی اپنا زبردست اثر چھوڑا۔ اودھ کی اس تاریخی روایت کا جس میں "پہلے آپ" کا جذبہ غالب تھا زوال ہوا اور اس کی جگہ "پہلے ہم" نے لے لی۔ اس نئے نظام زندگی میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی فوت ہو گیا۔

امجد حسین: پرنس یہ بتائیے کہ اگر واجد علی شاہ یا شاہانِ اودھ آج کے سیاسی بحران میں اجودھیا مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کرتے تو وہ کون سا راستہ اختیار کرتے؟

انجم قدر: امجد صاحب! اجودھیا مسئلہ گزشتہ دنوں پہلی بار نہیں اٹھا ہے بلکہ ۱۸۵۵ء میں واجد علی شاہ کے عہد میں بھی ایک بار اجودھیا کا مسئلہ اٹھ چکا ہے۔ اس زمانے میں بھی اس مسئلے نے تنازعے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ایجنٹ نے جو بودھ بھکشو تھا، اجودھیا میں ایک مٹھ کی تعمیر کرا کے وہاں پر مذہبی تعلیم دینی شروع کی تھی اور اپنے اس درس و تدریس کے چھ مہینے کے بعد ہی اس نے بابری مسجد کے باہر ایک مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسی مقام پر رام چندر جی نے جنم لیا تھا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں جب یہ تنازعہ آیا تو انھوں نے عدل اور

انصاف کے تقاضے کے تحت ۱۷×۱۲ کے رام چبوترے کی تعمیر کرائی تھی جس سے اودھ کی فضا مذہبی تعصبات سے محفوظ ہوگئی تھی۔ اس تنازعے سے قبل اور اس کے بعد پھر اجودھیا میں کبھی بھی نہ تو ہندو مسلمان تفریق کی بات چلی اور نہ ہی مذہبی تعصبات نے کبھی سر ابھارا۔ اجودھیا کے لوگ بہت ہی بھولے اور سیدھے تھے اور آج بھی وہ بہت ہی بھولے اور سیدھے ہیں۔ وہاں کے مہنت بھی صلح و آشتی اور امن و امان پر یقین رکھتے ہیں۔

امجد حسین: قومی یک جہتی کے لئے شاہانِ اودھ کے اور کون کون سے نمایاں کارنامے ہیں؟

انجم قدر: گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے کے لئے واجد علی شاہ نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس نے "دوئی" کا تصور ہی مٹا دیا۔ رام لیلا کے ڈرامے "رہس" واجد علی شاہ کی ایجادات ہیں۔ جب وہ "کراؤن پرنس" تھے تو انھوں نے ہندی زبان میں "کرشن کنھیا" لکھی۔ ہندی میں ٹھمری لکھی ٹھمری اور دادرا کی ایجاد خود انھوں نے ہی کی ہے۔ واجد علی شاہ کی ٹھمری "بیابن آوت ناہی چین" آج بھی مقبول خواص و عوام ہے۔ واجد علی شاہ کرشن بھکت تھے رام اور کرشن کے وہ اسی طرح سے عقیدت مند تھے جیسا کہ کوئی ہندو ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کا ادبی کارنامہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ اردو ڈرامے کے موجد تو وہ خود تھے ہی، دوسروں کو بھی اس فن کی طرف انھوں نے راغب کیا اور امانت لکھنوی سے "اندر سبھا" جیسا ڈرامہ لکھوایا۔ شاہان اودھ نے ہمیشہ ہی ہندوؤں کو بڑی عزت دی۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے، جھاؤلال، میوارام، دیوان نوبت رائے، مہاراجہ بالکرشن، منشی بہادر بہاری لال، راجہ کندن لال اور درشن سنگھ جیسے ہندوؤں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے۔ رواداری، ایثار، محبت، قربانی، باہمی اتحاد، خیر سگالی اور اخوت کے جذبے کا فروغ جس قدر شاہانِ اودھ کے دور میں ہوا ہے اس کی مثال کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دور میں عوام یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ:

اب تو ہم جنت بھی نہ لیں گے بجائے لکھنؤ

شاہانِ اودھ اور موسیقی

صفحہ ۱۵۵ کا بقیہ

انھوں نے نقشہ جات بناتے ہوئے کتھک کے بھاؤ قلم بند کیے ہیں" طبلہ خوب بجاتے تھے۔ لے کاری میں ان کا جواب نہ تھا۔ "کتاب ناجو اور بنی" میں شاہ اختر نے طبلہ کی مختلف گتیں اور تال درج کیے ہیں۔ ٹپہ، دھرپد، خیال ایسا گاتے کہ اگر تان سین ہوتا کان پکڑتا اور دورو مرتا لیکن کبھی نہ گا تا۔ موسیقی کے ان تمام اصنافِ نغمہ و ساز... کے باج کی تفصیل واجد علی شاہ نے اپنی تصانیف "کتاب ناجو" "دلھن" اور "بنی" میں درج کی ہے۔ جن کے مطالعہ سے واجد علی شاہ کے فن اور ان کی جانکاری پر روشنی پڑتی ہے۔

اودھ میں موسیقی کی ترقی و ترویج اور موسیقی کا ارتقاء ہندوستانی موسیقی کے لیے بیش بہا اضافہ ہے۔ اودھ نے ہندوستانی موسیقی کو ٹپہ، ٹھمری اور دادرا جیسے اصنافِ نغمہ عطا کیے اور فن طبلہ کو پورا ایک دبستان۔ فرخ آبادی باج عطا کیا۔ علاوہ ازیں سوزخوانی کی صورت میں موسیقی ہند پر سے مذہبی قیود کو ختم کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ہندوستانی موسیقی کی تاریخ کا کوئی بھی طالب علم یا مؤرخ ــــ اودھ میں موسیقی کے ارتقاء کو بیان کیے بغیر ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ قلمبند کر ہی نہیں سکتا۔

کتابیات:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد "غبار خاطر" مرتبہ مالک رام
۲۔ مولانا عبدالحلیم شرر، "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"
۳۔ ڈاکٹر صفدر حسین "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" ـ تاریخ تمدن اور تہذیب
۴۔ نجم الغنی "تاریخ اودھ"
۵۔ میر حسن دہلوی: سحرالبیان"
۶۔ ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی "اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر"
۷۔ مرزا جعفر حسین "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار"
۸۔ عزیزہ بیگم "اصول النغمات الآصفیہ" مضمون مشمولہ رسالہ فنون لاہور دسمبر ۱۹۶۱ء
۹۔ "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" فارسی ادب جلد سوم
۱۰۔ مرزا رجب علی بیگ سرور "فسانۂ آزاد" مرتبہ محمود اکبرآبادی
۱۱۔ امداد امام اثر "کاشف الحقائق" مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی
۱۲۔ شاد عظیم آبادی "فکر بلیغ" مرتبہ نقی محمد ارشاد

گورنر ھاؤس
میں
افطار کا
ایک منظر
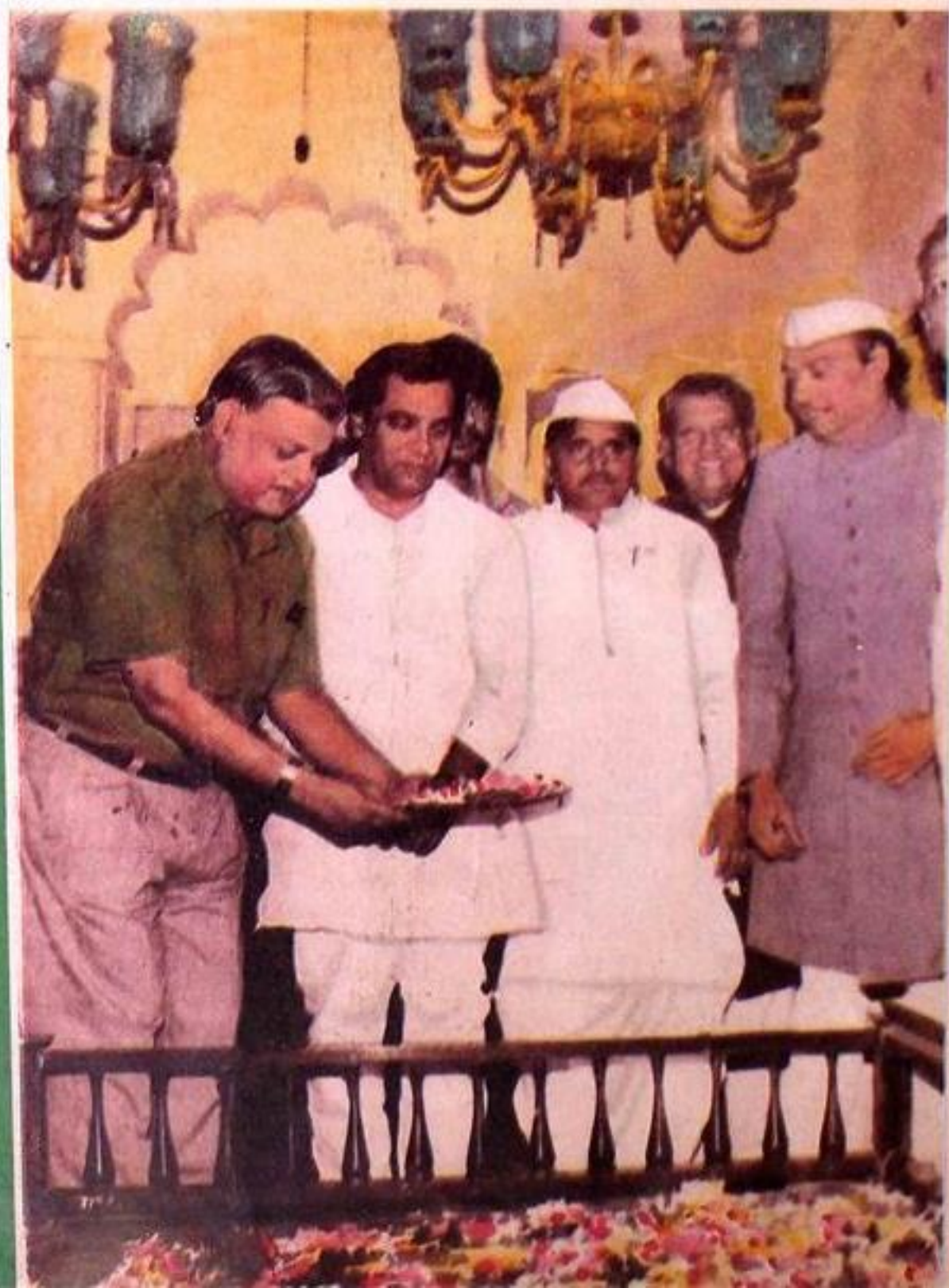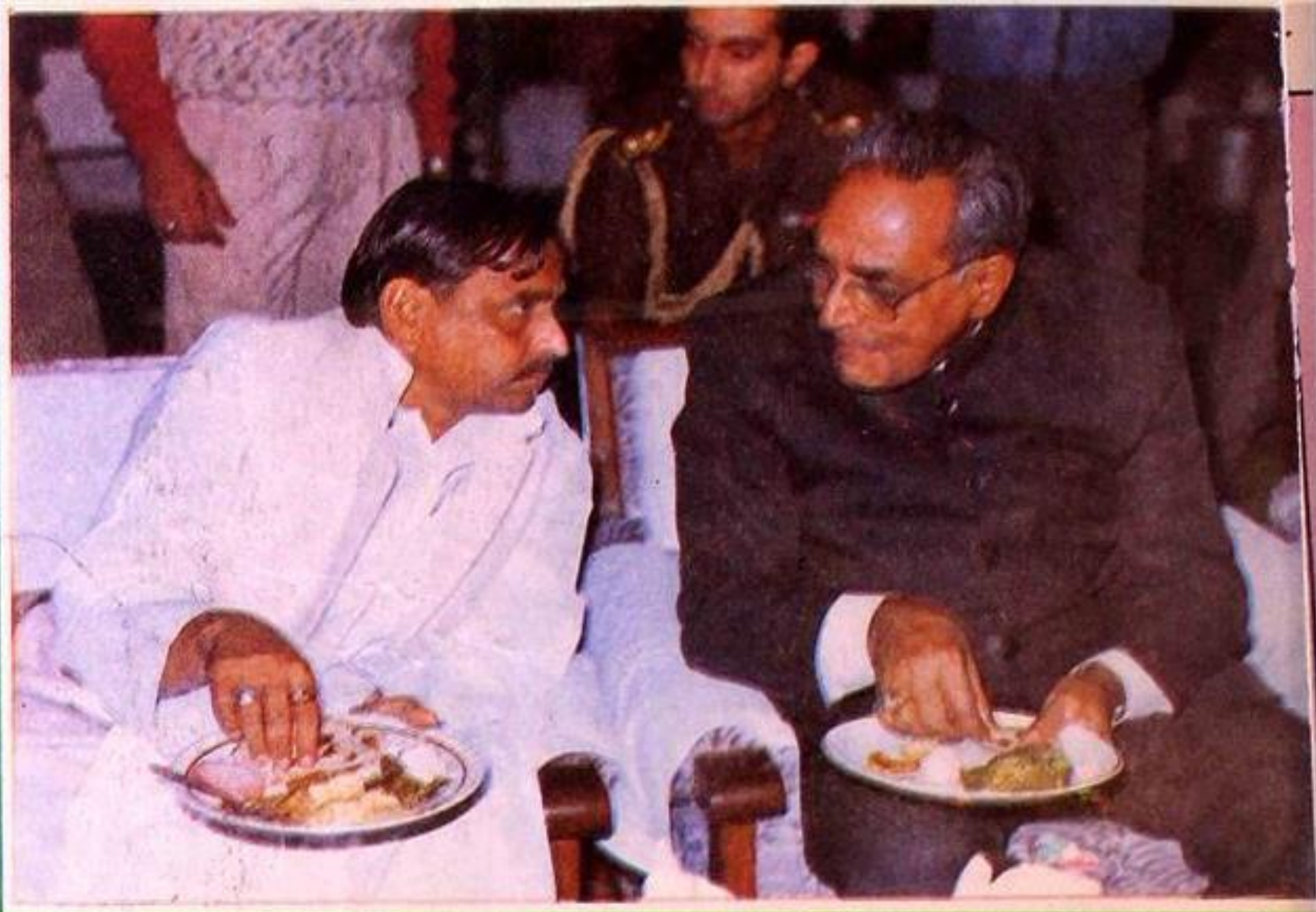
اترپردیش
کے وزیر اعلا
شری ملائم سنگھ یادو
مٹیا برج
کلکتہ میں
تاجدار اودھ
واجد علی شاہ
کے مزار پر
نذرانۂ عقیدت
پیش کرتے ہوئے

Urdu Monthly

Vol. 48 No. 11 & 12
February-March, 1994
Rs. 6.00

NAYA DAUR

R.N.I. 4552/51
Annual Subs. Rs. 30.00
LW/NP/444/94

POST BOX NO. 146, LUCKNOW-226 001